(EVENING)

شمعِ حیات

1967-69

غالب نمبر

Ghalib 1797—1869

Courtesy—Ghalib Academy

EDITORIAL BOARD 1967-69

L-R Sitting—Maroof ul Hasan Siddiqi (St. Editor) Mr. Azmatullah Khan (Staff Advisor) Dr. D. N. Kaual (Vice Principal-publisher), Mr. Mohd. Ahmed (Advisor Arabic)
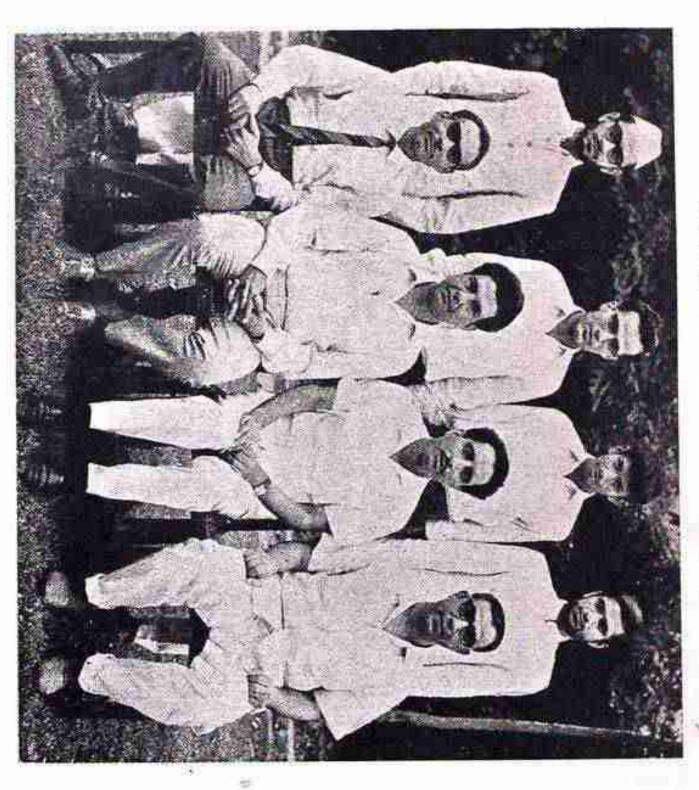
Standing—Sajid Mian, Qazi Azhar Ahmed, Mohd. Atiq Siddiq, Amiduz Zaman (Asst. St. Editor)

GHALIB PRIZE WINNERS

B.A. (Pass) Delhi University

Nazar Barni
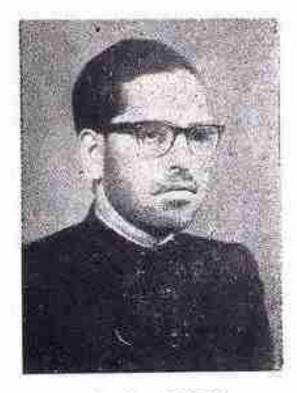
Ghulam Mehdi

ZubairRizvi

Ataullah

دِلّی کالج ——— (ایوننگ) ——— اردو میگزین

۱۹۶۷ - ۶۹

غالب نمبر

ڈاکٹر ڈی ۔ این ۔ کول (وائس پرنسپل، پبلشر) نے دہلی کالج (ایوننگ) کے لئے اعلیٰ پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کیا۔

اپنی باتیں

یہ سال اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک ناقابلِ فراموش سال ہے ۱۵۔ فروری ۱۹۶۹ء کو عظیم شاعر مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے پوری ایک صدی بیت گئی۔ اس موقعہ پر پورے ہندوستان اور بیرونی ممالک میں جس دھوم دھام سے غالبؔ کی سوویں برسی منائی گئی وہ قارئین اکرام سے پوشیدہ نہیں۔ دلی کالج غالبؔ کے دور کی مقدس یادگار ہے، خود غالبؔ کی نظروں نے اس کے در و دیوار پر ضوفشانی کی ہے۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ اُردو میگزین کو غالبؔ نمبر کی شکل میں پیش کر کے کیوں نہ اس عظیم فنکار کو اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کریں۔ لیکن اس فیصلے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ ہم نے یہ فیصلہ ایسے وقت کیا ہے جب ہر طرف غالبیات کا سیلاب آیا ہوا ہے اور سیلاب کی آغوش سے گوہرِ آبدار نکالنا یقیناً ایک مجاہدانہ کارنامہ ہے ہمیں یقین بھی نہ تھا کہ ہمارا یہ خواب شرمندہ تعبیر بھی ہو سکے گا لیکن ہمیں عظمت اللہ خاںؔ اور محمد احمد صاحب جیسے لائق اور مہربان اساتذہ کا تعاون اور رہنمائی نصیب ہوئی ان کی خود اعتمادی اور یقینِ کامل نے ہمیں جراتیں بخشیں ان کا یہ سبق دولت بیدار کی حیثیت رکھتا ہے جو زندگی میں قدم قدم پر ہماری رہنمائی کریگا۔ اب یہ میگزین آپ کے پیشِ نظر ہے جہاں تک ہو سکا ہم نے غالبؔ نمبر کو پوری طرح سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے اس نمبر میں عربی کے مضامین بھی شامل ہیں ہمیں یہ خوشی ہے کہ زیادہ تر مضامین ہمارے اساتذہ اور طلباء ہی کے ہیں جن کے تعاون کے لئے ہم شکر گذار ہیں۔ ہم ان تمام صاحب علم و فن حضرات کے تہہ دل سے ممنون ہیں جنھوں نے اپنی تصنیفات و تخلیقات ہمارے اس نمبر کے لئے دیں۔ اور اس طرح ہم اس سیلاب میں سے بھی کچھ گراں قدر اور آبدار موتی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ہم نے اپنی شامیں اس مقدس درسگاہ میں گذاری ہیں، ہر شام ہمیں غالبؔ، سر سید، حالیؔ، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی یاد دلاتی رہی ہے، ہر شام کے سناٹے میں ہمیں اُردو کی فریاد آہوں کے سُروں میں سنائی دی ہے، ہم نے ان آنسوؤں کی گرمی محسوس کی جو اپنے وطن میں غریب الوطن ہو کر بہائے جاتے ہیں، ہر لمحہ ہمیں احساس دلاتا رہا کہ اُردو زبان کا کچھ قرض ہے جو ہمیں چکانا ہے ہم میں سے کچھ ساتھیوں نے ایوننگ کے طلباء کی اور اُردو زبان کے نمائندوں کی حیثیت سے صدر جمہوریہ عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے اور وزیر تعلیم جناب ترگن سین صاحب سے ملاقاتیں کیں

۲۷۔ مارچ ۱۹۶۸ء کو تری گنا سین صاحب سے ملے تو موصوف نے فرمایا! "مجھے آپ سے ملتے ہوئے خوشی محسوس ہوئی ہے کیونکہ میں ایک بوڑھا طالب علم ہوں اور خاص طور سے اس لئے کہ آپ ہندوستان کی سب سے شیریں زبان کی نمائندگی کر رہے ہیں میں اُردو نہیں جانتا لیکن یہ زبان مجھے بہت ہے غالب اس زبان کا عظیم شاعر تھا" ہم نے اُردو کی فریاد موصوف کے سامنے پیش کی۔ اس کے بعد ۷۔ جولائی ۱۹۶۸ء کو ہم نے صدر جمہوریہ سے راشٹرپتی بھون میں ملاقات کی اور ایوننگ کے طلبار کے مسائل سامنے رکھے: "ہم سات آٹھ گھنٹے کی محنت ِ شاقہ کے باوجود داخلہ لے کر تحصیل علم کرتے ہیں یہ ہماری علم دوستی اور تعمیری ذہن کا واضح ثبوت ہے۔ دلی یونیورسٹی میں شام کو آنرز، سائنس۔ بی ایڈ اور اس قسم کے کورسوں کا انتظام نہیں ہے اس لئے باوجود صلاحیتوں کے اس طبقہ کی ترقی کی راہیں مسدود اور محدود نظر آتی ہیں یونی ورسٹی کے نتائج اس بات کے شاہد ہیں کہ دن کے مقابلہ میں ایوننگ کلاسز کے طلبا کے نتائج زیادہ امید افزا ہوتے ہیں اگر ان کے لئے یہ سہولتیں مہیا کر دی جائیں تو ہندوستان میں جفاکش اور لائق لوگوں کا روز بروز اضافہ ہوگا جو کسی بھی ملک کا بہترین سرمایہ ہو سکتا ہے" موصوف نے انتہائی شفقت اور توجہ سے ہماری درخواست سنی۔

ہم سے جس حد تک ممکن ہو سکا ہے اپنا فرض ادا کر چکے اب اپنے آئندہ آنے والے ساتھیوں سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں کہ وہ اپنی قیمت کا پورا پورا احساس کریں اور "ستارے جس کی گرد راہ ہیں وہ کارواں تم ہو" پر یقین رکھتے ہوئے میدان عمل آئیں اس سال ہم نے ایک کامیاب مشاعرہ کیا اس کے علاوہ بزم ادب، فارسی اور عربی سوسائٹی کی طرف سے روزہ کشائی کی ایک نئی روایت قائم کی۔ ہم جناب بیگ صاحب اور جناب موسی صاحب کے خاص طور پر شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہر موقعہ پر اپنا قیمتی وقت دیکر ہماری پُر خلوص حوصلہ افزائی کی۔ ہم نے ان کی پیشانی پر وہ چمک دیکھی جو اپنی امیدیں بارآور ہونے کے بعد ہوتی ہے۔ ہمیں اپنے مشفق ڈاکٹر ظہیر صاحب کی بے انتہا کمی محسوس ہو رہی ہے جو آج کل ہندوستانی تعلیمات کا شعبہ قائم کرنے کے سلسلے میں امریکہ گئے ہوئے ہیں خدا کرے وہ اپنے مقصد میں کامیاب اور کامران بخیریت واپس آئیں۔ ہم جناب ڈاکٹر ڈی۔ این۔ کول صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں جو انگلستان سے پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے واپس تشریف لے آئے ہیں آج کل وہ کالج کے کارواں کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ ہم موصوف کے تعاون کے لئے احسان مند ہیں۔

غالب صدی کی اس ہماہمی میں ایک سوال ذہن کو جھنجھوڑ رہا ہے کہ غالب کے پجاریوں کو یہ احساس نہیں کہ اردو کے بغیر غالب ایک جسد بے روح ہے جس کی کوئی قیمت نہیں اُردو کو مٹا کر غالب ہرگز جاوید نہیں ہو سکتا۔

ایڈیٹر

ڈاکٹر عبدالقادر سروری
کشمیر یونیورسٹی

غالبؔ کی زبان اور اسلوب

غالبؔ کی شاعری کی مقبولیت میں ان کے زبان کے استعمال کے مخصوص انداز اور ان کے اسلوب بیان کا کتنا حصہ ہے، اس کے تفصیلی مطالعے اور تجزیے کی علمی کوشش ابھی تک نہیں کی گئی۔ غالبؔ نے جہاں اُردو شاعری کے اگلے دور کے روایتی مضامین تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا، اور معنی آفرینی کے انداز کو اختیار کیا زبان میں بھی محاورہ بندی اور رعایت لفظی سے اجتناب کیا اور ایک نئے اسلوب کو اپنی شاعری میں نشوونما دیا نثر نگاری یعنی خطوط نویسی کا بھی انھوں نے ایک نیا ہنج پیدا کیا تھا۔ زبان اور اسلوب کا یہ نیا راستہ جو انھوں نے اختیار کیا تھا وہ آئندہ شاعری اور خطوط نویسی کے اسلوب میں بڑے انقلاب کا باعث ثابت ہوا۔ محاورہ بندی، رعایت لفظی اور ضلع جگت سے غالبؔ کی نفرت مشہور ہے۔ انکے سوانح نگاروں نے یہ واقعہ اس سلسلے میں خاص طور پر بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ کسی عام پسند مذاق کے دلدادہ نے اس شعر کو غالبؔ کا تصور کرکے ان کی تعریف کی تھی۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

اسد کی رعایت سے دوسرے مصرعے میں "مرے شیر" کے محاورہ کو کھپانے کی کوشش بڑی بدذوقی تھی اور غالبؔ نے صاف کہا تھا کہ اگر یہ شعر مجھ اسد کا ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی اور اگر کسی اور اسد کا ہے تو اس پر رحمت خدا کی۔
اس شعر کو اپنے نام منسوب کرنے کے خلاف غالبؔ کا یہ شدید ردعمل، قدیم دور کی محاورہ کی خاطر شعر گوئی سے غالبؔ کی نفرت کا آئینہ دار ہے اور ان کی مخصوص طبیعت اور یگانہ انداز فکر کو جانتے ہوئے اس میں کوئی مبالغہ نہیں دکھائی دیتا۔ غالب سے عین پہلے کے شعرا کے ہاتھوں اُردو شاعری بے مزہ محاورہ بندی اور زبان کے کس بل دکھانے کی شاعری بن کر رہ گئی تھی۔ یہ خصوصیت خود ان کے معاصرین، مومنؔ اور ذوقؔ تک کے یہاں ملتی ہے۔ غالبؔ کا مذاق مختلف تھا۔ ان کے ذوق صحیح نے انھیں سمجھایا تھا کہ شاعری تک بندی نہیں، بلکہ معنی آفرینی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے ذوق کی رہنمائی فارسی کے سربرآوردہ شعرا، جیسے حافظؔ، ظہوریؔ، عرفیؔ، صائبؔ اور بیدلؔ سے ہوئی تھی، اور دوسرے اُردو شعرا کے مقابلے میں غالبؔ کا مخصوص انداز ان اساتذہ کے گہرے مطالعے کا نتیجہ تھا۔ بیدلؔ کی معنی آفرینی اور ان کا اسلوب غالبؔ کو بہت پسند تھا،

چنانچہ ابتدائی دور میں، جب ان کی مشق ابھی پختہ نہیں ہوئی تھی، بیدل کے انداز پر لکھنے کی کوشش میں، ان کے پیچیدہ خیالات کا ساتھ، زبان نہیں دے سکتی تھی، تو انھیں اردو میں فارسی کی ترکیبیں کثرت سے استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی تھی جس کی وجہ سے ان کی زبان ادق اور اسلوب نامانوس ہو جاتا تھا اور شعر سے ابلاغ کا مصرف بعض وقت پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ غالب کو بھی اس کا شعور تھا چنانچہ ان کے شعر:-

طرز بیدل میں ریختہ کہنا　　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ بیدل کے انداز پر اردو میں شعر کہنا، آسان نہیں، اسے اردو کی بد قسمتی کہنا چاہیئے کہ عموماً ہم پیشہ ایکدوسرے کے مخالف رہے۔ اس پر طرہ غالب کا نامانوس انداز شاعری بھی تھا، معاصر اساتذہ ان پر طرح طرح سے ایراد کرتے تھے۔ محاورہ بندی اور لفظی رعایت جو ان کے لئے شاعری کا بڑا کمال تھا، اس کے زعم میں، وہ غالب کے نامانوس انداز کو شعری روایت سے بغاوت اور گمراہی سمجھتے تھے۔ غالب کے اس اعتراف کے باوجود کہ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ان پر اس طرح کے حملے کئے جاتے تھے۔

زباں میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے　　　مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں اور خدا سمجھے

لیکن غالب کا میر سے یہ اعتقاد اور ان کی استادی کا اعتراف، ان کی عظمت شاعرانہ کے بارے میں تھا، میر کی کورانہ تقلید سے نہیں میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف اور بات ہے اور ان کے انداز فکر میں اپنے آپ کو اور اپج کو گم کر دینا اور بات۔ جس سخن سنج کو اپنی فکر پر اعتماد ہو، وہ اس طرح کے انجذاب گدایانہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ہو بھی نہیں سکتا، کیوں کہ میر اور غالب کے عہد میں جو تفاوت تھا، اور اس دوران فکر اور اسلوب شعر میں جو تفاعل میں آچکا تھا، اس کے علاوہ نئے عہد کے تقاضوں نے جس نئے ذہن کی تعمیر شروع کی تھی اس کے مدنظر، غالب یا کسی اور شاعر کے لئے میر کا ماحول، اور ان کا ذہن پیدا کرنا ممکن نہیں تھا ہم سے قریب تر زمانے میں بعض سخنوروں اور خاص طور پر نواب جعفر علی خاں اثر نے میر کے انداز کا اتباع کرنے کی کوشش کی اور اس پر انھیں فخر بھی تھا، لیکن ان سے زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکا کہ میر کی سلاست اور سادگی کو تو وہ اپنا مطمح نظر بنا سکے، لیکن میر کا مخصوص اسلوب اور خاص طور پر میر کا ذہن وہ پیدا کر سکے اور نہ میر کا سا سوز و گداز ان کی شاعری میں آسکا۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنے اور ظہوری یا عرفی کے انداز میں فکر شعر کرنے کی دقتوں کے احساس نے، اور کسی حد تک احباب کے سمجھانے بجھانے سے غالب، ان کے "آساں کہنے کی فرمائش" پر عمل کرنے لگے تھے، تب بھی وہ اپنے عہد کے اساتذہ کی محاورہ بندی اور لفظی رعایت تک نہ اتر سکے۔ بلکہ ان کی شاعری میں ایک نیا انداز اور اسلوب بن ایک

تازہ پرکاری نکھرنے لگی۔ یہ نیا انداز، غالب کا اپنا انداز تھا اور یہ ان کے پسندیدہ شعرا کے انداز سے اور بھی نیا انداز غالب کی عظمت کی بنیاد بن گیا۔ اس نئے رنگ میں ان کی اپنی مخصوص فکر اور فارسی کے اساتذہ کے اثر کے تحت نشوونما پائے ہوئے اسلوب کی بڑی حسین آمیزش ہے۔ غالب کی فکر کا نیا انداز اور ان کا نیا اسلوب، دونوں ہی اُردو شاعری کے لیے انوکھی چیز تھی۔

بعض وقت اس بات پر بھی سنجیدگی سے سوچنے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب کی فکر جن کی فارسی اور انشا پردازی کبھی کبھی فارسی کے کلاسکی شعرا اور انشا پردازوں پر بھی چشمک زنی کرتی ہے۔ اُردو کی طرح فارسی میں بھی ایک چونکا دینے والے مرتبہ تک کیوں بلند ہو سکے؟ اس کے کئی سبب تھے۔ ایک تو یہ کہ غالب کی اُردو شاعری کی طرح فارسی شاعری کا مطالعہ ابھی تک گہری نظر سے نہیں کیا جا سکا۔ دوسری بات یہ ہے کہ غالب کی فارسی شاعری کے منظرِ عام پر آتے آتے ہندوستان میں فارسی شاعری کا ذوق ماند پڑ گیا تھا پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی ضروری ہے کہ فارسی میں غالب کے مرتبہ کے شعرا کئی گذر چکے تھے، اس لئے بھی ان کی فارسی شاعری کے بالاستیعاب مطالعہ کی کوشش نہیں کی گئی، حالانکہ غالب کی شاعرانہ عظمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے، ان کی فارسی شاعری کا مطالعہ بھی بہت مفید ہوتا۔ جدید دور میں، فارسی زبان اور اسالیب شعر میں تبدیلی آگئی ہے اس کے سبب سے، اکثر کلاسیکی شاعر اور انشا پرداز بھی اب محض تاریخ ادب کا باب بن کر رہ گئے ہیں نئی ایرانی شاعری میں زبان کے ساتھ ساتھ فکر کے سانچے بھی بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ جب خود ایران میں اساتذہ پیشین کا یہ حال ہو، تو اس ہندوستانی شاعر کا اہل ایران کی نظر میں کیا مقام ہو سکتا ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ فارسی سے غالب کے گہرے لگاؤ اور ان کے مطالعے کی وسعت کے باوجود اہلِ زبان سے انکا تعلق محض علمی اور ادبی تھا۔ اس میں اپنی زبان میں فکر کی آمد ممکن نہیں تھی۔ اردو کو غالب نے استادانہ قدرت کے ساتھ استعمال کیا ہے، اور فارسی میں انھیں اساتذہ کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا پڑا ہے۔

غالبؔ کے بعض شارحین اور خاص طور پر نظم طباطبائی نے، زبان اور محاورے میں ان کے بعض تجاوزات کو ان کی ناواقفیت اور کوتاہی سے تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر، مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر انھوں نے جو سہرا لکھا تھا، اس کے شعر:

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا   باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

کے بارے میں طباطبائیؔ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ "ترے سر سہرا" کہنے سے محاورہ پورا نہیں ہوتا۔ محاورہ ہے "تیرے سر سعادت کا سہرا" یا "کامیابی کا سہرا" وغیرہ۔ غالب کے کئی پرستاروں کو یہ اعتراض اور اسی طرح کے دوسرے اعتراض جو زبان اور محاورے سے متعلق ہیں، گراں گذرے۔ بعد کے شرح نگاروں نے، طباطبائیؔ کا جواب دینے کی خاطر اپنی شرحیں لکھیں، لیکن جہاں تک مجھے علم ہے، محاورے کے غالب

کے اس تجاوز کے بارے میں کوئی جواب شافی نہ دے سکا۔ اس کی کسی قدر تفصیلی بحث میں نے اپنے مقالے "غالب کے اُردو کلام کی شرحیں" میں کی ہے۔ حسرت موہانی اور ایک دو اور شارحین نے بھی اسی طرح کچھ اعتراضات کئے ہیں۔

اصل میں غالب کے ایسے تجاوزات کی توجیہ محاورے اور قواعد یا بلاغت کی رو سے کرنے کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ غالب کے خیالات کی ندرت، اور زبان میں ان کے اظہار کی دقتوں نے انھیں کبھی کبھی ایسے تجاوزات پر مائل کیا۔ اب اس عظیم شاعر کے یہاں ان کے استعمال ہونے سے، ان کی ایک تاریخی اہمیت ہو گئی ہے۔ ہر بڑا ادیب اور شاعر اپنی زبان اور اپنے اسالیب آپ پیدا کرتا ہے۔ ماہرین علم زبان کی رو سے، ہر شاعر اور ادیب زبان کو اپنے انداز سے استعمال کرتا ہے یہی نہیں بلکہ ہر بڑا ادیب اور شاعر اپنی زبان آپ بناتا اور اسلوب کو نشوونما دیتا ہے۔ سر سید احمد خاں صاحب اور آتش پر بھی ایسے اعتراضات وارد ہوتے ہیں، لیکن ان سے، ان کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔

غالب کی اُردو شاعری کی زبان میں فارسی کی آمیزش زیادہ ہے، اور اس کو بھی غالب کے معاصرین، کچھ شارحین اور نقاد، غالب کی کمزوری سمجھتے ہیں۔ یہ دراصل غالب کے نئے تصورات کے لئے نئے نئے سانچوں کی تلاش کا نتیجہ ہے۔ اُردو زبان کو ولی اور ان کے بعد سراج نے عاشقانہ شاعری کے موجودہ سانچوں میں ڈھالا، اس کے بعد میر اور سودا نے ان میں وسعت پیدا کی اور انھیں ترقی دی۔ ناسخ اور ان کے متبعین نے ان میں اصلاح کی اور استعمال کے معیار بھی متعین کرنے کی کوشش کی لیکن ایک نمو پذیر زبان کے لئے کوئی معیار ابدی نہیں ہو سکتے۔ مومن کی خیال بندی اور معنی آفرینی نے ان سانچوں میں مزید وسعت پیدا کی۔ یہ غالب کی فکر اور اس کے گوناگوں ذہنوں کا نتیجہ ہے کہ اُردو زبان میں، نئے نئے خیالات کے اظہار کے نئے انداز کے مرکبات وضع کرنے اور نئے اسالیب کی سمتیں پیدا ہوئیں غالب کا نشوونما دیا ہوا اسلوب اور ان کی وضع کی ہوئی ترکیبیں اب اُردو ادب کا بیش بہا سرمایہ بن گئی ہیں۔ ان کی بدولت اظہار کے نئے اور ترقی پذیر سانچے مہیا ہو گئے ہیں اور ان سے بہت سے پیچیدہ تصورات کے اظہار کے لئے روپ فراہم ہو گئے ہیں۔

ترکیبیں جیسی سادہ پرکار، مفت نظر، اعجاز ہوا صیقل، خوننابہ مشرب، نیرنگ یک بت خانہ، ستم ظریف، جلوہ تماشا، فنا تعلیم، طومار ناز، گنجفہ باز خیال، ودیعت خانہ، زندانی تاثر الفت، دامان باغبان کلفروش اور اسطرح کی بیسیوں ترکیبوں سے نہ صرف اردو ادب کو مالا مال ہو گیا ہے، بلکہ پیچیدہ تصورات کے لئے مرکبات وضع کرنے کی راہیں ان سے کھل گئی ہیں۔ ان ترکیبوں میں جو بلاغت اور معنویت ہے، تشریح اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اصغر گونڈوی اور خاص طور پر اقبال اور خود ہمارے عہد کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے پیچیدہ تصورات کے اظہار کے لئے ترکیبیں وضع کرنے میں ان کو نمونہ بنایا ہے۔ اس اعتبار سے غالب اور شاعری میں نہ صرف ایک نئے انداز فکر بلکہ نئے اسلوب کے بھی امام بن گئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن

رو میں ہے رخشِ عمر

مرزا :۔ سنا تم نے لوگ برسی منا رہے ہیں۔

غالب :۔ خواب کی باتیں ہیں۔

مرزا :۔ نہیں سچ۔

غالب :۔ کس کی برسی مرزا نوشہ تمہاری یا میری۔

مرزا :۔ ذکر تو ہم دونوں ہی کا ہے غالب۔ تمہارا کلام گنگنایا جائے گا۔ اور میری جائے پیدائش بلیماران میں میرے رہنے کا مکان، پنشن کا مقدمہ میرے دوستوں دشمنوں سبھی کا چرچا ہے۔

غالب :۔ مگر مرزا نوشہ تم مرے کب تھے زندگی بھر مرے جیتے رہے کبھی کسی کو مار کھا کبھی خود مرے۔

مرزا :۔ اور آپ؟

غالب :۔ میں بچارا محض تماشائی اپنا آپ تماشائی لے دے کے زندگی میں کوئی آرزو کی بھی تو صرف اتنی

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مرزا :۔ تو گویا میرے بغیر آپ کا وجود آپکے اشعار آپ کی حسرتیں اور تمنائیں باقی رہیں۔

غالب :۔ نہیں۔ مگر تمہارے گناہ میرے نام کیوں لکھے جائیں۔

مرزا :۔ ٹھیک کہتے ہو لوگ آج کل میرے پیچھے پڑے ہیں غالب مرزا نوشہ کہاں پیدا ہوا اس نے اپنے سالے کی موت پر خوشی کا اظہار کیا اس نے مغل بادشاہ کا قصیدہ لکھا پھر انگریزوں کی بھی مدح سرائی کی اس نے اپنے دوست صدرالدین آزردہ کی بیوہ کی پنشن رکھوا کر نواب رام پور سے اپنے لئے پنشن حاصل کرنے کی کوشش کی لوگ کہتے ہیں مرزا نوشہ خود غرض آدمی تھا۔

غالب :۔ کیا غلط کہتے ہیں!

مرزا :۔ لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے　　　یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

غالب :۔ گھر! میرا کوئی گھر نہیں ۔

مرزا :۔ نہیں غالب بھولتے ہو۔ غالب کے نام سے جانے پہچانے جانے سے پہلے صرف میں تھا مرزا اسد اللہ بیگ اور میں نے آگرہ میں آنکھیں کھولی تھیں ۹۸، ۱۷۹۷ کا آگرہ ۔ وہ ڈیوڑھی مجھے ابھی تک یاد ہے جہاں سے فقیر نظیر اکبرآبادی کا شہر آشوب پڑھتے گذرتے تھے ۔

(فقیروں کی آواز ابھرتی ہے)

جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند

بے وارثی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ

ٹوٹی حویلیاں ہیں تو پھوٹی شہر پناہ

ہوتا ہے باغباں سے ہر ایک باغ کا نباہ

وہ باغ کس طرح نہ لٹے اور نہ اجڑے آہ

جس کا نہ باغباں ہو نہ مالی نہ خاربند

جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند

بنسی :۔ چال چلو مرزا

مرزا :۔ چلتا ہوں بنسی دھر

بنسی :۔ جی ہاں۔ شطرنج ہے۔ بچوں کا کھیل نہیں ہے ۔

مرزا :۔ ہمارے لئے تو بچوں کا کھیل ہے ہی ہے اک ذرا دھیان ان فقیروں کی صداؤں کی طرف سے بھٹک گیا۔ لیجئے فرضی تو گیا۔

بنسی :۔ میاں صاحبزادے ہوا بھی۔ کچھ خاندان کی پرانی رسم و راہ کا پاس کرتا ہوں۔ ورنہ مات پلا پلا کر نوشیرواں بنا دیتا۔ سوچتا ہوں ۔ ہمارے تمہارے نانا ایک ساتھ فوج میں نوکر ہوئے۔ ایک ساتھ نوکری چھوڑی۔ ایک ساتھ زندگی گزاری۔ اگر دو چار مات پلا دیئے تو کہو گے پشتوں پرانی دوستی کا پاس نہ کیا۔

مرزا :۔ واہ۔ واہ۔ میاں بنسی دھر کیا کہنے ہیں عمر میں مجھ سے دو ایک برس ہی بڑے چھوٹے ہو گے باتیں کرتے ہو۔ تو نانا دادا سے کم نوالہ نہیں توڑتے ۔

بنسی :۔ خیر جی مرزا۔ یہ بازی تمہیں اٹھالو۔ مات ہم ہی مانے لیتے ہیں۔ اچھا چلو دوسرے بازی لگاتے ہیں۔

مرزا :۔ بس جناب۔ دوسری بازی نہیں۔ آج بلوان سنگھ سے پتنگ کے پیچ لڑانا ہے ۔

بنسی :۔ کون؟ راجہ بلوان سنگھ وہی گدڑیوں کے کٹرے والا وہ بھی عمر بھر بچہ رہے گا اور تمہارا بھی یہی حال ہے ۔

مرزا :- جی بس شطرنج کے سوا تو سارے کھیل گویا لڑکپن ٹھہرے تم بھی ذرا پیچ لڑاؤ تو جانیں چلو چلتے ہو۔

بنسی :- اماں توبہ کرو۔ میری سنو تو لعنت بھیجو پتنگ بازی پر۔ راجہ بلاس رائے کی حویلی میں مشاعرہ ہے۔ چلے چلتے ہیں۔ بھئی میری تو جان جاتی ہے ان مشاعروں پر۔ اکبر آباد کے شاعر ایران کے شاعروں کو شرماتے ہیں۔ اور اپنے میاں نظیر کا کلام بچے بچے کی زبان پر ہے۔

مرزا :- کہو گے خود ستائی کر رہا ہے۔ بخدا دو چار شعر تو ریختے میں ہم نے بھی کہنے شروع کر دیئے ہیں۔

بنسی :- سچ۔

مرزا :- پتنگ پر ایک قطعہ لکھا ہے بخدا داد دینے میں کنجوسی نہ کرنا عرض کیا ہے۔

ایک دن مثل پتنگ کاغذی　　لے کے دل سر رشتۂ آزادگی

خود بخود کچھ ہم سے کنیا نے لگا　　اس قدر بگڑا کہ سر ہانے لگا

میں کہا اے دل ہوائے دل بران　　بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زباں

دل نے سن کر کاٹ کر کھا پیچ و تاب　　غوطے میں جا کر دیا کٹ کر جواب

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ دوست

غالب - یہی لمحہ میری پیدائش کا تھا مرزا نوشہ سے غالبؔ بننے کا لمحہ جب پہلی بار شاعر بیدار ہوا تھا۔

مرزا :- مگر اس لمحے کی سالگرہ کوئی نہیں مناتا میری برسی سب مناتے ہیں۔

غالب :- شاید اس کی ضرورت بھی نہیں ہوتی شمع روشنی دیتی ہے۔ اور جل بجھتی ہے اس کی سالگرہ کون مناتا ہے۔

مرزا :- احسان فراموش ہو۔

غالب :- میں!

مرزا :- ہاں تم میرا احسان نہیں مانتے کہ غالب کیلئے مرزا نوشہ نے کیا کیا نہیں کیا تو لیتیں سہیں ہر کس و ناکس کے آگے دامن پسارا حوشامدیں کیں دست طلب دراز کیا اپنوں کو اپنا نہیں سمجھا کہ تمہیں فرصت کا یہ نفس بقائے تم فکر سخن کے لئے ذرا سی آسودگی پا سکو۔

(پس منظر میں کوئی عورت غزل گا رہی ہے)

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو　　ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے　　کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار　　اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

غالب :۔ سنتے ہو۔ یہ کس کی آواز ہے۔

مرزا :۔ تم ہی نے تو کہا تھا۔ مرے دریائے بے تابی میں ہے اک جوئے خوں وہ بھی۔

غالب۔ تم امیرزادے تھے۔ عورت کی محبت کو بھی کھیل جانتے تھے۔

مرزا :۔ نہیں تم محض شاعر تھے اور شعر میں گرمی اور سوز پیدا کرنے کے لئے تم نے ایک عورت کی جان لے لی۔

غالب :۔ یہ غلط ہے۔

مرزا :۔ یہ بالکل صحیح ہے۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

غالب :۔ چلو اس بہلنے تمہیں شعر تو یاد آنے لگے۔

مرزا :۔ تمہارے شعروں میں ہے کیا ؟ میری زندگی ہی تو ہے۔ مجھے یاد نہ ہوں گے تو کسے یاد ہوں گے۔

غالب :۔ تو سنو تم نے اس عورت کو چاہا امیرزادے کے دل سے اور تم نے اسے داشتہ کی نظر سے دیکھا یا نہیں یعنی میں نہیں جانتا مگر تم جیسے امیرزادے فقط زمانہ حال کے امروز میں زندہ رہتے ہیں زخم نہیں کھاتے وہ فقط پھول چنتے ہیں۔

مرزا :۔ اور آپ :

غالب :۔ شاعر کے دل نے اس سے درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا۔ میں نے اسے چاہا اور اس میں زندگی کا ایک نیا روپ دیکھا۔ میں نے اسے نہ چاہا ہوتا اس کا سہارا نہ ڈھونڈا ہوتا تو میں پاگل ہو جاتا۔

مرزا :۔ معلوم ہے ان دنوں سخت پریشانی تھی۔ پنشن تھوڑی رہ گئی تھی ایک دو نہیں سات بچے پے در پے مر چکے تھے۔ چھوٹے بھائی یوسف پاگل ہو چکے تھے اور ان کے گھر بار کا بوجھ بھی تھا شاعر کو کامیابی ابھی نہیں ملی تھی۔

غالب :۔ اس وقت اس لڑکی نے مجھے سہارا دیا میری غزلوں کو گنگنایا اور میرے شاعرانہ وجود کو ہلا ڈالا۔

مرزا :۔ اسی زمانے سے شراب منہ کو لگی اور انہی دنوں جوئے کی عادت ہوئی۔

غالب :۔ وہ دن بھی عجیب تھے۔

مرزا :۔ لو وہ لڑکی بالکل قریب آ گئی۔

غالب :۔ بی بی، تمہیں کس کی تلاش ہے۔

لڑکی :۔ تم دونوں میں سے مرزا نوشہ کون ہے۔ اور

غالب :۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

لڑکی :۔ وہی آواز :۔ پھر اسی بے وفا پر مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

مرزا :۔ اچھا ہوا تم خود آگئیں ہم خود تمہارے پاس آتے۔

لڑکی کیوں ؟

مرزا :۔ کچھ پوچھنا تھا۔

لڑکی :۔ جی ہاں۔ آپ دونوں میں سے مرزا نوشہ کون ہیں۔

مرزا :۔ جی فرمایئے۔ مجھے مرزا نوشہ کہتے ہیں۔

غالب :۔ تم غلط آدمی کو پوچھ رہی ہو شاید تم غالب سے ملنا چاہتی ہو۔ شاعر غالب جس کی غزلیں تم نے گنگنائیں جس کی زندگی میں تم نے تھوڑی دیر کے لئے سکون کی چاندنی فراہم کردی۔

مرزا :۔ تم دونوں مجھے الزام دو۔ سب مجھے الزام دیتے ہیں۔ تم میں سے کوئی مجھے نہیں جانتا۔ دس بارہ سال کی عمر میں ایک امیر زادہ دلی آیا اور اس کے اوپر آسمان ٹوٹ پڑا۔ ایک دم پورے خاندان کا بوجھ سر پر پھر ایک نہیں دو نہیں سات بچوں کا انتقال۔ چھوٹے بھائی پر ان حالات نے وہ ستم توڑا کہ پاگل ہوگیا۔ میں بھی جوان اور خوبصورت آدمی تھا۔ اگر شاعری عشق و قمار بازی میں پناہ ڈھونڈھ لی تو کیا گناہ ہوا اسی بے قراری میں تمہارا دامن پکڑا۔ اور نتیجہ رسوائی۔ بے عزتی اور بے اندازہ غم۔

لڑکی :۔ میں جانتی تھی۔

غالب :۔ تم شرم رسوائی سے خاک میں جا چھپیں جس کا آسرا میں نے ڈھونڈا وہ موت کے پردے میں چھپ گیا۔ تم نے موت کی پناہ ڈھونڈلی۔ مجھے یہ پناہ بھی نہ ملی۔ تم میری شاعری میں درد بنکر زندہ رہیں۔ اور اس درد کو مجھ سے کوئی نہ چھین سکا۔

لڑکی :۔ میں نے بھی کبھی کبھی یہی سوچا ہے کہ میں شاعر کا ایک تصور تھی محض ایک تصور جس سے تم نے پیار کیا وہ تمہارا تصور۔ تمہارا تخیل۔ تمہاری اپنی تصویر تھی۔ اسی لئے تم نے اسے کوئی نام نہیں دیا۔ اور وہ درد شاعری بنکر بکھر گیا۔ دلی کے مشاعروں میں درد کا یہ دریا اسی طرح بہتا رہا۔

*

چوبدار :۔ صاحبو، اب شمع محفل مرزا اسد اللہ خاں غالب کے سامنے ہے۔

غالب :۔ (تحت اللفظ میں)

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

(اس شعر کے بعد کے اشعار ترنم کے ساتھ پس منظر میں نسوانی آواز گاتی ہے)

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست. جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیئے ہائے ہائے کیوں

(کچھ لوگ واہ واہ کرتے ہیں)

ایک اور غزل۔

حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے

مرزا:۔ (طنزیہ قہقہہ) حضور شاہ میں سخن کی آزمائش ہے
— تمہیں وہ دن یاد ہے۔

غالب:۔ اچھی طرح

(دروازے پر دستک)

بوڑھی آواز:۔ کون ہے۔

غالب:۔ مرزا نوشہ

بوڑھی آواز:۔ دروازہ نہیں کھلے گا۔

غالب:۔ مجھے چودھویں سے ملنا ہے۔

بوڑھی آواز:۔ سنا نہیں۔ دروازہ نہیں کھلے گا۔ سن لیا مرزا جی۔

غالب:۔ (متواتر دستک) دروازہ کھولو

بوڑھی آواز:۔ مرزا صاحب۔ مجھ بوڑھی پر رحم کھائیے۔ میری دکھیاری کی ایک ہی بیٹی ہے۔ اسے دیوانہ بنانے سے

آپ کو کیا ملے گا۔ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔ آپ کا کچھ نہیں۔ بگڑے گا۔ وہ جی جان سے جاتی رہے گی۔ آپ گھر بار والے مفلس امیر زادے سینے میں دل ہے گرہ بدام نہیں۔ ان داموں کسی کے جی جان کا سودا نہ کیجئے۔ چلے جایئے مرزا صاحب۔ خدا کے لئے چلے جایئے۔

(رونے کی سسکیوں کی آواز)

(واپسی کے قدموں کی آواز۔ بگھی کے پہیوں کے چلنے کی آواز۔ ان کا رکنا)

یوسف مرزا:۔ (پاگل ہیں) تو آ گئے آپ کب؟

غالب :۔ یوسف مرزا میرے بھائی۔

یوسف مرزا:۔ میں کب سے انتظار کر رہا تھا۔

غالب :۔ میرا انتظار؟

یوسف مرزا۔ جی ہاں۔ آسمان پر شفق دیکھتے ہیں۔ انتظار کرتے کرتے مرجھائی جا رہی ہے۔ زمین بوڑھی ہوگئی۔ وقت انتظار میں پارے کے ٹکڑے کی طرح بکھر رہا ہے۔ اور میں یہاں کھلے آنگن میں کھڑا چاند کی کھڑکی سے دیکھ رہا ہوں کہ میرا بھائی کب آتا ہے۔

غالب۔ یوسف مرزا اندر آؤ سردی سخت ہے۔

یوسف:۔ میرے نصیب کی چھتیں کبھی کی بیٹھ چکیں بابا۔ اب آسمان میں فقط دو۔ قندیلیں روشن ہیں جو راہ دکھاتی ہیں اور ان میں سے ایک کا نام ہے جانتے ہیں کیا نام ہے اس کا نام ہے غالب (ہنستے ہیں)

غالب:۔ باتیں مت کرو یوسف۔ چلو اندر چلیں۔

یوسف:۔ آپ نے سنا بابا جان! بلیماروں کے چوراہے پر بلیاں کیا کہہ رہی تھیں وہ کہتی تھیں اسد اللہ اداس کے بھائی کبھی امیر زادے تھے۔ اب امیر زادوں اور بادشاہوں کی تعریفیں کر کے قصیدے لکھ کر پیٹ پالتے ہیں۔ ہم نے تلوار نکالی ایک بلی کو قتل کر ڈالا۔ ہم ابن فریدوں۔ ہمارے سر پر تاج۔ ہمارے جسم پر خلعت شاہی۔ ہماری تعریف میں قصیدے لکھتے لکھتے شاعروں کے قلم گھس گئے۔ ہمارا سر اور کسی کے در پر جھکے ناممکن۔ سنا آپ نے۔ ہم نے اسے قتل کر دیا۔ اب ہماری آستین خالی ہے۔

غالب:۔ چلو یوسف۔ اندر چلو۔

(اندر آ کر)

یوسف:۔ ابا یا۔ بابا جان آ گئے۔ آؤ بھابی۔ بابا جان آ گئے۔

بیگم :۔ آج اتنی جلدی کیسے؟

غالب :۔ یوں ہی۔

بیگم :۔ جی بہت اداس ہے کیا۔

غالب :۔ اس کا کیا مذکور ہے کہو کہ گھر میں خرچ کی تکلیف ہے۔

بیگم :۔ ہاں۔

غالب :۔ کہو کہ قرض خواہوں کے تقاضوں سے تنگ آگئی ہو کہو کہ پنشن کے باسٹھ[۶۲] روپیوں میں مہینے کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔

بیگم :۔ یہ سب درست ہے۔ مگر آخر ہو کیا۔ میں بھی تو سنوں؟

یوسف مرزا :۔ (دیوانہ وار قہقہہ) جمشید کی میراث جمشید کی اولاد کو۔ آدم کی میراث کو۔ رسوائی۔ اندوہ اور مصیبت۔ اور گناہ! ۔ ہم سب کو نیلام پر چڑھاتے ہیں اور خوشۂ گندم چاہتے ہیں۔ کوئی ہے۔ جو اس خوشۂ گندم کا سودا کرے۔

غالب :۔ یوسف مرزا خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔

یوسف مرزا :۔ (بہت آہستہ سے) میں خاموش ہوں۔ لو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ اب چراغوں کا۔ خدا حافظ۔

غالب :۔ گھبراؤ نہیں بیگم۔ تنگ دستی سے بہت تنگ آگیا۔ جلد کوئی صورت نکلے گی۔ کوئی صورت نکالنی پڑے گی۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ مجھے بالکل تنہا چھوڑ دو۔

مرزا :۔ پھر وہی دستک۔

غالب :۔ کون ہے، کیا کہنا چاہتا ہے۔

مرزا :۔ انتظام الدولہ۔ یہ ایک بگڑا ہوا امیر زادہ ہے۔ جو اکھلاتا ہے۔ کئی بار آچکا ہے۔

غالب :۔ کیا چاہتا ہے۔

مرزا :۔ چاہتا ہے کہ میرے گھر جوا کھیلا جائے کوتوال شہر کی نگاہوں سے بچ کر سب امیر زادے یہاں داؤ لگائیں۔

غالب :۔ ہرگز نہیں۔

مرزا :۔ میں نے بھی اب تک یہی سوچا تھا میں نے بڑی مضبوطی سے دروازہ بند رکھا۔ مگر اب۔ آج میں اسے اندر کھولوں گا۔

غالب :۔ تم خود امیر زادے ہو مشہور شاعر ہو جانتے ہو کتنی رسوائی ہوگی۔

مرزا :۔ (طنز یہ قہقہہ) امیر زادے، اسی لئے تو چاہتا ہوں۔ میں بھی داؤ لگاؤں گا اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دوں گا پھر سے ایک بار دولت ہاتھ آجائے گی۔ یہ ٹوٹتا ہوا گھرانا پھر سے سنبھل جائے گا۔ میں ضرور داؤ لگاؤں گا۔

(دستک اور تیز ہو جاتی ہے)

غالب :- پاگل نہ بنو۔ لوگ کیا کہیں گے۔

مرزا :- لوگوں کو کیا خبر ہوگی کہ یہ دولت کس طرح میرے پاس آئی ہے۔ پھر میں امیروں کے قصیدے نہیں لکھوں گا۔ میرے قصیدے لکھے جائیں گے پھر میرے لئے کہیں دروازے بند نہیں ہوں گے۔

غالب :- تمہارا علم و فضل۔

مرزا :- سب جھوٹ ہے۔ جو علم و فضل دولت اور شہرت کی اونی سی نعمتیں بھی نہ دے سکے۔ جو عرفان کی ہلکی سی رمق بھی پیدا نہ کر سکے اس کے مقابلے میں کھنکھتے ہوئے سکے کہیں بہتر ہیں۔

نووارد :- مرزا صاحب قبلہ حاضر ہو سکتا ہوں۔

(دروازہ پر دستک)

غالب :- سنا تم نے میرزا۔ پھر وہی پراسرار آواز

مرزا :- ڈراتے ہو، زندگی بھر ڈرتا رہا ہوں۔ مگر جو سب کچھ داؤ پر لگاتا ہے وہ نہیں ڈرا کرتے دروازہ کھلے گا۔

(دروازہ کھول دیتا ہے) آؤ انتظام الدولہ

انتظام الدولہ :- تو آج دروازہ کھل گیا۔

مرزا :- ہاں۔

انتظام الدولہ :- آپ اطمینان رکھیں مرزا صاحب شام تک سب لوگ جمع ہو جائیں گے۔ وہ بازی جمے گی کہ وارے نیارے ہو جائیں گے۔ بخدا قسمتیں پلٹ جائیں گی۔

ایک جواری :- بخدا اپنا انتظام الدولہ بھی برق ہے برق۔

دوسرا جواری :- کیا جگہ ڈھونڈ نکالی ہے کہ کوتوال شہر کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہو سکتی۔

انتظام الدولہ :- تو مرزا صاحب آیئے پہلی بازی میں تو آپ بھی شریک ہو جایئے۔

مرزا :- اچھا بھئی یوں ہی سہی۔

انتظام الدولہ :- شہر کا ہر بڑا جواری آج آپ کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔

(دروازہ پر دستک)

اس وقت کون ہے ؟

غالب :- کون ؟

باہر سے آواز :- سواریاں آئی ہیں۔

مرزا :- کوئی بات نہیں آپ اطمینان سے دروازہ کھول دیں اور کھیل جاری رکھیں۔ (دروازہ کھلتا ہے)

کوتوال :- خبردار میں کوتوال شہر کی حیثیت سے تم سب کو قمار بازی کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔ مرزا صاحب قبلہ مجھے افسوس ہے۔ سپاہیو! سب کو حراست میں لے لو (ڈانٹتا ہے) لے چلو۔

(اس منظر کی بلند آہنگ موسیقی)

غالب :- تمہارے ہاتھوں مجھے پہلی شکست ہوئی۔ ایک امیر زادے نے شاعر کو ہرا دیا۔

مرزا :- امیر زادے ہمیشہ شاعروں کو ہراتے آئے ہیں۔

غالب :- اور آج -! جب میری صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے امیر زادہ کہاں ہے آج! نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بیگ سب مر گئے ان کی ہڈیاں گل سڑ کر خاک میں مل گئیں۔ صرف غالب زندہ ہے صرف غالب۔

مرزا :- چلو جیل خانے کا تجربہ بھی اچھا تھا۔

غالب :- ہاں تمہارے کپڑے میلے کچیلے تھے کھانے میں مٹی اور کنکر تھے مگر میرے ہونٹوں پر شعر تھے میری روح نچی تھی اور میرے لبوں پر تبسم تھا۔

مرزا :- اور وہاں سے واپس پر تم نے مجھ سے انتقام لے لیا۔

غالب :- یعنی آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ نے مجھے اپنا استاد مقرر کر کے تمہیں زک دے دی۔

مرزا :- یوں پوچھتے ہو جیسے تمہیں اس کی خبر ہی نہیں؟

غالب :- مجھے تجربہ ہے میں نے ہی تو کہا تھا۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں۔

مرزا :- تنی ہوئی مونچھیں ہوئے شہنشاہ کے استاد (طنزیہ ہنسی)

غالب :- امیر زادہ ہار گیا شاعر جیت گیا۔

مرزا :- میرے اوپر طنز کرتے ہو۔

غالب :- لوگوں کو زمین کے کونے کھنڈروں میں خزانے ملتے ہیں۔ مجھے یہ خزانہ قید خانے کے ایک گوشے میں ملا۔

مرزا :- خزانہ

غالب :- ہاں خزانہ یہ تمہاری سرشاری اور سرنوشی وہ ہے جو دکھ درد سے ڈر کر نہیں اس کے باوجود حاصل ہوا انسان

وہ ہے جو غم کی ساری تلخی اور ترشی کو زندگی کا حصّہ سمجھ کر اسے نشاط و کیف کا جزو بنالے ہیں نے اپنا ساغر سرشار صبحِ محشر کی ہل چل اور اضطراب سے ڈھال لیا۔ میری نارسائی زندگی کی رنگینی اور کیف سامانی کا انکار نہ کرسکی اور میں نے اپنی محرومیوں پر ہنسنے کا حوصلہ پالیا۔ اس کے بعد سب کچھ ہیچ تھا۔

مرزا :۔ پھر یہ قصیدہ نگاری ؟

غالب :۔ یہ بھی ہیچ تھی قصیدہ بھی اک طرح کا جوا تھا محض کاسۂ گدائی۔

مرزا :۔ اسی لئے ایک کا نام کاٹ کر دوسرے ممدوح کا نام لکھتے رہے۔

غالب :۔ (طنزیہ ہنسی) ٹھیک ہوئی دلی کے ایک مفلس شاعر کو اتنی آزادی بھی نہ دو گے میں نے اسی خزانے کے پالینے کے بعد ہنسنا سیکھ لیا۔

(Change over)

غالب :۔ تو صاحبو! عرض کیا ہے۔

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
نہ رتنا برشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ۔!
مرے دریائے بے تابی میں ہے اک جوئے خوں وہ بھی

مرزا :۔ عرض کیا ہے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے
بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

(لوگوں کی داد کلب شمع شور اس پر Superm poro ہوکر ایک شعر پھر وہی شور پھر دبی شور محرشور کا غلغلہ جاری ہا اور شعر اس شور میں دب جاتا ہے)

غالب :۔
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

مرزا :- غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کے بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

غالب :- حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

(یوسف مرزا کا قہقہہ دیر تک فضا میں گونجتا رہتا ہے)

مرزا :- یہ قہقہہ سن رہے ہو تم۔ تم بہادر شاہ کے مورخ بنے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تم نے اپنا روزنامچہ لکھا دستنبو، نام اچھا تھا مگر تم نے اس قہقہے کے ساتھ بے انصافی کی۔

غالب :- کون سا قہقہہ؟

مرزا :- ہاں صاحب تمہیں کیا یاد ہوگا۔ کیا تمہیں معلوم نہ تھا کہ تمہارا بھائی بخار میں مبتلا ہو کر نہیں مرا فرنگی سپاہیوں نے اسے گولی کا نشانہ بنایا۔

غالب :- معلوم تھا۔

مرزا :- پھر تم نے دستنبو میں کیوں نہیں لکھا۔

غالب :- تم نے مجھے کہاں لکھنے دیا۔ امیرزادے نے میرے ہاتھ سے قلم چھین لیا۔ شاعر مجاہد بھی بن سکتا تھا مگر امیرزادہ ہرگز نڈر نہیں ہوتا۔ تمہیں دربار کی اگلی صف میں جگہ لینی تھی اس لئے تم میری کمزوری بنکر سامنے آگئے اور پھر ایک بات سنو، میں ہرگز نہیں جانتا تھا کہ زمانہ ایسے پلٹے کھائے گا اور یہ جوئے خوں اس طرح سر سے گزر سے گی۔

مرزا :- یہ جھوٹ ہے!

غالب :- نہیں۔ سچ ہے بالکل سچ! اور جو کچھ میں جانتا تھا اسے سنو گے۔

مرزا :- سناؤ، ضرور۔ سناؤ۔

(پس منظر سے غزل کے اشعار ابھرتے ہیں)

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوس ناؤ و نوش ہے

(پورا قطعہ)

مرزا :۔ "شاعر اچھے ہو غالب"

قدر افزائی کا شکریہ

غالب :۔ ظلِ سبحانی نے بھی ایک بار غزل سن کر فرمایا تھا : "مرزا پڑھتے خوب ہو۔"

مرزا :۔ یہ بتاؤ کہ زندگی ایسی بے دردی سے گزارنے کے بعد ایسے بے پناہ شعر کیسے کہہ لئے تم نے۔ مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔

غالب :۔ امیرزادوں کو کس کی خبر ہوتی ہے۔ تم جانتے نہیں یا جان بوجھ کر انجان بنتے ہو۔ میں اگر کامیاب ہو جاتا پنشن پا لیتا خلعت اور منصب مجھے مل جاتا میں بھی اپنے باپ اور چچا کی طرح رسالدار ہو جاتا امیرزادہ کہلاتا تو میں امیرزادوں ہی کی باتیں کرتا گھلی بے سر پا سی مگر درد نے مجھے اس دلدل سے نکال کر پورے زمانے کے انسانوں کی صف میں لا کھڑا کیا میں نے اپنے زمانے کا درد لے لیا میں اپنے دور کے سبھی انسانوں کی عبرت اور عظمت کا مرقع بن گیا میں نے کہا ہے۔

مرزا :۔ پھر شعر سناؤ گے۔

غالب :۔ نہیں، شعر فہمی تم میں کہاں، تمہیں ترجمہ سناتا ہوں۔

اس نے چہرہ بے نقاب کر کے میرے بے ہودہ بکنے والے ہونٹوں پر مہر لگا دی ہے۔ میرا دل لے لیا ہے اور دیکھنے والی دو آنکھیں دے دی ہیں، میرے ہاتھ سے پادشاہانِ عجم کا نشان لے لیا گیا ہے اور اس کے بدلے میں خزانے بخشنے والا قلم دے دیا گیا ہے یہ شاعری جس کی تم کبھی کبھی تعریف کرتے ہو اور مجھے ہو کر اس کا حق ادا ہو گیا ہے یہ شاعری میری پوری زندگی کے دکھ درد کا مول ہے۔

مرزا :۔ دکھ درد کی بات نہ کرو۔ مزے سے شراب پیتے ہو۔ بڑھاپے میں بھی تمہارے اوپر جان چھڑکنے والے دوست شاگرد سبھی موجود تھے۔

غالب :۔ اور قاطع برہان کے ہنگامے پر گالیاں دینے والے؟

مرزا :۔ اس ہنگامے میں تم خواہ مخواہ پڑ گئے اپنا علم و فضل جتانے کے لئے۔

غالب :۔ شاعر کو لفظ اور لغت پر اظہارِ خیال کی آزادی نہیں دو گے۔

مرزا :۔ تمہاری اکثر رائیں غلط تھیں۔

غالب :۔ کیا مجھے غلط رائے رکھنے کا حق نہیں تھا۔

مرزا :۔ ہوگا؟ میں کہہ رہا تھا کہ بڑھاپے میں تمہیں سبھی عیش مل گئے تھے۔ شہرت۔ بچوں کا سکھ۔ عارف کے بچے کیا کیا مزے کرتے تھے پلنگ کی صاف، چادروں پر میلے میلے پاؤں لے کر چڑھتے کیا کیا تنگ کرتے

تھے۔

غالب:۔ ہاں۔ انہیں کو تو میں نے اپنے خطوں میں ہتھکڑیاں کہا ہے۔

مرزا:۔ پھر نواب رام پور جیسے قدرداں جو برابر سے ملتے تھے اور سلوک کرتے تھے۔

غالب:۔ میری مسرتوں کو روپے پیسے، دوستوں اور خاندان کے دکھ سکھ سے ناپتے ہو۔ بڑے نادان ہو۔

مرزا:۔ احسان فراموش ہو۔ امیر زادے نہ ہوتے تو زندگی سے پیار کرنا نہ سیکھتے عیش کا مطلب نہ سمجھتے عزت کی تڑپ سے واقف نہ ہوتے۔

غالب:۔ اور ان نعمتوں کے لئے جب میں تڑپتا ہوں تو تم ہنستے ہو۔ زندگی بھر میں روتا رہا اور تم ہنستے رہے...

...... تم نے زندگی سے بے پناہ پیار کرنا سکھایا، مگر فقط اس کا لالچ دیا۔ اس کا عرفان نہیں دیا میری شاعری ہے کیا مرزا۔ صرف اتنی کہ مجھے زندگی اور حسن سے بے پناہ پیار ہے اس کی لذت اس کی بے پناہ خوب صورتی پر میری جان جاتی ہے پھر اپنی کوتاہ دامنی پر نظر جاتی ہے تڑپتا ہوں اپنی محبوبی پر شکوہ سنج ہوتا ہوں اپنی نارسائی پر۔ اگر کوئی نشاط اور نارسائی کا شاعر ہو سکتا ہے تو میں ہوں مرزا۔ اور نشاط و رسائی کے اسی دعوے پر اپنی کلاہ کج کرتا ہوں اور تم سے ہنا جتا ہوں۔ اس پر قہقہہ لگاتا ہوں اور درد کے زہر کو مسکراتے مسکراتے شراب ناب کی طرح پی جاتا ہوں۔ میں نے آبگینے کے ٹکڑے گلا کر ساغر شراب میں ڈال لئے ہیں کہ سینہ زخمی ہو اور لب تبسم آشنا ہوں۔

مرزا:۔ یہ ہمت!

غالب:۔ یہ ہمت ہی میرے عہد اور تمہارے درمیان مشترک تھی یہ ہمت ہی میرے اور آج کے زمانے کے درمیان مشترک ہے۔ یہ ہمت ہی مجھے زندہ رکھتی ہے میں دیکھتا ہوں آج کے نوجوانوں کے چہرے۔

غالب:۔ مرجھائے ہوئے اداس، مگر میں نے دیکھا ہے۔ جب میرا دیوان پڑھتے ہیں۔

مرزا:۔ وہی چھوٹا سا اردو دیوان۔

غالب:۔ جی ہاں، جب وہ پڑھتے ہیں تو ان کے چہروں پر اک حوصلہ ابھرتا ہے یہ کہ وہ زندگی سے ہاریں گے نہیں یہ کہ وہ آرزو مندی کی تڑپ سے دامن نہیں بچائیں گے وہ پھر چاہیں گے۔ دل کی گہرائیوں سے پھر تمنا کریں گے۔ اور پھر شکست آرزو کی چبھنوں سے گزریں گے۔

مرزا:۔ تمہارا شکوہ پورا ہوا مگر میں!

غالب:۔ تمہارا کیا ہے؟ تم ہزاروں لاکھوں امیر زادوں کی طرح ایک امیر زادے تھے۔ عیش کئے یا عیش کی تمنا کی اور واپس چلے گئے۔

گئے۔

مرزا :- ہر وجود ایک سوال ہے میرا وجود ایک ایسے زمانے میں جب تمام چیزیں جو مجھے عزیز تھیں۔ مٹ رہی تھیں بہت بڑا سوال تھا۔ تمہیں کیا حق تھا کہ اس طرح مجھ سے کھیلو۔ جو مجھے عزیز تھا وہ مجھ سے چھین لو اور جو کچھ آنے والا ہے اسے قبول کرنے پر مجھے مجبور کرو۔ صبح کے وقت تم نے کبھی چراغوں کی بے بسی دیکھی ہے تم تو شاعر ہو...
...... کیا تم بھی اس دردِ ناتمامی کو محسوس نہ کر سکے اور آج اس ادھورے انسان پر رونے والا بھی کوئی نہیں ہے تمہارے سب پرستار ہیں، شاعر غالب کے سب شیدائی ہیں لیکن مرزا نوشہ کا کوئی ہمدم کوئی دوست کوئی آشنا نہیں۔

(پس منظر سے غزل کے اشعار ابھرتے ہیں)

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

ساحر لدھیانوی

جشنِ غالب

اکیس برس گزرے آزادیِ کامل کو — تب جا کے کہیں ہم کو غالب کا خیال آیا

تربت ہے کہاں اسکی مسکن تھا کہاں اس کا — اب اپنے سخن پرور ذہنوں میں سوال آیا

سو سال سے یہ تربت چادر کو ترستی تھی — اب اس پہ عقیدت کے پھولوں کی نمائش ہے

اُردو کے تعلق سے کچھ بھید نہیں کھلتا — یہ جشن یہ ہنگامہ خدمت ہے کہ سازش ہے

جن شہروں میں گونجی تھی غالب کی نوا برسوں — ان شہروں میں اب اُردو بے نام و نشاں ٹھہری

آزادیِ کامل کا اعلان ہوا جس دن — اس ملک کی نظروں میں غدّار زباں ٹھہری

جس عہدِ سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی — اس عہدِ سیاست کو مرحوموں کا غم کیوں ہے؟

غالب جسے کہتے ہیں اُردو ہی کا شاعر تھا — اُردو پہ ستم ڈھا کر غالب پہ کرم کیوں ہے؟

یہ جشن یہ ہنگامہ دلچسپ کھلونے ہیں — کچھ لوگوں کی کوشش ہے کچھ لوگ بہل جائیں

جو وعدۂ فردا پر اب ٹل نہیں سکتے ہیں — ممکن ہے کہ کچھ عرصہ اس جشن پہ ٹل جائیں

یہ جشن مبارک ہو لیکن یہ صداقت ہے — ہم لوگ حقیقت کے احساس سے عاری ہیں

گاندھی ہو کہ غالب ہو انصاف کی نظروں میں
ہم دونوں کے قاتل ہیں دونوں کے پجاری ہیں

ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ گورکھپور یونیورسٹی

غالب کی شاعری میں دنیا سے کنارہ کشی کا رجحان

کیرن ہارنی نے دنیا سے کنارہ کشی (Withdrawal from other) کے رجحان کو نرگسیت کے زمرہ میں رکھا ہے اس کا قول ہے کہ نرگسی انسان اپنی محدود اور مخصوص فضا میں سانس لیتا ہے اور دنیاوی علائق سے خود کو منقطع کر لیتا ہے۔ اس کی ساری توجہ اپنی ذات پر مرکوز ہوتی ہے اور اس کو اپنے خیالی شیش محل میں اپنی ہی تصویر نظر آتی ہے۔

نرگسی انسان کی خلوت نشینی کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب ناکامی ہے۔ (Elements of Psychology) کے مصنفین نے لکھا ہے کہ مشکلات کے موقع پر انسان دو راستے اختیار کرتا ہے۔ یا تو وہ خطرہ کا مقابلہ ڈٹ کر کرتا ہے۔ یا پھر راہ فرار اختیار کر لیتا ہے پہلی صورت میں انسان خود نمائی، مماثلت، معاوضہ، عقل مندی اور منصوبہ سے کام لیتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشۂ تنہائی میں چھپ جاتا ہے۔

ہماری خواہش ہوتی ہے کہ دنیا ہماری طرف متوجہ ہو اور محسوس کرے کہ ہم بھی اس دنیا میں سانس لیتے ہیں۔ اس قسم کا جذبہ انسان میں بچپن ہی سے موجود ہوتا ہے بعض بچے توجہ حاصل کرنے کے لئے مختلف قسم کی شرارتیں کرتے ہیں۔ مثلاً خود نمائی کرنا دوسروں کو پریشان کرنا، جھگڑا کرنا اور بڑوں سے گستاخی کرنا ان کا شیوہ ہو جاتا ہے۔ کچھ مراقی لوگوں میں اپنی تندرستی پر زیادہ توجہ کرنے کی خصلت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ معمولی سی بیماری پر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ غرضیکہ وہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

بعض وقت انسان اپنی ناکامی کے احساس کو چھپانے کے لئے ایسے شخص سے خود کو مماثل کر لیتا ہے۔ جس کے سر پر کامیابی کا سہرا ہوتا ہے۔ جن لوگوں میں احساس کمتری کی شدت ہوتی ہے وہ اس جذبہ کو زیادہ استعمال کرتے ہیں مثلاً کوئی مریض خود کو نپولین یا حضرت عیسیٰ مسیح تصور کرتا ہے۔ کبھی کبھی انسان اپنی خامی کی تلافی دیگر ذرائع سے کرتا ہے۔ مثلاً ایک نحیف الجثہ انسان زوردار آواز میں بول کر اپنی کمزوری کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ یا ایک ناکام عاشق ادبی کامیابی حاصل کر کے اپنے نقصان کی تلافی کرتا ہے۔

ناکامی کی صورت میں انسان عقل سے کام لیتا ہے۔ اور وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دیتا ہے کہ اپنی خامیوں کی بنا پر وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ ناکامی کی صورت میں کچھ انسان اپنی خامیوں کو دوسری اشیا کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ اس قسم کا خیال وہ ایک خاص منصوبہ کے تحت ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً ایک ناکام کھلاڑی خود کے بجائے اپنے بلّے کو مورد الزام ٹھہراتا ہے[1]

انسان کے سامنے ایسے بھی پیچیدہ مواقع آتے ہیں جب وہ اپنے میں تاب مقاومت نہیں دیکھتا ہے تب وہ مشکلات سے گریز کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس میں بزدلی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور وہ گوشۂ خلوت میں زندگی گزارنے لگتا ہے۔ کسی مقابلہ کے امتحان میں شرکت نہ کرنا اس کی واضح مثال ہے کیوں کہ انسان سوچتا ہے کہ جب وہ مقابلہ میں شرکت ہی نہیں کرے گا تو شکست کا سوال ہی نہیں پیدا ہوگا۔

گریز انکار کی صورت میں بھی رونما ہو سکتا ہے۔ خصوصاً بعض بچے والدین کے حکم کو ٹھکرا دیتے ہیں یا پھر ان کے حکم کے خلاف کام کرتے ہیں۔ بالغ انسانوں میں بھی یہ رجحان پایا جاتا ہے یہ ایک قسم کی بغاوت ہے جس کے ذریعہ انسان مشکل لمحات سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

کنارہ کشی کی ایک صورت مراجعت (Regression) بھی ہے۔ جب بچہ کسی مشکل معاملہ میں خود میں مقابلہ کی قوت نہیں پاتا ہے تو وہ رونے لگتا ہے اس طرح وہ اپنی طفلی کے دور میں مراجعت کرتا ہے۔ بعض وقت بالغ انسان بھی گریہ وزاری شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے موقع پر ان کے لئے رونا ناگزیر ہوجاتا ہے وہ اس حرکت کا مظاہرہ کر کے اپنے عہدِ طفلی میں واپس جاتے ہیں۔ یہ ان کے سکونِ قلب کا ایک ذریعہ ہے۔

انسان کنارہ کشی کا ایک اور طریقہ اختیار کرتا ہے، وہ واہمہ کی دنیا میں زندگی بسر کرنے لگتا ہے اس کی عادت بچپن ہی سے پڑ جاتی ہے۔ مثلاً ایک چھوٹی بچی ماں کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور پھر اسی طرح کی نقل و حرکت کرنے لگتی ہے۔ اسی طرح ایک چھوٹا بچہ پولیس مین یا حاکم بن جاتا ہے اور اپنے احکام جاری کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح بالغ انسان بھی دن کے خواب (Day dreaming) سے جی بہلاتا ہے اور تصورات میں مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے۔ اس قسم کے ہوائی محل تیار کرنا انسان کے لئے مفید ہے۔ کیونکہ وہ اپنی اصلی غمگین دنیا سے تھوڑی دیر کے لئے نجات حاصل کر لیتا ہے اور اس کو سکونِ قلب کی دولت حاصل ہوجاتی ہے[2]

1- New ways in Psychoanalysis by Karen Horney P.88

2- Elements of Psychology by V.K. Kathurkar and L.B. Kuno-Lkar. P. 193 - 195

انسان انسداد (Repression) کے ذریعہ بھی موقع سے گریز کرتا ہے وہ اپنے بہت سے جذبات کو دبا دیتا ہے۔ اس طرح وہ مشکل احول پر قابو حاصل کر لیتا ہے۔ اگر انسان اپنے جذبات پر قابو حاصل نہیں کر پاتا ہے تو وہ مشکلات سے دوچار ہوتا ہے اور اس کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ اس لئے انسداد بھی کنارہ کشی کا ایک موثر حربہ ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انسان کنارہ کشی زیادہ تر ناکامی کی صورت میں کرتا ہے لیکن کچھ لوگ امراض کی بنا پر بھی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں فرائڈ کا قول ہے کہ جو لوگ تحلیل نفسی کے مطالعہ میں معروف رہے ہیں انھوں نے نہایت حیرت کے ساتھ یہ محسوس کیا ہے کہ نرگسی رجحان کی انحرافی خصوصیات بہت سے ایسے افراد میں ہوتی ہیں جو دماغی خلل میں مبتلا ہوتے ہیں مثلاً بقول سڈگر (sadgee) ہم جنسی کے مریض ہیں اس رجحان کا سراغ ملتا ہے۔[3]

نرگسی قسم کی کنارہ کشی کا رجحان ان لوگوں میں بھی پایا جاتا ہے جو اعصابی خلل (Neurosis) کے شکار ہوتے ہیں مگر فرائڈ کا خیال ہے کہ یہ رجحان گمراہی (Perversion) کا مظاہرہ نہیں کرتا ہے بلکہ جذبہ خود حفاظتی کے تحت خود پسندی اور خود غرضی کو نمایاں کرتا ہے۔ فرائڈ کی نظر میں خود حفاظتی کا جذبہ معیوب نہیں ہے کیونکہ یہ جذبہ بجا طور پر ہر ذی روح میں موجود ہوتا ہے۔[4]

الفریڈ اڈلر کے نظریہ کے مطابق اعصابی خلل کا خاص سبب ناکامی ہے۔ ناکام شخص ہمہ وقت اس فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح اپنی خامی کو دور کیا جائے وہ بعض اوقات فضول کاموں کی طرف دوڑتا ہے۔ نئی ناکامیوں سے خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اعصابی پریشانی، درد، مفلوجی کیفیت اس کو زندگی میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لینے سے روکتی ہے اس طرح اس پر مفعولی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔[5]

شیزوفرینیا (Schizophrenia) کے مریض بھی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ کولمبیہ انسائیکلوپیڈیا کے مؤلف نے اس مرض پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کا قول ہے کہ ۱۸۶۹ء میں ایک کریپلن

3- Collected Papers by Frend edited by Ernest Jones - V. IV P. 30

4- Collected papers by Frend, edited by Ernest jones V. IV P. 30

5- The Practice and Theory of Individual psychology by Alfred Adler . P. 16

ڈیمنیا پریکاکس (Dementia Praecox) نے اس مرض کے لئے ڈیمنشیا پریکاکس (Emil Kraeplin) کا نام تجویز کیا تھا اور اس کی چار قسمیں بتائی تھیں (۱) Hebephrenic (۲) Simple (۳) Paranoid (۴) Catatonic کریپلن کا خیال تھا کہ یہ مرض لاعلاج ہے مگر ۱۹۱۱ء میں یوگین بلیلر (Eugen Bleauler) نے اپنا نیا نظریہ پیش کیا اور ثابت کیا کہ اس مرض کا علاج ہو سکتا ہے۔ اس نے اس بیماری کا نام شیزوفرینیا رکھا۔ اس کا خیال ہے کہ یہ مرض سنِ بلوغت کے آغاز میں یا عنفوانِ شباب میں ابھرتا ہے۔ اس مرض کی خصوصیت اس نے یہ بتائی ہے کہ ایسے مریض کے دماغ میں سوسائٹی سے علیحدگی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے سوچنے کا طریقہ ناقص ہوتا ہے۔ اس کے افعال غیر معقول ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اندرونی دنیا میں سانس لیتا ہے اور لوگوں سے فطری تعلقات قائم رکھنے میں ناکام رہتا ہے۔ وہ فریبِ خیال، توہم، خبطِ دماغ، سلبی صفت اضطراری کیفیت اور بے ربطی وغیرہ میں مبتلا رہتا ہے۔ انہیں خصوصیات کی بنا پر ایسا مریض دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے ۶

Elements of Psychology کے مولفین نے بھی شیزوفرینیا کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ اس قسم کا مریض خلوت پسند ہو جاتا ہے۔ اور اس کے جذبات و احساسات میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا کے اشخاص اور اشیاء سے بے اعتنائی برتتا ہے۔ اس پر تبسم و غصہ کا اثر کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ وہ حقیقت کا سامنا کرنے کی تاب بالکل نہیں رکھتا۔ بلکہ خواب و خیال کی ایک دنیا آباد کرتا ہے۔ چونکہ ایسے لوگ اپنی ذات میں مستغرق رہتے ہیں اس لئے سوچتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں، ان پر ہنستے ہیں اور ان کے خلاف سازش کرتے ہیں۔ ایسا مریض غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ وہ بڑا آدمی ہے مگر اہلِ دنیا اس کی عظمت کو تسلیم نہیں کرتے ہیں ۷

کیرن ہارنی کا بھی قول ہے کہ شیزوفرینیا کا مرض نرگسیت کی طرف مراجعت (Regression) پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شاہد اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس قسم کے مریض حقیقت سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ وہ خود پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں اور جذبۂ برتری کا اظہار کرتے ہیں ۸

6- The Columbia Encyclopaedia, II Edition P. 1769

7- Elements of Psychology by V. K. Kothurkar and L. B Harolkir P. 203

8- New ways in Psychoanalysis by Karen Horney P. 149

فرائڈ نے شیزوفرینیا کے مریض کے لئے پیرافرینیا (Paraphrenia) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ اس قسم کے مریضوں کی دو خصوصیات ہوتی ہیں۔ پہلی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ احساس برتری (Magalomania) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دوسری خصوصیت ان میں یہ پائی جاتی ہے کہ وہ خارجی دنیا سے اپنی دلچسپی منقطع کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ان کو دنیا کے افراد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۹

اس بحث و مباحثہ کی روشنی میں ہم غالب کی دنیا سے کنارہ کشی کے رجحان کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ غالب کسی دماغی یا ذہنی مرض میں گرفتار نہیں تھے البتہ ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف تیس سال کی عمر میں پاگل ہو گئے تھے۔ اس بات کا سراغ لگانا مشکل ہے کہ مرزا یوسف کو عارضہ جنوں وراثت میں ملا تھا یا صرف وہ کسی دماغی حادثہ کی بنا پر پاگل ہو گئے تھے لیکن جہاں تک مرزا غالب کا تعلق ہے وہ صحیح الدماغ تھے۔ اس لئے ان کی دنیا سے ذہنی کنارہ کشی کا تعلق کسی مرض کی بنا پر نہیں ہے بلکہ انھوں نے گردش دوراں کے ہاتھوں مسلسل زہر کے پیالے پئے تھے۔ جس کی بنا پر ان کے کام و دہن میں تلخی سرایت کر گئی تھی۔ اس وجہ سے وہ ذہنی طور پر دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

غالب ایک خوددار انسان تھے، یہ خودداری ان کو اپنی خاندانی برتری کی بنا پر حاصل ہوئی تھی۔ ان کا تعلق ایران کے شاہی خاندان پیش دادیوں سے تھا جس کی بنیاد کیومرث نے ۵۵۰۰ قبل مسیح ڈالی تھی۔ اس خاندان میں بہت شان و شوکت اور جاہ و حشمت کے بادشاہ گزرے، جیسے سیامک، ہوشنگ، تہمورس، جمشید، فریدوں، تور، ایرج منوچہر، نوذر، افراسیاب اور زواب جیسے بادشاہوں نے اس خاندان کی عظمت کو بام ثریا تک پہنچا دیا تھا۔ جب اس خاندان پر زوال آیا تو کیانیوں نے ایران میں اپنی حکومت قائم کر لی مگر پیش دادیاں کا خاندان یکسر نیست و نابود نہیں ہوا بلکہ اس خاندان کے لوگ نواح ترکستان میں آباد ہو گئے اسی قبیلہ کا ایک شخص توقاق تھا توقاق ترکی لفظ ہے جسکے معنی کمان کے ہیں یہ مسلمان ہو گیا تھا۔ یہ ترک لوگ جاڑوں میں بخارا میں رہتے تھے اور گرمی سمرقند میں گذارتے تھے۔ اس کے بیٹے سلجوق نے ایران میں ازسرنو حکومت قائم کر لی اور سلجوقیہ خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کے مشہور بادشاہ طغرل، الپ ارسلاں، ملک شاہ اور ادر سنجر گذرے ہیں۔ جب سلجوقی خاندان پر زوال آیا تو اس کے افراد منتشر ہو گئے۔ اس خاندان کے ایک شہزادے ترسم خاں نے سمرقند میں اقامت اختیار کر لی۔ اس کا بیٹا توقان بیگ اپنے باپ سے ناراض ہو کر

۹۔ Collected Papers of Fred, edited by Ernest Jones V. IV P. 31.

لاہور آگیا اور نواب معین الملک کی ملازمت اختیار کی۔ نواب معین الملک کا انتقال ۱۷۵۳ء میں ہو گیا۔ تب توقان بیگ دلی آگئے اور شاہ عالم کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ان کو پچاس سواروں کا منصب ملا اور پہاسو کا علاقہ بھی بخش دیا گیا۔ توقان بیگ کے بیٹے کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا۔ یہی مرزا غالب کے پدر بزرگوار تھے۔ اس شجرہ کے ذریعہ ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ غالب کا تعلق شاہی خاندان سے رہا ہے۔ اسی لئے غالب نے جابجا اپنے اشعار میں تعلّی سے کام لیا ہے۔ مثلاً وہ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں۔

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم	لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی	بہ سترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک	در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فنِ آبائے ما کشاورزیست	مرزبان زادۂ سمرقندیم
ورنہ عشقِ سخن گذا دۂ	خود چہ گوییم و تا چہ وچندیم
فیضِ حق را کمینہ شاگردیم	عقلِ کل را بہمہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہم نفسیم	ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم
بہ تلاشی کہ ہست فیروزیم	بہ معاشے کہ نیست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمی گوییم	ہمہ بر روزگار می خندیم

غالب کے یہ اشعار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کو اپنے خاندان پر بہت ناز رہا ہے اسی بنا پر انہوں نے سربلندی اختیار کی اور وہ دوسروں سے خود کو برتر خیال کرنے لگے۔ غالب کی شخصیت کا یہ پہلو بہت اہم ہے جو ان کی ساری شاعری پر چھایا ہوا ہے۔

غالب کا بچپن بھی عیش و عشرت میں گذرا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ کا انتقال اس وقت ہوا جب مرزا غالب پانچ سال کے تھے۔ لیکن چونکہ مرزا عبداللہ بیگ بختاور سنگھ راجہ الور کی حمایت میں مارے گئے تھے اس لئے ریاست الور کی طرف سے غالب کو دو گاؤں مل گئے تھے اس کے ساتھ ہی کچھ روزینہ بھی ملتا تھا۔ اس لئے غالب بچپن میں تنگدست نہیں تھے۔

غالب کے والد کے انتقال کے بعد ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے ان کی پرورش کی ذمہ داری لی۔ مرزا نصراللہ بیگ پہلے مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کے صوبہ دار تھے جب لارڈ لیک نے ۱۸۰۳ء میں اکبرآباد پر حملہ کیا تو نصراللہ بیگ ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور بغیر جنگ کے انگریزوں سے صلح کر لی۔ اس لئے انگریز ان سے خوش ہو گئے اور ان کو چار سو سواروں کا رسالدار بنا دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد مرزا نصراللہ بیگ نے ریاست ہلکر سے سونک اور

سونن کے پرگنے چھین لئے۔ لارڈلیک مرزا نصراللہ بیگ کی اس بہادری سے بہت خوش ہوئے اور دونوں پرگنے ان کو بخش دیے۔ ایک سال کے بعد مرزا نصراللہ بیگ ایک جنگ میں ہاتھی سے گر کر فوت ہوگئے۔ اس کے بعد یہ دونوں علاقے ان کی ملکیت سے نکل گئے۔

مرزا نصراللہ بیگ کی وفات کے بعد ان کے سالے فخرالدولہ نواب احمد بخش نے ان کے متعلقین کے اخراجات کی ذمہ داری لی۔ نواب احمد بخش لارڈلیک کے خاص حامی اور دوست تھے اس لئے لارڈلیک نے ان کو حسن خدمت کے عوض فیروزپور جھرکہ اور لوہارو کی جاگیریں بخش دیں اور یہ طے کردیا تھا کہ اس کے عوض میں نواب احمد بخش انگریزی حکومت کو ۲۵ ہزار سالانہ ادا کرتے رہیں گے۔ مرزا نصراللہ بیگ کی وفات کے بعد نواب احمد بخش نے ان کے ورثہ کی پرورش کا یہ انتظام کیا کہ مئی ۱۸۰۶ء میں لارڈلیک سے مل کر ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ معاوضہ معاف کرالیا اور یہ بھی طے ہوا کہ مرزا نصراللہ بیگ چارسو سواروں کے دستے کے بجائے پچاس سواروں کا دستہ رکھیں جس پر نواب احمد بخش ۱۵ ہزار روپیہ سالانہ خرچ کریں اور دس ہزار روپیہ سالانہ مرزا نصراللہ بیگ کے ورثہ پر صرف کریں۔ پھر جون ۱۸۰۶ء میں نواب احمد بخش نے لارڈلیک سے ایک شقہ حاصل کرلیا جس کے بموجب مرزا نصراللہ بیگ کے ورثہ پر دس ہزار کے بجائے وہ صرف ۵ ہزار روپیہ سالانہ خرچ کریں۔ اس ۵ ہزار میں بھی دو ہزار روپیہ سالانہ خواجہ حاجی کو ملتے تھے جو بقول غالب ان کے چچا کے ملازم تھے۔ مگر وہ خود کو مرزا نصراللہ بیگ کے عزیزداروں میں شامل کرتے تھے۔ اب باقی تین ہزار روپیہ سالانہ میں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ مرزا نصراللہ بیگ کی ماں اور ان کی تین بہنوں کو ملتا تھا اور ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ مرزا غالب کو اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کو ملتے تھے۔ اس طرح مرزا غالب کے حصہ میں صرف ۷۵۰ روپیہ سالانہ کی رقم آئی تھی۔ مرزا صاحب اس بٹوارہ سے ۱۸۲۶ء میں واقف ہوئے جب خواجہ حاجی کا انتقال ہوا۔ مرزا غالب سمجھتے تھے کہ خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد ان کی دو ہزار روپیہ سالانہ کی رقم ان کو مل جائے گی۔ مگر یہ رقم نواب احمد بخش کے بیٹوں میں تقسیم ہوگئی۔ مرزا غالب اس بٹوارہ سے غیر مطمئن تھے اور ان کو اپنی حق تلفی کا شدید احساس تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مرزا غالب کا بچپن ننہیال میں لطف و مسرت کے ساتھ گذرا۔ ان کے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان کے پاس آگرہ میں کافی جائداد تھی۔ اس کے علاوہ متعدد گاؤں ان کی ملکیت میں تھے۔ اس لئے ان کا شمار آگرہ کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کو آگرہ میں آسائش حاصل تھی اور وہ اس دور میں فکر معاش سے آزاد تھے۔ مگر جب ۱۸۱۰ء میں غالب کی شادی دہلی کے نواب فخرالدولہ احمد بخش کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوگئی اس وقت سے ان کا قیام زیادہ تر دہلی ہی میں رہا۔ اس وقت غالب کی عمر ۱۳ سال کی تھی۔ غالب کی زندگی دہلی میں زیادہ خوش حالی اور فارغ البالی

سے نہیں گذری۔ کیونکہ ان کو فیروز پور جھرکہ اور لوہارو سے قلیل رقم ملتی تھی اس لئے ان کو قرض لینے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی تھی۔

مرزا غالب نے ۱۸۲۸ء میں جب کلکتہ کا سفر کیا۔ اس وقت بھی ان کی خود داری کو ٹھیس لگی۔ وہ کلکتہ اپنی پنشن کے تصفیہ کے سلسلے میں گئے تھے۔ جس میں ان کو ناکامی ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ کلکتہ میں ان کے کلام پر اعتراضات کئے گئے اور ثبوت و سند میں قتیل کے اشعار پیش کئے گئے۔ مرزا غالب قتیل کو کوئی مستند شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اہل کلکتہ کے اعتراضات کو ٹھکرا دیا اور ایک مثنوی "باد مخالف" کے نام سے شائع کی جس میں اپنی غریب الوطنی اور اہل کلکتہ کی بے مروتی کی شکایت کی۔ اس واقعہ نے بھی مرزا غالب کو بہت بد دل اور مایوس کر دیا۔

مرزا غالب جب کلکتہ سے ناکام واپس آئے تو کچھ قرض خواہوں نے ان پر دیوانی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ اور ڈگری حاصل کر لی۔ مرزا صاحب کے لئے ڈگری کی رقم ادا کرنا دشوار تھا۔ اس لئے جیل جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر چونکہ غالب شہر کے ممتاز لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس لئے ان کے ساتھ یہ رعایت کی گئی کہ عدالت کا چپراسی ان کے گھر پر بٹھا رہتا تھا۔ یہ ایک قسم کی قید خانہ نشینی ہو گئی۔ مرزا غالب پر یہ واقعہ بھی بہت شاق گذرا[1]

۱۸۳۵ء میں غالب کو ایک مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ۱۸۲۲ء میں نواب احمد بخش نے اپنی جائداد کا بٹوارہ کیا۔ اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست اپنے بیٹے نواب شمس الدین کے نام لکھ دی جو میواتی بیوی بہو خانم کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اور لوہارو کی جاگیر اپنی دوسری بیوی بیگم جان کے بیٹوں امین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے نام منتقل کر دی۔ نواب احمد بخش کی وفات کے بعد نواب شمس الدین نے کوشش کی کہ لوہارو کا علاقہ بھی ان کو مل جائے اور ان کے دونوں بھائیوں کے لئے جو نابالغ تھے۔ پنشن مقرر کر دی جائے۔ حکومت ہند نے یہ تجویز منظور کر لی۔ مگر ولیم فریزر نے جو اس وقت دہلی کے ریزیڈنٹ تھے، گورنر جنرل کے یہاں سے یہ فیصلہ کرا دیا کہ لوہارو امین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں ہی کو ملے۔ نواب شمس الدین اس فیصلے سے سخت برہم ہوئے اور سازش کر کے ریزیڈنٹ فریزر کو قتل کرا دیا۔ اس جرم کے سلسلے میں انگریزی سرکار نے تفتیش کی اور غالب سے بھی باز پرس کی گئی۔ اگرچہ غالب کا ہاتھ اس قتل میں نہ تھا تاہم اس تفتیش کو صدمہ پہنچا اور ان کی شان خودداری کو ٹھیس لگی۔ آخر میں یہ پتا چل گیا کہ نواب شمس الدین نے فریزر کو قتل کرایا۔ اس لئے ان کو اکتوبر ۱۸۳۵ء میں

---

[1] حیات غالب۔ شیخ محمد اکرام ص۹۷، ۹۸

کشمیری دروازے کے باہر پھانسی دیدی گئی لہ

اس سے زبردست ایک اور واقعہ مرزا غالب کی زندگی میں رونما ہوا۔ یہ واقعہ ۱۸۴۷ء کا ہے۔
ایک روز مرزا غالب چوسر کھیل رہے تھے کہ فیض الحسن شہر کے کوتوال کو کچھ دشمنوں نے خبر کردی۔ مجسٹریٹ نے کوتوال شہر کی رپورٹ پر غالب کو ۶ ماہ کی قید بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا کا حکم دے دیا۔ مرزا کو اگرچہ قیدخانے میں کوئی تکلیف نہ تھی مگر وہ اس ذلت کو برداشت نہ کر سکے۔ کچھ حاکموں کی سفارش سے مجسٹریٹ نے تین ماہ کے بعد ان کی رہائی کا حکم صادر کردیا۔ مرزا غالب نے رہائی کے بعد اس واقعہ کا ذکر ایک فارسی خط میں کیا ہے۔ جس کا ترجمہ حالی نے یادگار غالب میں پیش کیا ہے مرزا غالب تحریر فرماتے ہیں۔

"میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جان فرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بہ صحرا نکل جاؤں۔" لہ

اس عبارت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کس قدر بددل اور مایوس ہو گئے تھے۔
۱۸۵۱ء میں مرزا غالب کو ایک اور شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۸۵۰ء میں غالب کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ملازمت مل گئی اور وہ شاہان تیموری کی تاریخ لکھنے کے لیے مامور کیے گئے۔ اس کے معاوضہ میں چھ سو روپیہ سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ان کو مرزا نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ کے خطابات سے نوازا گیا۔ اور خلعت سے بھی سرفراز کیا گیا۔ مگر اس کے بعد غالب کی قسمت نے ایک بار پھر دھوکا دیا۔ مرزا غالب کے حریف ذوق بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے اور بادشاہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ۱۸۵۱ء میں مرزا جواں بخت کی شادی تھی۔ غالب نے سہرا کہا اور مقطع میں ذوق پر چوٹ کی۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھکر سہرا

بادشاہ کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔ انھوں نے ذوق کو حکم دیا کہ تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ ذوق نے سہرا کہا اور مقطع میں غالب کو جواب دیا۔

لہ فکر غالب۔ پرتھوی چندر ص ۳۰ تا ۳۱
لہ یادگار غالب۔ حالی۔ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ص ۴۲

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو　　　　دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

مرزا غالب اداشناس تھے، اس لئے معذرت میں ان کو ایک قطعہ کہنا پڑا۔

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی　　　　اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں ہے

ظاہر ہے کہ یہ عذرنامہ غالب کی خودداری کے خلاف تھا۔ مگر بدرجۂ مجبوری انھوں نے یہ ذلت بھی گوارا کی۔ مرزا غالب کو غدر کے زمانہ میں بھی بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو شہریوں کا قتلِ عام شروع ہوگیا۔ اس کے علاوہ گھروں کے اندر گھس گھس کر انگریزوں نے لوٹ مار شروع کی اور بہت سے شہریوں کو قید کرلیا۔ اسی زمانہ میں کچھ گورے غالب کے گھر میں بھی داخل ہوگئے۔ انھوں نے غالب کو اور مرزا عارف کے دو بچوں اور ان کے نوکروں کو گرفتار کر کے کرنل براؤن کے سامنے پیش کیا۔ مگر کرنل براؤن نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور رہا کر دیا۔ مگر یہی کیا کم ذلت ہے کہ مرزا غالب کو کرنل براؤن کی خدمت میں بحیثیت ایک قیدی حاضر ہونا پڑا۔ اس واقعہ سے مرزا غالب کی خودداری مجروح ہوگئی۔

غدر کے زمانے میں ایک اور زبردست سانحہ پیش آیا۔ ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کا انتقال ہوگیا جب دہلی فتح ہوگئی تو شہر میں قیامت برپا ہوگئی۔ انگریزوں نے مرزا یوسف کے گھر پر بھی دھاوا کیا۔ اس موقعہ پر ان کی بیوی اور ان کے بچے گھر چھوڑ کر بھاگ نکلے اب گھر پر ایک بوڑھی نوکرانی اور ایک بوڑھا دربان رہ گیا۔ اسی دوران مرزا یوسف بخار میں مبتلا ہوگئے اور پانچ دن کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کو بڑی مشکل سے پٹیالہ کے سپاہیوں کی نگرانی میں ایک مسجد میں دفن کیا گیا۔ مرزا یوسف کی موت نے مرزا غالب کی کمر توڑ دی۔

غدر کے بعد مرزا غالب کی مالی حالت بھی بہت پست ہوگئی تھی۔ برٹش گورنمنٹ نے ان کی پنشن بند کردی تھی، کیونکہ ان پر یہ الزام تھا کہ وہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کی پنشن تین سال تک بند رہی۔ اس دوران میں انھوں نے زیور اور کپڑے بیچ کر اپنی زندگی گذاری۔ بالآخر سر سید احمد خاں کی سفارش سے ۱۸۶۰ء میں مرزا غالب کی پنشن دوبارہ جاری ہوگئی اور ان کو تین سال کا بقایا بھی مل گیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد ان کو درباری اعزاز اور خلعت سے بھی سرفراز کیا گیا۔

غدر کے بعد جب دہلی میں سکون قائم ہوگیا تو دستنبو لکھنے کے بعد غالب نے مشہور فارسی لغت برہان قاطع کا مطالعہ شروع کیا۔ اس لغت میں ان کو بہت سی خامیاں نظر آئیں چونکہ غالب کو فارسی زبان پر عبور حاصل تھا، اس کے علاوہ اس وقت ان کے پاس پارسیوں کی کتاب دساتیر موجود تھی۔ اس لئے انھوں نے برہان قاطع کی ساری غلطیاں کو یکجا کیا اور ۱۸۶۲ء میں قاطع برہان کے نام سے ایک رسالہ شائع کردیا۔ اس رسالہ کی سخت مخالفت کی گئی اور اس کے جواب میں محرق قاطع، قاطع، قاطع، موید برہان اور ساطع برہان وغیرہ رسالے شائع

ہوئے، اس طرح غالب پر چاروں طرف سے دھاوا بول دیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک اسبارسالہ قاطع برہان کے جواب میں لکھا گیا۔ جس میں دشنام طرازی سے کام لیا گیا تھا۔ غالب نے اس بنا پر ازالہ حیثیت عرفی کی نالش کی مگر ان کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی اس لئے انھوں نے عدالت میں راضی نامہ داخل کر دیا۔ مقدمہ داخل دفتر ہونے کے بعد مرزا غالب کو کچھ لوگوں نے گمنام خطوں میں گالیاں لکھ کر روانہ کیں۔ ان خطوط میں ان کی شراب نوشی اور لامذہبی پر بھی چوٹ تھی غالب کو اس طوفان کا بھی سامنا کرنا پڑا جس نے ان کی ہستی کو خس و خاشاک کی طرح پامال کر دیا۔

جب ہم غالب کے حالات زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کو زندگی میں کچھ ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کی قدر دانی بھی ہوئی۔ مولوی فضل الحق۔ نواب امین الدولہ۔ نواب حسام الدین اور نواب مصطفےٰ خاں وغیرہ ان کے قدر داں تھے ان کو دہلی کالج کی پروفیسری کے لئے بھی مدعو کیا گیا مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ ان کی رسائی بہادر شاہ ظفر کے دربار تک بھی ہوگئی۔ وہ ولی عہد شاہزادہ فتح الملک کے استاد بھی رہے۔ انکی وفات کے بعد وہ مرزا فخرو کے استاد ہوئے ۱۸۵۴ء میں جب ذوق کا انتقال ہوگیا تو غالب بہادر شاہ ظفر کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔ اس طرح ان کو ہمیشہ مغل دربار سے کسی نہ کسی صورت میں مشاہرہ ملتا رہا۔

اس کے علاوہ نواب یوسف علی خاں والی رام پور نے بھی غالب کی شاگردی اختیار کی۔ اس زمانہ میں غالب کی پنشن بند تھی مگر نواب یوسف علی خاں نے ان کو ایک معقول مشاہرہ دینا شروع کر دیا۔ نواب یوسف علی خاں کی وفات کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی اسی مشاہرہ کو برقرار رکھا۔

بہر حال غالب کی ان کے دور میں کچھ نہ کچھ قدر دانی ضرور ہوئی مگر وہ اس قدر دانی سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کی رگوں میں پیشں دادیوں اور سلجوقیوں کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس لئے وہ شاہانہ زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ مگر چونکہ مغل حکومت کا تو شیرازہ بکھر رہا تھا۔ اس لئے مرزا غالب کی ان کے حوصلہ کے مطابق عزت افزائی نہ ہو سکی۔ غالب کا مندرجہ ذیل شعر ان کی ساری زندگی کا نچوڑ ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غالب پر ناکامئ حیات کی وجہ سے محرومیت اور یاسیت چھائی تھی۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے بیزار تھے۔ اسی بنا پر وہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتے تھے ان کے مندرجہ ذیل اشعار واضح طور پر ان کی کنارہ کشی کی غمازی کرتے ہیں۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار — اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ان اشعار کے علاوہ ان کے بہت سے ایسے اشعار ہیں جو ان کے اس رجحان کو واضح کرتے ہیں مثلاً جہاں کہیں غالب نے دشت و صحرا کا ذکر کیا ہے ان سے ان کی کنارہ کشی کے رجحان پر روشنی پڑتی ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں — جادۂ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ — ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش — صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر — مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا — حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

موجِ سراب دشتِ وفا کا نہ حال پوچھ — ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں — ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

قفس کا لفظ جن اشعار میں آیا ہے وہ بھی ان کی کنارہ کشی کے رجحان کا آئینہ ہے۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیاں کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم   گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو   مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے   دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

قفس کے علاوہ زنداں کا لفظ بھی ان کے کنارہ کشی کے رجحان کو بے نقاب کرتا ہے ۔

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے   دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ   اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا   موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے   زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں   ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد   ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریٔ زنجیر بھی تھا

غربت کے لفظ میں بھی غالب کے کنارہ کشی کے رجحان کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں ۔

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور   رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر   بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب   تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال   نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

غم غلط کرنے کے لئے بادۂ ناب میں غرق رہنا بھی کنارہ کشی کی علامت ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو   اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے   غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

قتل اور قاتل کے الفاظ بھی غالب کی کنارہ کشی پر روشنی ڈالتے ہیں ۔

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو   لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ   عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ   ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں — عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

پے قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں — یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو کیا غم سر کے کٹنے کا — نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں — شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے — پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے — مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل — میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

کفن کے لفظ کے استعمال سے بھی غالب کی کنارہ کشی ظاہر ہوتی ہے۔

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر — ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

اک خوں چکاں کفن میں کروروں بناؤ ہیں — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

کفن ہی کی طرح لاش کا لفظ بھی غالب کے رجحان کنارہ کشی پر روشنی ڈالتا ہے۔

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں — جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

غالب نے اپنی شاعری میں موت کا لفظ بہت زیادہ استعمال کیا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ زندگی سے اُکتا گئے تھے اور اب موت کی تمنا کر رہے تھے۔

موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ — ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ — کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط — تو ہو اور آپ بصد رنگِ گلستاں ہوتا

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے — وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی — آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ — یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

ہو گئیں غالبؔ بلائیں سب تمام — ایک مرگ ناگہانی اور ہے

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غالبؔ — گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک
غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا — اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے — ہوں شمع کشتہ در خور محفل نہیں رہا

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید — مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

گور کے لفظ میں بھی غالبؔ کی کنارہ کشی کے رجحان کا عکس موجود ہے۔

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں — چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا
ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال — خلد کا اک در ہے میری گور کی جانب کھلا
ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا — نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب عملی طور پر کبھی دنیا سے کنارہ کش نہیں ہوئے۔ بلکہ اہل دنیا سے ان کے تعلقات برقرار رہے۔ دہلی کے امراؤ رؤسا سے ان کے برابر کے تعلقات تھے اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ان کے دوست اور شاگرد موجود تھے۔ جن سے خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ ذہنی طور پر ان کے یہاں دنیا سے کنارہ کشی کا رجحان ملتا ہے۔ دراصل غالب کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز پائے جاتے ہیں۔ اگر غالب نے رات پھولوں کی سیج پر کاٹی ہے تو دن خار زارِ حیات میں گذارا ہے۔ اگر وہ زندگی میں موجِ نسیم سے لطف اندوز ہوئے ہیں تو بادِ سموم کے تھپیڑے بھی برداشت کئے ہیں۔ کبھی مصیبت کی کڑی دھوپ نے ان کو تڑپا دیا ہے اور کبھی آرام کی خنک چھاؤں میں ان کو نیند آگئی ہے۔ مگر چونکہ غالب نے حساس طبیعت پائی تھی اس لئے انھوں نے مسرت کے ایام کو فراموش کر دیا اور غم کے لمحات کو یاد رکھا۔ اسی لئے وہ زندگی میں زیادہ تر ملول و محزون رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذہنی طور پر ان کی شاعری میں دنیا سے کنارہ کشی کا رجحان پایا جاتا ہے۔

کلامِ غالب

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر، جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے۔ تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(ادارہ)

بدو فطرت سے میری طبیعت کو فارسی سے ایک لگاؤ تھا چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی مأخذ مجھے ملے بارے مراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبانِ فارسی کے معلوم کئے اب مجھے اس امر میں نفس مطمئنہ حاصل ہے مگر اجتہاد نہیں ہے بحث کا طریقہ یاد نہیں ہے۔ (غالب)

شمیم کرہانی

غزل

حسن تو حسنِ لامکاں، قید مکاں میں آئے کیوں
تونے جبینِ آرزو، دیر و حرم بنائے کیوں

گریۂ شام ہجر پر، خندۂ طنز کس لئے
شمع اگر نصیب ہو، پھر کوئی دل جلائے کیوں

حُسن فریب کار ہے، حسن کی بات چھوڑیئے
عقل تو سادہ دل نہیں، عقل فریب کھائے کیوں

پردہ و جلوہ دو نہیں، دیدۂ شوق ضد نہ کر
پردہ تو جزوِ حسن ہے، پردہ کوئی اٹھائے کیوں

تجھ سے خفا ہیں نکتہ چیں تونے شمیمؔ نکتہ داں
بارشِ سنگ و خشت میں شیش محل بنائے کیوں

ایکانکی تمثیل
۲۰ منٹ کا کھیل

ڈاکٹر قمر رئیس

مرزا غالب دہلی کالج میں

(صد سالہ برسی کی تقریب پر)

کردار

۱ ۔ غالب :۔ لگ بھگ ۵۵ کا سن ۔ خوبرو ۔ خوش قد ۔ بھری بھری کھچڑی داڑھی ۔ رنگت گہری ۔ خمار آلود ۔ آنکھیں ۔ سفید پاجامہ ۔ سفید انگرکھا ۔ اس پر جامہ وار کا چغہ ۔ سر پر پوستین کی وہی لمبی ٹوپی جو معروف تصویر میں ملتی ہے ۔

۲ ۔ فہیم :۔ بیس بائیس سال کا متین طالب علم مغربی لباس میں ۔

۳ ۔ شاہینہ :۔ اٹھارہ انیس سال کی ہنس مکھ شوخ طالبہ ۔ نئے فیشن کی رنگین ساری میں

۴ ۔ لال کشن چند :۔ ایک بیوپاری اور مل مالک ۔ فربہ اندام ۔ کھدر کے لباس میں ۔

۵ ۔ پھول چند :۔ کشن چند کا سولہ سترہ سالہ لڑکا ۔ قیمتی مغربی لباس میں

۶ ۔ اندھا فقیر :۔ خوش گلو ۔ کاسہ لئے ۔ چیتھڑے پہنے ۔ ضعیف ۔ سفید بال ۔

۷ ۔ فقیر لڑکی :۔ بارہ تیرہ سال کا سن بال اجڑے ہوئے ۔ چیتھڑے پہنے ۔

زرق ۔ برق لباس پہنے دو لڑکیاں ۔ دو نوجوان طالب علم ۔ ٹیڈی لباس میں ۔

ایک موٹر سائیکل ۔

منظر

شاداب سبزہ زار کا ایک گوشہ ۔ ارد گرد چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں رنگ برنگے انگریزی پھول کھلے ہیں ۔ پس منظر میں قدیم طرز کی ایک بوسیدہ سی عمارت کا ایک حصہ نظر آتا ہے ۔ عمارت اور اس شاداب گوشہ کے درمیان ڈیڑھ گز چوڑی ایک روش یا راستہ ہے ۔ پردہ ہٹتا ہے تو مرزا غالب جن کے دائیں بائیں فہیم اور شاہینہ ہیں دائیں جانب سے داخل ہوتے ہیں ۔

فہیم :۔ تو مرزا صاحب! یہ ہے ہمارا کالج ۔ دلی کالج ۔

(مرزا حیران اور پریشان سے ادھر اُدھر دیکھتے ہیں)

شاہینہ :۔ (گھڑی دیکھتے ہوئے) ابھی جلسہ شروع ہونے میں دیر ہے مرزا صاحب۔ سوچا جب تک آپکو اپنا کالج دکھادیں اور کچھ باتیں بھی ہو جائیں۔

غالب :۔ شاہینہ بیگم! میرے حواس بجا نہیں۔ باتیں کیا کروں؟ تم لوگ کہتے ہو۔ یہ دلی کالج ہے۔ کیسی دلی۔ کہاں کا کالج؟ میں نے کبھی کہا تھا کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیجکر سزا دیتے ہیں۔ سو دی جارہی ہے...

شاہینہ :۔ (ہنستے ہوئے۔ شوخی سے) اور بار بار دی جارہی ہے۔ مگر آپ کو مرزا صاحب آپ نے جنت میں کون سے گناہ کر ڈالے۔

غالب :۔ گناہوں کی نہ پوچھو۔ دو چار ہوں تو گناؤں۔

شاہینہ :۔ (ہنستے ہوئے) وہی خدا اور فرشتوں سے تکرار۔ لاکھوں برس کی حوروں سے بیزار اور سب سے بڑا گناہ تو آپ کی وہ تجویز ہوگی جو آپ نے خدا کے حضور رکھی ہوگی ؎

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

غالب :۔ ہاں بی بی! سچ پوچھو تو وہاں دم گھٹتا ہے۔

فہیم :۔ خیر مرزا صاحب! یہ کہیے آپکو ہمارا کالج پسند آیا۔

غالب :۔ میاں! کیا تماشہ ہے؟ یہ اجمیری دروازہ کا علاقہ ہے۔ کہتے ہو دلی کالج ہے۔ کیا یہ وہی کالج ہے جہاں مولانا صہبائی، مولوی مملوک علی اور بھائی رام چندر درس دیتے تھے۔ اور جہاں پیارے لال اور نذیر احمد اور ناظر بنسی دھر کے پوتے شیو نرائن پڑھتے تھے۔

فہیم :۔ مرزا صاحب! وہ کالج تو غدر میں آپ کے سامنے ہی مرحوم ہوگیا تھا۔ یہ نیا دلی کالج ہے جو فرنگیوں سے آزادی پانے کے بعد وجود میں آیا۔

شاہینہ :۔ سنا ہے دلی کالج میں آپ کو بھی نوکری کی پیش کش ہوئی تھی لیکن جب انگریز بہادر آپ کے استقبال کو باہر نہ آئے تو آپ تنک کر ان کی ڈیوڑھی سے لوٹ گئے۔

غالب :۔ تم تو جانتی ہو ہماری بے دماغی۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

(رک کر) مگر بھائی غدر کی تباہی کو یاد کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

فہیم :- مرزا صاحب! آپ کو یاد نہیں۔ غدر میں دلی اور لکھنؤ کی تباہی پر آپ نے خود ہی میاں داد خاں سیاح کو لکھا تھا کہ اس فساد کے بعد وہاں راہیں وسیع ہوں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے۔ رونق بڑھے گی۔ اور جو دیکھے گا۔ وہ داد دے گا۔

غالب :- داد تو میں بھی دے رہا ہوں۔ مگر میرے بھائی سچ یہ ہے کہ دلی کالج کے ذکر سے مجھے تو اپنا زمانہ اور اپنے دوست یاد آ گئے۔ ہائے کیا لوگ تھے! کیا وضع داری تھی!

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے۔؟

شاہینہ :- مرزا صاحب! آپ تو خود ہی اپنے اس سوال کا جواب دے چکے ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

غالب :- (تبسم کے ساتھ مڑ کر دیکھتے ہوئے) ہاں وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔

(اتنے میں پیچھے کی روش پر دو نازک اندام خوش پوش لڑکیاں دو نوجوان لڑکوں کے ساتھ ہنستی ہوئی گذر جاتی ہیں۔ غالب قدرے مڑ کر انہیں گذرتے ہوئے دیکھتے ہیں)

شاہینہ :- (شوخی سے) مرزا صاحب کیا جنت کی حوریں یاد آ رہی ہیں؟

غالب :- (شاہینہ کو دیکھتے ہوئے)

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے، و لے اس قدر آباد نہیں

(شگفتہ رو ہو کر) ہائے اس جہانِ رنگ و بو میں کیسی رونق ہے! کتنی دلبری ہے۔ یہ سبزہ زارِ مطرّا یہ نازنینانِ خود آرا۔ یہ صبر آزما نگاہیں۔ یہ جھومتی گاتی راہیں .... یہ مستی اور آزادی۔ یہ چہچے اور قہقہے ...... سچ مچ یہ دنیا کتنی جوان ہو گئی ہے۔ یہ زندگی کتنی خوب صورت بن گئی ہے۔

(چند لمحوں کے وقفہ کے بعد پیچھے کی روش پر اچانک ایک نوجوان بھاری موٹر سائیکل پر تیز رفتاری سے گذر جاتا ہے۔ اس کے پیچھے خوب صورت لباس میں ایک لڑکی بیٹھی ہے غالب اسے دیکھ کر پہلے جھجکتے ہیں اور پھر اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیتے ہیں پس منظر میں موٹر سائیکل کی آواز آتی رہتی ہے)

غالب :- میاں یہ کیا فتنہ و فساد ہے؟ یہ کون جلاد ہے جو آہنی گھوڑے پر پری زاد کو اڑا لئے جا رہا ہے؟

شاہینہ:۔ (ہنستے ہوئے) مرزا صاحب ع

نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہے

یہ ہمارے کالج کے طلبا ہیں۔

غالب:۔ توبہ! توبہ! اس شور سے میرے کان پھٹے جا رہے ہیں۔

شاہینہ:۔ مگر گستاخی معاف مرزا صاحب! آپ تو بہرے ہیں۔ یاد نہیں آپ نے کہا تھا ع

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات

غالب:۔ وہ تو تمہارے لئے تھا۔ مگر اس قباحت کے شور میں تو کمبخت بہرے بھی دیوانے ہو جائیں گے۔

فہیم:۔ مرزا صاحب! یہ خودکار اور تیز رفتار مشینوں کا صنعتی دور ہے۔ اس میں شور تو ہوگا ہی۔۔۔۔۔

غالب:۔ ہاں میاں!

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

اگر یہ رنگت و نکہت، یہ مطرب و مے میسر ہوں۔ تن من آسودہ ہو تو شور بھی گوارا ہو جائے گا۔

(بائیں جانب سے لالہ کشن چند اپنے لڑکے کے ساتھ داخل ہوتے ہیں)

فہیم:۔ (تعارف کراتے ہوئے) آپ سے ملئے مرزا صاحب! یہ ہیں لالہ کشن چند دلی کے بہت بڑے بیوپاری اور کپڑا مل کے مالک۔ اُردو زبان اور آپ کے کلام پر جان دیتے ہیں۔ آپ کی صد سالہ برسی کی تقریبات منانے کے لئے لالہ جی نے چالیس ہزار روپیہ دیا ہے۔ لالہ جی تعریف سن کر اس طرح خوش ہوتے اور گھگھیا کر مسکراتے ہیں کہ دانت نکل آتے ہیں۔ بڑھ کر غالب سے مصافحہ کرتے ہیں)

غالب:۔ کہئے لالہ جی! کیسا کپڑا بناتے، کتنا کماتے ہیں آپ؟ بھئی دلی والے اسی لئے امیر اور خوش پوشاک نظر آتے ہیں۔

کشن چند:۔ اجی کا پوچھو ہو مرجا صاحب! سب اوپر والے کی کرپا ہے۔ مہینا ماں یہی کوئی دس پندرہ لاکھ روپیہ کا کپڑا اتر جات ہے۔ آپ کی دیا ہے۔

غالب:۔ (حیرت سے) دس پندرہ لاکھ (ٹھہر کر) مگر لالہ جی یہ جو آپ بول رہے ہیں یہ دلی کی زبان تو نہیں!

کشن چند:۔ ہاں مرجا صاحب! اس بیوپار میں تو جبان کا ستیاناس ہو گیا آپکی دیا ہے۔ اور پھر ہم پڑھے لکھے بھی ناہیں۔ یہ میرا لڑکا ہے پھول چند ۔۔ یہ آپکا گر ہے اور آم والا محاکیہ سناتا ہے۔ اور آپکی کوتیا بھی گاتا ہے۔ آپ کی دیا ہے۔

(غالب سراپا حیرت لڑکے کی طرف دیکھتے ہیں)

پھول چند :۔ مرزا صاحب! وہ جو ثریا نے آپ کی گزل گائی ہے ؎

یہ نہ تھی ہماری کسمت کہ بصال یار ہوتا

اگر اور جیتے رہتے ۔ یہی انتجار ہوتا

بڑی سندر کویتا ہے ۔ پرنتو اس کا ارتھ سمجھ میں نہیں آیا ۔ یہ بصال یار کس وستو کو کہتے ہیں ؟

(غالب بہت بے مزہ اور برہم ہو کر لالہ جی اور لڑکے کی طرف دیکھتے ہیں ۔ اتنے میں باہر سے مجمع کی آواز ابھرتی ہے لوگ نعرے لگا رہے ہیں)

کشن چند ۔ مردہ باد

اپنی مانگیں ۔ لے کے رہیں گے

مہنگائی بھتہ ۔ دینا ہوگا

روٹی کپڑا ۔ حق ہے اپنا

غالب :۔ یہ کون لوگ ہیں ؟

فہیم :۔ یہ لالہ جی کے کارخانے کے مزدور ہیں ۔

کشن چند :۔ یہ تیارے یہاں بھی آمرے ۔ اچھا مرزا صاحب! ہمیں آگیا دیجیے ۔ کل کے جلسے میں بھینٹ ہوگی آپ کی دیا سے ۔

غالب :۔ یہ مزدور کیا چاہتے ہیں؟ یہ سب کیا ہے ؟

شائستہ :۔ یہ جینا چاہتے ہیں مرزا صاحب! انھیں روٹی کپڑا چاہیئے ۔

غالب مگر یہ تو با روزگار ہیں ۔ کارخانے میں کپڑا پیدا کرتے ہیں ۔

فہیم جی ہاں! مگر وہ کپڑا اور اس کا منافع ان کے لیئے نہیں ہے ۔

غالب (چہرہ پر کرب انگیز فکر) تو یہ بھوکے ہیں ۔ ننگے ہیں ۔ بدحال اور بدنصیب انسان!!

(خلا میں گھورتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں)

سوچتا تھا اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے ، نہ سہی ۔ جس شہر میں ، میں رہوں اس شہر میں تو کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے .... اس بھوک ، اس عریانی اور بے سروسامانی سے کب ملے گی نجات انسان کو؟ کب اس کے دکھ دور ہوں گے ۔ کب اس کا مقدر پھرے گا ۔ ایک صدی بیت گئی اور وہی عذاب اب تک جاری ہے ۔ پھر یہ ظاہری چمک دمک کیوں ؟ یہ رونق ، یہ رنگینی ، یہ ترقی کیسی ؟ یہ شداد کی جنت

یہ نمرود کی خدائی! یاالہٰی!! میں یہاں کیوں آیا؟

(ایک اندھا فقیر کاسہ لئے اور بارہ تیرہ سال کی ایک نیم عریاں لڑکی کا شانہ پکڑتے غالب کی مندرجہ ذیل غزل گاتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ تینوں خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں)

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

لڑکی :۔ بابا! ہم بھوکے ہیں۔ کوئی کھانا کھلوا دو!

فقیر :۔ مرزا نوشہ کے صدقہ میں کوئی کپڑا دے دو بابا۔

غالب :۔ چہرے پر اذیت اور حیرت) تم کون ہو بابا۔ کہاں رہتے ہو؟

فقیر :۔ (درد بھرے لہجہ) ہم بھی انسان تھے۔ اہلِ زبان تھے۔ اب لوگ گدا کہتے ہیں۔ .... — ...
(سرد آہ بھر کر) گلی قاسم جان میں ہماری چھوٹی سی حویلی تھی۔ اب کھلے آسمان کے نیچے بسیرا کرتے ہیں۔ ہم ہر جگہ رہتے ہیں۔ لیکن اب ہمارا گھر کوئی نہیں۔

شاہینہ :۔ یہ کس کی غزل گا رہے تھے بابا!

فقیر :۔ مرزا نوشہ کی ...... (یاد کرتے ہوئے) ہمارے ابا حضور نے جوانی میں ان کو دیکھا تھا۔ مشاعروں میں ان کا کلام بھی سنا تھا۔ سچ کہتے تھے مرحوم، اب اُردو زبان میں اس پایہ کا شاعر پیدا نہ ہوگا۔

لڑکی :۔ (فقیر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے برہمی سے) بابا آگے بڑھو۔ یہاں کچھ ملنے والا نہیں۔
(غالب کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھتے اور اپنا چغہ اتار کر فقیر کے شانوں پر ڈال دیتے ہیں اور پھر سر جھکائے آہستہ آہستہ بائیں طرف بڑھنے لگتے ہیں)

فہیم اور شاہینہ :۔ (ایک آواز) مرزا صاحب کہاں جا رہے ہیں؟

فہیم :۔ ابھی ہمارا جلسہ ہوگا۔

شاہینہ:۔ آپ کا صد سالہ جشن منایا جائے گا۔

(غالب چند قدم چل کر رکتے اور مڑ کر دیکھتے ہیں)

غالب:۔ (فقیر کی طرف اشارہ کر کے) یہ میری زندگی کا آخری جشن تھا (رک کر) وہ ——— میری موت کا جلوس ہوگا۔

(بائیں طرف سے غالب اور دائیں طرف سے فقیر نکل جاتے ہیں فہیم اور شاہینہ دکھ اور حسرت سے غالب کو جاتا ہوا دیکھتے رہتے ہیں)

(پردہ)

غالب کے ایک خط کا اقتباس

"کیا دل لیکر آئے۔ کیا زبان لے کر آئے۔ کیا علم لے کر آئے۔ کیا عقل لے کر آئے اور پھر کسی روش کو برت نہ سکے۔ کسی شیوہ کی داد نہ پائی۔ گویا نظیر تمہاری زبان سے کہتا ہے۔

جوہر بنیش من در تہ زنگار بماند   آنکہ آئینہ من ساخت نہ پرداخت دریغ

بھائی اس معرض میں، میں بھی تیرا ہم طالع اور ہمدرد ہوں۔ اگرچہ یک فنہ ہوں، مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازہ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا۔ آپ ہی سمجھا، قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں، بقدر ہزار ایک، ظہور میں نہ آئے نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ چل دوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دست گاہ کہ عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔

نہ بستاں سرائے نہ میخانہ   نہ دستان سرائے، نہ جانانہ

نہ رقص پری پیکراں بر بساط   نہ غوغائے رامشگران در رباط

خدا کا مقصود، خالق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار فقیر، نکبت میں گرفتار تمہارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کا نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعہ کربلا ئے نسبت نہیں دے سکتا لیکن واللہ تمہارا حال اس ریگستان میں بعینہ ایسا ہے جیسا مسلم بن عقیل کا حال کوفہ میں تھا۔ تمہارے اور تمہارے بچوں کی جان و آبرو کا نگہبان"

غلام احمد فرقت

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب

قبلِ شادی ہر ایک تھا ساتھی
اب بفاقی رہے نہ شبراتی
آٹھ بچے ہیں اور دس ناتی
اب کدھر جائیں پیٹنے چھاتی
کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

شب ہی کرتے تھے جو غٹرغوں غوں
اور مچاتے تھے شب میں گگڑ وکوں
چوکڑی بھول کر ہوئے مجنوں
خیریت پوچھنے پہ اوسے یوں
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ایک خانہ خراب طاعت و زہد
بولے کہیے جناب طاعت و زہد
چکھ کے دیکھی شراب طاعت و زہد
میں یہ بولا یہ بابِ طاعت و زہد
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اب تو ہر سانس ایک اک من ہے
کاٹنا عمر کا بھی اک فن ہے
دم کے پیچھے لگا نیا تن ہے
قرض خواہوں کی ایک ان بن ہے
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

خلد میں منہ نہ پاؤ گے غالب
کس کو پھر منہ لگاؤ گے غالب
سخت بلوا مچاؤ گے غالب
حق کو کیا منہ دکھاؤ گے غالب
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

جاوید وشسٹ

غالب کی حیات وشاعری کا جنسی پہلو

"غالب عشق" کے پیرو کی حیات وشاعری کے جنسی پہلو پر روشنی ڈالنے سے قبل ہم غالب کے چند نقادوں کی وہ گراں قدر رائیں پیش کرتے ہیں جو خاص طور پر غالب کے عشق وعاشقی سے متعلق دی گئی ہیں۔ تاکہ جنسی جبلت احساس کے خاص واردات اور واقعات کے آئینے میں حیات غالب کی کچھ پرچھائیاں ابھر آئیں اور مرزا کی سیرت کے بعض گوشے بھی نمایاں ہو جائیں۔

(۱) عشق ایک شدید ترین احساس کا نام ہے۔ بنیادی طور پر یا مرکزی طور پر تو اس کا مخزن یا تعلق جنسیات یا شہوانیات میں ملے گا۔ اور یہاں سے ابھر کر جذبات اور نفسیات کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا تمام قوائے انسانی اور تمام شخصیت میں یہ احساس یا یہ جنسی تحریک بھر جاتی ہے اور شش جہت سے انسان پر چھا جاتی ہے۔ بات تو صرف اتنی ہے جو حالی نے کہی بھی ہے ؎

عشق کہتے ہیں جسے سب وہ یہی ہے شاید — خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

(۲) غالب آگرے میں ۸ رجب ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد ان کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں نے جو مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے صوبیدار تھے، انہیں لاڈ، پیار اور چاؤ سے پالا۔ بچپن کھیل کود میں گزرا اور جوانی رنگ رلیوں میں۔ (۳) اس لئے "رفت گیا اور بود تھا" سے آگے تعلیم کا سلسلہ نہ چل سکا۔ شاہد محمد معظم سے بیعت کی، لیکن یہ ایک طرح کی رسم پرستی تھی۔ جب تک رگوں میں جوانی کا گرم خون دوڑتا رہا، ان پر مذہب کا رنگ نہ چڑھا اور بابر کی طرح داد عیش وعشرت دل کھول کر دی۔ خود فرماتے ہیں:-

(۱) اردو کی عشقیہ شاعری (فراق گورکھپوری) صلا

---

(۲) مضمون "غالب خطوط کے آئینے میں" از ڈاکٹر شوکت سبزواری (احوال ونقد غالب مرتبہ پروفیسر محمد حیات خاں سیال صفحہ ۹۶)، (۳) "مرزا کے نانا کی آگرے میں ایک خاصی سرکار تھی جس کی بدولت ان کے ملازم اور متوسلین دس دس بارہ بارہ ہزار کے مالگزار بن گئے تھے اور مرزا کا بچپن اور عنفوان شباب بڑے اللّے اور تللّے میں بسر ہوا تھا" (یادگار غالب، حالی صلا)

"جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے، جب کبھی مجھ کو اپنا وہ رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ پھر جاتا ہے۔ جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔"

بہتر برس کی عمر میں دنیا چھوڑ دی (۱۲۸۵ھ) میں اپنا یہ شعر زبان حال سے پڑھتے ہوئے سدھارے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

(۴) غالب کے واقعات زندگی اور ان کے کلام پر غور کرنے سے ایک بات نمایاں ہو جاتی ہے کہ انہیں دنیا کی اچھی چیزوں سے بے حد محبت تھی اور "نسوانی حسن" ان اچھی چیزوں میں شاید سب سے زیادہ عزیز تھا ؎

اسدؔ بہارِ تماشائے گلستانِ حیات — وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

غالب کی جوانی جس طرح حسن پرستی میں بسر ہوئی ہے اس کا اندازہ کئی شہادتوں سے ہو سکتا ہے۔ نواب عظیم الدولہ نے ان کی نسبت لکھا تھا، "در خاطر متمکن غمہائے عشق مجاز، تربیت یافتۂ شمکدۂ نیاز۔" غالب خود اپنی جوانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

ہر جلوہ راز من بتقاضائے دلبری — از غنچہ بود محمل نازے بہ رہ گزار
ہم سینہ از بلائے جفا پیشہ دلبران — فرہنگ کاروانئے بیداد روزگار
ہم دیدہ از ادائے مغان شیوہ شاہدان — فہرست روزنامۂ اندوہ انتظار
شوقم جریدۂ رقم آرزوئے جوش — ذوقم قلمرو ہوس مژدۂ کنار

ہموارہ ذوق مستی و لہو و سرود و سوز
پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار

ان اشعار کے علاوہ اُردو میں غالب کی ایک نہایت موثر غزل ہے جس کی نسبت یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ محبوبہ کا نوحہ ہے۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے — کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

غالب کا یہ دستہ تمام کا تمام بڑے غور و فکر کا مستحق ہے لیکن، خدا ایسے جب جن میں کسی خاص شعری [illegible]

---

(۴) غالب کی عشقیہ شاعری از ڈاکٹر ایس ایم۔ اکرام (احوال و نقد غالب مرتبہ پروفیسر سیدان صفحہ ۱۹۲)

معلوم ہوتا ہے۔۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ — تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال — دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں — ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

پہلا مقطع جسے غالب نے اشاعت کے وقت حذف کر دیا، بہت پُرمعنی ہے ؎

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسد
میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

یہ نوحہ غالب نے بیس، بائیس برس کی عمر میں اس زمانے میں لکھا تھا جب وہ ابھی اسد تخلص کرتے تھے۔ جس محبوبہ کا اس میں ذکر ہے اسے غالب سے (اور غالب کو اس سے بڑی) محبت تھی، اور شاید مرزا کی اتنی گہری وابستگی پھر کسی سے نہیں ہوئی۔ اس واقعے کے چالیس بیالیس برس بعد مرزا ایک خط میں مرزا حاتم علی مہر کی معشوقہ کی تعزیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا اُن دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے باآنکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا۔ اس فن میں بیگانۂ محض ہو گیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔"

مظفر حسین خاں کی محبوبہ کی وفات پر ایک فارسی خط میں بھی آپ بیتی بیان ہوئی ہے۔

غالب کی اس معشوقہ کی وفات کے بعد کسی گہری اور پائدار محبت کے نشان ان کی زندگی میں نہیں ملتے لیکن مخلوقاتِ قدرت میں حسن ڈھونڈنے کی جو خواہش شاعر کے دل میں ازل سے رکھی ہوئی تھی وہ تمام عمر ساتھ رہی چنانچہ مرزا نے جو فارسی مثنوی "بنارس" کے متعلق لکھی ہے اس میں اپنی "جنت نگاہ" کا نقشہ کھینچا ہے۔ بتانِ بنارس کی نسبت لکھتے ہیں۔

میانہا نازک و دلہا توانا — ز نادانی بکارِ خویش دانا
تبسم بسکہ در لبہا طبیعی است — دہنہا رشکِ گلہائے ربیعی است
ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار — خرامے صد قیامت فتنہ دربار
قیامت قامتاں مژگاں درازاں — ز مژگاں بر صفِ دل نیزہ بازاں

اسی زمانے میں انھوں نے ایک بڑی عمدہ غزل اردو میں لکھی جس میں اتنی حسین وجمیل امنگوں کی ایک دلآویز تصویر پیش کی ہے ؎

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس — زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
ایک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری غالب کے نظریۂ عشق کی نسبت لکھتے ہیں:-

"گو مرزا غالب کی معشوقہ ایک عارضی (ارضی) عورت ہے ان کا عشق ہوس سفلہ، لذات حرصیہ سے پاک ہے۔ ہوس سفلہ کیا ہے؟ جب روح گیرائی اور تجنس کی جانب مائل ہوتی ہے تو یہ ہوس پیدا ہوتی ہے، ہوس مطلوب کو اپنے پر شہوت ہاتھوں سے ملوث کرنا چاہتی ہے۔"؟

ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے کی تائید میں غالب کا ایک شعر بھی نقل نہیں کیا۔ ڈاکٹر اکرام کا خیال ہے کہ ڈاکٹر بجنوری کی یہ رائے مرزا کی شخصی نقطۂ نظر کی عین ضد ہے جس خواہش گیرائی کو بجنوری ہوس سفلہ کہتے ہیں۔ غالب اس سے بیگانہ تھے۔

غالب نے اپنی جوانی کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں ایک شعر ہے ؎

شوقم جریدہ رقم آرزوے بوس — ذوقم تکلم و ہوس مژدۂ کنار

بنارس کے متعلق جو مثنوی لکھی ہے اس میں اس "خواہش گیرائی" کا اظہار بہت صاف ہے ؎

زرنگینی جلوہ با غارت گر ہوش — بہار بستر و نوروز آغوش
بہ تن سرمایۂ افزائش دل — سراپا مژدۂ آسائش دل

اس میں نقطۂ چشم و دل وجاں کی ضیافت کی خواہش نہیں بلکہ "تن" کا بھی خیال ہے ؎

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں — جس کے بازو پہ تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

"ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

تکلف برطرف، لب تشنۂ بوس و کنارستم — در ایام بہاریں، دم نوازش ہائے پنہاں را

اور اس طرح کے اشعار کئی ہیں، ایسے ہوتے ہوئے غالب کے بارے میں تصور عشق کے بارے میں ڈاکٹر بجنوری کی رائے قبول کرنا مشکل ہے جس ہوس گیرائی کی انھوں نے مذمت کی ہے وہ مرزا کے نزدیک شاید محبت کا لازمی جزو تھا۔

در حقیقت یہ ہے کہ بعض خیال پرست حضرات، جیسا کہ "عاشق حسن حقیقی" کے مداح ہیں اور جیسے ڈاکٹر بجنوری نے غالب کے نظریۂ محبت کی خصوصیت خیال کیا ہے، وہ غالب کی فہم سے بالاتر یا فروتر تھی۔ وہ معنوی

جذبہ بالعموم ان شعرا کا خاصہ ہے جو "ترک شیرازی" کے فدائی ہیں۔ جو ایسی شراب سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں جو نہ خود پی سکتے ہیں اور نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں۔ ؏

لہ جب کوئی شخص اپنے ذہن کو خارجی دنیا سے مطابق کرنے میں ناکام ہوتا ہے تو وہ دو باتوں میں سے کوئی ایک بات اختیار کر لیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ مخبوط الحواس نہ بن جائے بلکہ تسکین حاصل کرنے اور اپنی پریشان روح کو آرام پہنچانے کا آرزومند ہو۔ وہ یا تو بے تحاشا یا چپکے چپکے اپنے آپ کو ایسی ہستی کی آغوش میں دے دیتا ہے جو اس کی آتش محبت کو بھڑکائے اور خود بھی اس کی آگ میں جلنے لگے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے محبوب کے سوا دنیا میں کوئی چیز اس کی دلچسپیوں کا مرکز نہیں بن سکتی۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو وہ دنیا کی ہر چیز سے منہ پھیر لیتا ہے اور ایک خود ساختہ زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ ...... اس طرح بعض لوگ اپنی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ محبت کی بارگاہ میں اپنی زندگی کے تمام مصائب کو بھلا دیتے ہیں۔

غالب کو یہ تسکین کبھی نصیب نہ ہوئی۔ شباب کے عالم میں اس کو ایک عورت سے لگاؤ ضرور پیدا ہوا جو شاہد بازاری تھی۔ لیکن یہ لگاؤ بھی "وحشت کا رنگ" پکڑنے نہ پایا تھا کہ وہ اس جہاں سے رخصت ہو گئی اور غالب نے غزل کی صورت میں دلی کا درد انگیز مرثیہ لکھا۔ یہ سانحہ اس وقت پیش آیا جب کہ غالب کی منکوحہ بیوی موجود تھیں اور ان کی شادی کو کوئی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا ؎

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ	رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

اس کے کئی سال بعد مرزا نے یہ اشعار کہے ؎

وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب	وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر	طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

ان سے کسی اور جرأت دل کی بو آتی ہے سفر کلکتہ سے کئی سال قبل جو غزل لکھی گئی وہ بھی کچھ معنی اپنے اندر ضرور

ص۵۰ افلاطون نے یہ شگوفہ چھوڑا کہ محبت میں جنسی اشتہائی یا نفسانی خواہشات یا محرکات کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ اسلامی فلسفہ بھی افلاطون کے اس نظریہ کا اثر پذیر ہوا اور ناکامی اور محرومی اور نامردوں کی "پاک محبت" شاعری میں تبرک ہو کر رہ گئی۔ خواجہ درد کہتے ہیں ؎

درد کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانا	اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

اصل بات کچھ یوں ہے بقول جرأت ؎

جیسے یہ سنتے ہیں وہ ہمسایہ میں ہیں آئے ہوئے ۔۔ کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے "ار دو کی منتخبہ شاعری۔ فراق گورکھپوری

ص۵۰ غالب کی شاعری ڈاکٹر سید عبداللطیف (افروزی تنقید غالب ۳۳)

رکھتی ہے۔ بشرطیکہ وہ صرف ذہنی عشق کا نتیجہ نہ ہو ۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

بہرحال عشق و محبت کی پہلی سرگزشت کے بعد بھی مرزا نے شاعرانہ طبع آزمائی کی۔ بلکہ وفات کے چند ہی سال پہلے ساٹھ سال کی عمر میں یہ شعر کہے ہیں، ملاحظہ ہوں ۔

شب وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجب آرام جان و تن تکیہ

بنا ہے تختۂ گل ہائے یاسمیں بستر
ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ

فروغ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام
جو رخت خواب ہے پروین تو ہے پرن تکیہ

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا
رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن تکیہ

اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شکر
اٹھا سکا نہ نزاکت سے گل بدن تکیہ

ظاہر ہے ان اشعار میں شاہدانہ محبت، حقیقی اور جیتے جاگتے جذبات عشق سے ہے اور یہ صرف ذہنی عشق کا نتیجہ ہیں ۔

مرزا کی غزلوں میں جلوہ گر محبوب، ایک رسمی معشوق بلکہ ناقابل ذکر شاہد بازاری ہے ۔

بغل میں غیر کی آپ آج سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

شب کو کسی کے خواب میں آیا ہے وہ کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت سیمیں بدن کے پاؤں

میں نے کہا کہ بزم ناز غیر سے چاہیے تہی
سن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

در پردہ انہیں غیر سے ہے ربط نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

ڈاکٹر سید عبداللطیف اس نتیجے پر پہنچے ہیں :۔

" اس سے سرسری طور پر غالب کی اس محبت کا تصور ہو سکتا ہے (تاوقتیکہ اس کے خلاف ہمیں کوئی شہادت دستیاب نہ ہو) جو اس کی ذہنی گلگشت اور سچ مچ مادی معاملات میں ظاہر ہوتی رہی۔ اس کی محبت صاف طور پر مادی قسم کی ہے اور اس میں کوئی روحانیت

نہیں پائی جاتی۔ ایسی محبت جو پژمردگی کے عالم میں جان پیدا کرتی اور مکروہات زندگی کو دل سے محو کر دیتی ہے۔ غالب کے کل دیوان میں اس کے کوئی نشان نہیں ملتے ....

یہ ہے کہانی ہمارے شاعر کی۔ اس نے ایک منتشر زاویۂ نگاہ کے سائے میں منتشر زندگی بسر کی اور ہمارے لیے ایسی شاعری چھوڑی جو خود ہم آہنگی سے معرا ہے۔ اس کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں ہو سکتا۔"

ڈاکٹر عندلیب شادانی کا زاویۂ نگاہ ایک نئے گوشے کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ وہ اپنی "تحقیقات" کے آغاز میں سب سے پہلے اس امر کی تحقیق کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ مرزا غالب کا محبوب مرد ہے یا عورت[۱]؟ اس کی صفت کے تعین میں ہمیں مندرجہ ذیل اشعار سے مدد مل سکتی ہے۔

سبزہ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا — یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست — دود شمع کشتہ تھا شاید خط رخسار دوست

ہے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یا رب — آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

مرزا نے صاف صاف بتا دیا ہے کہ ان کا محبوب کوئی سبزہ رنگ ہے۔ چونکہ ڈاڑھی مردوں ہی کے ہوتی ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ وہ مرد ہے۔ اس کے علاوہ بازاروں میں پھرتا ہے، بازاروں ہی میں لوگوں سے پرسش احوال بھی کرتا ہے۔ مردانہ محفلوں میں شریک ہوتا ہے۔ نظر بازیاں کرتا ہے۔ شراب پیتا ہے اور بہت پیتا ہے۔ ان تمام باتوں سے بھی صاف ظاہر ہے کہ وہ مرد ہی ہے کیونکہ مرزا غالب کے زمانے میں یہ سب باتیں عورتوں کے لئے ممنوع اور ناممکن تھیں۔ البتہ بازاری عورتیں اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ سب اشعار ایک ہی محبوب کی شان میں نہیں کہے گئے ہیں بلکہ مختلف اشخاص سے متعلق ہیں تو ماننا پڑے گا کہ مرزا کے بعض محبوب امرد تھے اور بعض خواتین۔ اور شاید یہی قیاس زیادہ صحیح ہے کیونکہ خود مرزا کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ؎

اسد اللہ خاں تمام ہوا — اے دریغا وہ رند شاہد باز

مرزا کے محبوب کس طبقے کے لوگ تھے۔ آئیے اب ذرا ان کے اخلاق و صفات پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ وہ

کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب — یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

۱؎ ایران کی امرد پرستی کا اثر اردو شاعری پر "تحقیقات" ڈاکٹر عندلیب شادانی ص ۱۹۲

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے　　تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

سن اے غارت گر جنس وفا سن　　شکست قیمت دل کی صدا کیا

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے　　غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی

گالی گلوچ، تو تڑاق اس کا شیوہ ہے۔ بیوفا اور ستمگر ہے۔ بے سبب آزار دیتا ہے۔ بے وجہ رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ عاشق سے دشمنی کرتا ہے بدخو اور عربدہ جو ہے۔

مرزا کی زبانی ان کے محبوب کی چند صفات اور بھی سن لیجئے ؎

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا کہ دیکھئے　　سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظ نگاہ　　جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو یہ خو کہیں　　دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا　　آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

در پردہ اسے غیروں سے تعلق ہے۔ غیر کی محفل میں بیٹھ کر شراب پیتا ہے۔ غیر کو بوسہ بھی دیتا ہے۔ کبھی کبھی رات کو بھی غیر کے ساتھ رہتا ہے۔ مگر مرزا بیچارے کو بوسہ نہیں دیتا، اور دل چھین لینے کی فکر میں ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ کبھی بغیر مانگے ہی بوسہ دے دیتا ہے کبھی مرزا کے یہاں آ بھی جاتا ہے اگرچہ دیر سے پہنچتا ہے کیونکہ ایک بے غیرت (رقیب) سد راہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی رات کو مرزا کے یہاں بھی رہ جاتا ہے اگرچہ مرزا کو دھڑکا ہی لگا رہتا ہے کہ کہیں رقیب روسیاہ نہ آ جائے۔ اور سارا بنا بنایا کھیل نہ بگڑ جائے۔

مرزا کے ساتھ اس ہرجائی (بدچلن، آوارہ گرد) معشوق نے جو سلوک کئے وہ بھی سننے کے قابل ہیں ؎

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر　　عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں　　غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وہ یہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا　　جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے　　کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی — آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ — اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

مرزا نے معاملہ بندی کے جو نمونے پیش کئے ہیں وہ درج ذیل ہیں قارئین خود فیصلہ کرلیں کہ یہ خیالات کس پایہ کے ہیں اور ان کے مصنف کو عشقیہ شاعری کی دنیا میں کون سا درجہ ملنا چاہیئے ؂

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا — ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں — رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن سے پاؤں

اسداللہ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے — کہا جو اس نے زرا میرے پاؤں داب تو دے

ڈاکٹر عندلیب شادانی اس بحث کا اختتام کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مرزا کی عشقیہ شاعری کے جو نمونے ہم نے پیش کئے ہیں۔ انہیں انصاف کی نظر سے دیکھنے کے بعد غالباً ہر شخص ہماری رائے سے اتفاق کرے گا کہ اس قسم کا کلام خواہ وہ مرزا کا ہو یا کسی دوسرے شاعر کا اردو زبان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ جن واقعات و حالات کا ان میں ذکر ہے انہیں دنیائے محبت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ البتہ بدذوقی، بے حسی، بے غیرتی، اور نا نجیبی کا مظاہرہ اچھی طرح کیا گیا ہے۔ کیا انہیں اشعار کے مصنف کو ہمیں اپنی زبان کی عشقیہ شاعری کا بہترین استاد تسلیم کرلینا چاہیئے اور کیا عرق خجالت میں غرق ہوئے بغیر ہم اس قسم کے اشعار اردو کی شاعری کے نمونہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرسکتے ہیں؟ . . . . کیا اچھا ہوتا کہ یا تو مرزا غالب عشقیہ شاعری کو ہاتھ ہی نہ لگاتے یا پھر جب اس مضمون کو چھیڑا تھا تو تعالی سے گریز کرتے اور صرف ان واقعات کو اپنے اشعار کا موضوع بناتے جو انہیں اپنی "حیات معاشقہ" میں پیش آئے تھے بشرطیکہ انہیں صحیح معنی میں کبھی عشق و عاشقی سے سروکار رہا ہو کیونکہ امرد پرستی کو عشق و محبت کے نام سے پکارنا اس شریف جذبہ کی انتہائی توہین کرنا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ اردو کے حامی اس قسم کا کلام جس قدر بھی دستیاب ہو سکے جمع کر کے ایک بار رفنا کردیں۔ تاکہ اردو کا دامن اس مستقل داغ معصیت سے ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے۔

ہم نے اب تک غالبؔ کی حیات و شاعری کے جنسی پہلو کی بحث کا پس منظر ڈاکٹر شوکت سبزواری ڈاکٹر ایس۔ ایم اکرام، ڈاکٹر سید عبداللطیف اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کی بحثوں کے طویل اقتباسات کو ترتیب دیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت غالبؔ کو بابر کی طرح، بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست، کا قائل اور پیرو قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اکرام غالبؔ کو "نسوانی حسن" کا رسیا بتاتے ہیں اور ستم پیشہ ڈومنی، کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالبؔ کے یہاں لذت چشم، دل وجاں کے ساتھ ساتھ "لذت تن" کا بھی بھرپور احساس ہے

اور ڈاکٹر عندلیب شادانی انکو امرد پرست قرار دیتے ہیں۔ ہر محقق کے نظریے میں جنس یا جنسی جبلت قدر مشترک ہے۔ ڈاکٹر عندلیب نے اپنی "تحقیقات" میں میر تقی میر اور غالب کی امرد پرستی پر بڑی لے دے کی ہے اور امرد پرستی کو اردو شاعری کے دامن پر ایک بدنما داغ قرار دیا ہے اور اس طرح انھوں نے اپنا سارا غصہ شاعروں پر اتارا ہے حالانکہ اگر دامن کسی کا آلودہ ہے تو وہ معاشرے کا ہے، وہ سماج کا ہے۔ وہ اس زندگی اور ماحول کا ہے جس میں شاعر یا ادیب سانس لے رہا ہے بلکہ جی رہا ہے اگر کسی شاعر نے کسی امرد سے عشق کیا ہے اور اپنے جذبات کا اظہار بھی کیا ہے تو وہ نہ صرف بے گناہ ہے بلکہ دیانتداری بھی۔ ڈاکٹر اکرام اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ غالب کے فلسفۂ محبت میں لاکھ عیب سہی لیکن وہ "ترک شیرازی" کی غلامی سے ضرور آزاد تھا۔ غالب "ترک شیرازی" پرست نہ تھا اور ہوس (PASSION) اور محبت (LOVE) میں وہ بین امتیاز کرتا تھا ۸ لیکن اس کی مستی "شراب طہور" کی وجہ سے بھی نہ تھی۔ مرزا کے بعض بیانات سے خیال ہو سکتا ہے کہ انہیں عشق میں ایک رند سمجھنا چاہیے "عاشق صادق" نہیں۔ انھوں نے ایک اردو خط میں لکھا ہے:

۹ "ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی ہم کو زہد و ورع منظور نہیں اور ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رکھو کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو! سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ! اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنّا جان نہ سہی منّا جان سہی"۔

۱۰ اگرچہ اخلاقیات نے کبھی "امرد پرستی" پر صاد نہیں کیا، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشرے میں اسے کچھ برا بھی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ یہ ایک فیشن کی طرح مروج تھی۔ ہم اس معاشرے کو اگر خانقاہی معاشرہ کہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ اخلاقی اور روحانی قدریں جو معاشرے میں مستعمل تھیں سب خانقاہوں سے ماخوذ تھیں۔ خانقاہ عوام کا ایک ایسا ادارہ تھا بیہاں عوام بلا امتیاز مذہب و ملت جمع ہو سکتے تھے۔ صوفیائے کرام کے اقوال پر سر دھنتے تھے۔ جہاں "دنیا ہیچ و ہمہ کار دنیا ہیچ" کے ساتھ ساتھ تلقین عشق کی جاتی تھی۔ حسن (حسن مطلق) کے چرچے رہتے

---

۸ بر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی
فروغ شعلۂ خس یک نفس ہے — ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

۹ غالب نامہ ص ۲۹۴

۱۰ "جنسی جبلت اور شاعری" (جاوید وششٹ، جواد بھاٹا، مئی ۱۹۶۴ء)

تھے عوام بقدر ہمت "حسن و عشق" کا مفہوم سمجھنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ غرض جنسی جبلت کا دبا ہوا طوفان ایک طرف تو ارتفاعی عمل کے ذریعے محبوب حقیقی تک پہنچا۔ اس عمل میں بیشتر صوفیائے کرام نے ہی حصہ لیا، تو دوسری طرف یہ جنسی جنون کی صورت اختیار کر بیٹھا۔ جنسی بے راہ روی نے امرد بازی کا روپ دھار لیا۔ شبلی نعمانی نے "شعر العجم" میں اس بدعت کا ذکر کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ امرد پرستی فارس سے ہندوستان آئی۔ وہاں پردے کی سختی کی وجہ سے امرد کو زنانہ لباس پہنا کر ساقی بنایا جاتا تھا اور بعد میں نشے کی حالت میں وہی ساقی جنسی آسودگی کا ذریعہ بن جاتا تھا۔ لیکن اس کا آغاز یونان قدیم سے ہوا۔ وہاں کے دیوتا بھی امرد پرست معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اہل یونان کے نزدیک حسن کا "آئیڈیل" "مرد" تھا، عورت نہیں۔ ہندوستان میں اس کے برعکس حسن کا "آئیڈیل" "عورت" ہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ہندوستانی لٹریچر میں کہیں امرد پرستی کا ذکر نہیں ملتا۔ یونان سے ایران ہو کر فارسی شاعری کے ذریعے یہ بدعت اُردو شاعری تک پہنچی۔ محبوب کے لئے صیغہ مذکر استعمال کرنا غزل کی تہذیب میں داخل ہو گیا۔

صلا "عشق اور عشقیہ شاعری دونوں سماج اور سماجی کلچر یا سماجی معیاروں اور روایتوں کی پیداوار ہیں۔ ہمارے جسم، ہماری روحیں جیسے رس میں پکائی جائیں گی جیسا قوام ہمارے جذبات و احساسات کے لئے ہمارا کلچر صدیوں میں تیار کرتا ہے ویسا ہی ہمارا عشق ہوتا ہے اور ویسی ہی ہوتی ہے ہماری عشقیہ شاعری۔ ہم اپنی آنکھوں سے معشوق کو نہیں دیکھتے، اپنے حواس لامسہ سے اس کے جسم کی نرمی و گداز کا احساس نہیں کرتے، اپنے کانوں سے اس کی آواز نہیں سنتے، اپنے مشام سے اس کے بالوں کی خوشبو نہیں سونگھتے بلکہ جس کلچر کو ہم قبول کر لیتے ہیں اس کلچر کی آنکھوں، ہاتھوں، کانوں اور ناک سے یہ سب کرتے ہیں۔ ہماری انفرادیت خود اس کلچر کی پیداوار ہے۔ ہر کلچر احساس کائنات، جس میں احساس حسن شامل ہے، کے لئے خفیہ زبان پیدا کر لیتا ہے۔ سماج جنسیات کی پیداوار ہے اور جنسیات سماج کی۔ اسی آب و ہوا میں ہماری انفرادیت، محبت اور شاعری میں اپنے خال و خط اجاگر کرتی ہے۔"

صلا "غزل میں ہمارے شعور کا ارتکاز، نفس جنسیت اور نفس محبت پر شدت سے ہوتا ہے۔ ہم اس وقت عاشق محض ہوتے ہیں نہ کہ کسی مرد یا عورت کے عاشق اور ہمارا محبوب، محبوب محض ہوتا ہے نہ کہ مرد یا عورت۔ ہم غزل سنتے وقت تفصیلات کے رپورٹر نہیں ہوتے بلکہ حسن و محبت کی داخلی قدروں کے نقاد اور پارکھی ہوتے ہیں۔ اسی ارتکاز کی بدولت غزل میں وہ عالم گیر صفات اور آفاقیت (UNIVERSALITY) وہ عام اپیل اور وہ

صلا "اُردو کی عشقیہ شاعری" فراق صفحہ ۱۴۴

صلا اُردو کی عشقیہ شاعری صفحہ ۱۰

دوُر رسی آتی ہے۔ اسی سے غزل میں وہ زندگی آجاتی ہے جو ہماری اور اصنافِ سخن میں اس حد تک مشکل سے آپاتی ہے۔ غزل میں ہم روحِ محبت اور روحِ حسن سے دوچار ہوتے ہیں اور عشقِ مجازی یا جنسیت کی معراجی منزلوں سے گزرتے ہیں اردو غزل میں لطافت، نزاکت اور سلیقے سے مذکر فعل لانا بدچلنی نہیں ہے، خلاف فطرت عمل نہیں ہے بلکہ بہت شریف جذبہ ہے اردو غزل میں معشوق کیلئے کھٹے ویسے طور پر مونث فعل لانے سے جذبۂ عشق اور جمالِ محبوب کی اہمیت اور لطافت کو ٹھیس لگے گی۔

۱۳ ڈاکٹر عندلیب شادانی کا نقطۂ نظر سائنٹفک نہیں بلکہ اخلاقی و مذہبی ہے اور بے حد جذباتی۔ ممکن ہے غالب اپنے "جمیئ رنگت" کے عہد میں" امرد" کی طرف مائل ہوئے ہوں لیکن ان کی شاعری کا قرینہ ان تمام اشعار کے باوجود جو ڈاکٹر عندلیب نے ثبوت کے طور پر پیش کئے ہیں: بقول ڈاکٹر اکرام "نسوانی حسن" کے ہی دلدادہ تھے۔ ڈاکٹر شادانی نے فارسی شعرا دقیقی، سلطان سنجر سلجوقی، خاقانی، انوری، ظہیر فاریابی، سعدی، حافظ، امیر خسرو، سرمد، غنیمت اور صائب وغیرہ کے یہاں بھی امرد پرستی کے رجحانات کے نشان دہی کی ہے۔ لیکن جب حافظ کا ذکر کرچکے تو انھوں نے فوراً پلٹا کھایا اور اپنی صفائی ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

"میرا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ خواجہ حافظ واقعی امرد پرست تھے۔ لیکن ان کے اشعار سے کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ ان کے عہد میں امرد پرستی نہ صرف یہ کہ معیوب نہ سمجھی جاتی تھی بلکہ فیشن میں داخل تھی اور ہر شاعر اپنے اشعار میں سوسائٹی کے مذاق اور ملکی رواج کے مطابق کسی نوخط یا سادہ رُو سے عشق کا اظہار ضرور کرتا تھا"

یہی بات وہ غالب کے بارے میں بھی کہہ سکتے تھے (غالباً انہیں حافظ سے کچھ عقیدت تھی اسی لئے انہیں اپنی صفائی دینی پڑی اور غالب کو وہ رگڑنا چاہتے تھے۔ اس لئے رگڑ دیا۔

غالب کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہیں تھی۔ اگر غالب کی ازدواجی زندگی خوش گوار ہوتی تو غالب کی زندگی میں جنسی بے راہ روی پیدا نہ ہوتی۔ وہ کبھی "ستم پیشہ ڈومنی" کی طرف رجوع نہ کرتے۔ لیکن حالی نے ازراہ عقیدت اس

---

۱۳ اہلِ دہلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا اُن سے سنا گیا ہے کہ عنفوانِ شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین اور خوب رو لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اور بڑھاپے میں بھی جبکہ راقم نے پہلے ہی بار ان کو دیکھا ہے ...... خوب صورتی کے آثار ان کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ مگر اخیر عمر میں قلت خوراک اور امراضِ دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و نزار ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا، قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے اس حالت میں بھی وہ نوعمار و تورانی معلوم ہوتے تھے"

"یادگار غالب" صہ ۱۶،۱۷

حقیقت پر مرزا کی ظرافت کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مرزا کے "خانگی تعلقات" پر حالی رقم طراز ہیں کہ "مرزا کی بی بی جو الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں۔ وہ نہایت متقی پرہیزگار اور نماز روزے کی سخت پابند تھیں۔ بجز خود مرزا مذہبی معاملات میں بے مبالات تھے اسی قدر ان کی بی بی احکام مذہبی کی پابند تھیں۔ یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے برتن الگ اور شوہر کے الگ رہتے تھے۔ باایں ہمہ بی بی شوہر کی خدمت گذاری اور خبر گیری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے مگر ان کے کھانے پینے وغیرہ اخراجات وغیرہ کا انتظام سب گھر میں ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی ہمیشہ وقت معین پر ایک بار وہ گھر میں ضرور جاتے تھے۔ مگر چونکہ شوخی اور ظرافت ان کی زبان قلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جن کو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔[۱۴]

حالی نے بڑی خوب صورتی سے حقائق پر لطائف و ظرافت کے پردے ڈال دیئے ہیں۔ تین لطیفے ملاحظہ کیجئے:-

(۱) لطیفہ:- کسی نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ اس کے ننھے ننھے بچے ہیں اور اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے؟ اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

"امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا۔ تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔"

۲- لطیفہ:- جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا۔ طوطا سردی کے سبب پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھ کر کہا:

"میاں مٹھو! نہ تمہارے جورو، نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے بیٹھے ہو؟"

۳- لطیفہ:- ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھ کر آئے اس کا دیوان خانہ تو پسند آگیا، مگر محلسرا خود نہ دیکھ سکے۔ گھر پر آکر اس کے دیکھنے کے لئے بی بی کو بھیجا۔ وہ دیکھ کر آئیں تو ان سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔ مرزا نے کہا "کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟"[۱۵]

ص۱۴ "یادگار غالب" ص۹۲-۹۳

ص۱۵ "یادگار غالب" ص۹۳-۹۴

رباعی

اے آنکہ براہ کعبہ روئے داری　　　　دانم کہ گزیدہ آرزوئے داری!

زیں گونہ کہ تند می خرامی، دانم　　　　در خانہ زنے ستیزہ خوئے داری!

نفسیاتی اعتبار سے یہ لطیفے کافی اہم ہیں۔ مرزا نے، مرزا علاء الدین احمد خاں علائی کو جون ۱۸۶۲ء میں لکھا تھا۔

"ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب وگل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیجکر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب سنہ ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب سنہ ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔" [۱۶]

۵ اگست ۱۸۶۱ء کو میر مہدی حسین مجروح کو مرزا نے ایک خط میں لکھا تھا۔

"وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ ہے۔ ایک چھیاسٹھ [۶۶] برس کا مرد، ایک چونسٹھ [۶۴] برس کی عورت، ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں، وبا آئی تھی۔ تف بریں وبا۔" [۱۷]

اب ایک جملہ منشی ہر گوپال تفتہ کے خط کا اور ملاحظہ کیجئے۔ مرزا لکھتے ہیں:۔

"جیسے اچھی جورو، بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے، میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔" [۱۸]

فرائڈ کی تعلیمات کا اصل اصول یہ ہے کہ شعوری کردار کا تعین لاشعوری محرکات و اسباب کے زیر اثر ہوتا ہے [۱۹]۔ مذکورہ بالا انشاؤں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو "پھانسی کا پھندا" "سرنگوں لٹکنا" "بلا" "زن ستیزہ خو" "بیڑی اور زندان" "تف بریں وبا" "اچھی جورو" "برا خاوند" وغیرہ الفاظ مرزا کے ذہن کے لاشعوری گوشوں کا انکشاف کرتے ہیں۔ اور حقیقت ظرافت کے پردوں سے جھانکتی ہوئی صاف نظر آتی ہے کہ مرزا اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں تھے۔ مرزا کی ظرافت جہاں ایک طرف ان کی غیر معمولی ذہانت کی غمازی کرتی ہے تو دوسری طرف اس "ذہنی

---

[۱۶] خطوط غالب مرتبہ مالک رام ص ۳۶۲ (خط ۹۱) [۱۷] خطوط غالب مرتبہ مالک رام ص ۲۲۵ (خط ۳۹)

[۱۸] 〃 〃 〃 ص ۹۰ (خط ۱۰۵)

[۱۹] "جنس کا جنسیاتی پہلو" مصنفہ کینتھ واکر اور پیٹر فلیچر مترجم سید قاسم محمود ص ۲۸

سمجھوتے" کی عکاسی بھی ہے جو مرزا نے غیر مطمئن اور ناخوشگوار حالات سے کر لیا تھا۔ آخر یہ سمجھوتہ مرزا کی وضعداری میں شامل ہو گیا لیکن اس کا ردِعمل یہ ہوا کہ مرزا نے پینی شروع کر دی۔ حالی لکھتے ہیں کہ [20] مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی، جو مقدار انھوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کبھی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت برا بھلا کہتے تھے، مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے، دوسرے اس میں تین حصے گلاب ملا لیتے تھے، جس سے اس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

آسودہ باد خاطرِ غالبؔ کہ خوے اوست، آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مرزا، میر مہدی مجروحؔ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"جاڑا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے، کل رات سے نری انگیٹھی پر گزارا ہے، بوتل، گلاس موقوف۔" [21]

مرزا تفتہؔ کو لکھتے ہیں :-

"آج میرے پاس "۴" نقد بکس میں اور چار بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانہ میں موجود ہیں"۔ (جون ۱۸۵۳ء) [22]

"مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ، جیے جاتا ہوں، باتیں کیے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر جاؤں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے، جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت ہے۔" (۱۹۔ نومبر ۱۸۵۸ء) [23]

"۱۵ دن پہلے تک دن کو روٹی، رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے، شراب نہیں۔" (نومبر ۱۸۵۹ء) [24]

---

۲۰ یادگارِ غالب ص ۶۰

۲۱ خطوط غالب، مالک رام ص ۳۳۳ (خط ۴۴)   ۲۲ خطوط غالب، مالک رام ص ۹۱ (خط ۶۰)

۲۳ " " " ، ص ۲۲۴ (خط ۱۰)   ۲۴ " " " ، ص ۹۹ (خط ۶۳)

"بیس برس آگے یہ بات تھی کہ ابروباراں میں پیشیں از طعام چاشت یا قبیل شام تین گلاس پی لیتا تھا۔ اور شراب شبانہ معمولی میں مجرا نہ لیتا تھا۔ اس بیس برس میں بیس برساتیں ہوئیں، بڑے بڑے مینہ برسے، پینا ایک طرف، دل میں بھی خیال نہ گزرا، بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہوگئی ہے۔" صا ۲۵

مرزا کی جوانی شراب پی کر مہک گئی "تماش بینی" اور "جوا" کا بھی چسکا لگ گیا۔ آخر اس بلے راہ روی کی بدولت مرزا کو جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ حالی نے اس واقعہ کو ذرا ہلکا کرکے لکھا ہے :-

"مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ اس چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا . . . . . یہ واقعہ مرزا صاحب پر بہت شاق گزرا تھا۔ اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو ان کو قید خانے میں گزرے ان کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی۔" ۲۶

منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں مرزا لکھتے ہیں :-

"انگریزی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق؛ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے! جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔" ۲۷

اس "کچھ معشوق" میں کہیں بقول ڈاکٹر عندلیب شادانی کے "کچھ امرد اور کچھ کسبیاں" تو شامل نہیں ؟

ازدواجی زندگی کی ناکامی کے بعد شراب اور جوئے کے شغل سے فرصت ملی تو نوجوان مرزا نوشہ کسبیوں کے کوٹھے کے ہو رہے۔ اور وہاں سے کوئی نامراد مرض بھی آگئے یہ نامراد مرض ہی اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ مرزا طوائف کے کوٹھے پر داد عیش دیتے رہے ہیں۔ اس موضوع پر مزید تحقیقات کا کام تو ہمارے اطبا کو کرنا چاہئے بہر حال

---

۲۵ خطوط غالب۔ مالک رام ص۵۲ (خط ۱۰)

۲۶ یادگار غالب حالی ص۲۵-۲۸

۲۷ خطوط غالب مالک رام ص۲۲-۲۳ (خط ۲۴)

حالی نے بھی مرزا کے "دائمی امراض" کا ذکر کیا ہے۔

"مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچے پے در پے ہوئے، مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔"[۲۸]

ساتوں بچوں کا مر جانا معنی خیز ہے۔ (مرزا کو تھے کے کسی ایسے روگ میں تو مبتلا نہیں تھے جس کے اثر سے بچے مر گئے ہوں)

غالب کے خطوں سے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو قابل غور ہیں:۔

بنام مرزا تفتہ:۔

"بیمار ہوں، ہات پر ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔"[۲۹] (۱۸۶۳ء)

بنام مرزا تفتہ:۔

"پاؤں کا ورم حد سے زیادہ گزر گیا ہے۔ مادہ تحلیل کے قابل نہ نکلا۔ کھولن شروع ہو گئی۔ حکمار جو دو تین یہاں ہیں ان کی رائے کے مطابق کل سے پیپ کا بھرنا بندھے گا، وہ پکالا رہے گا تب اس کے پھوڑنے کی تدبیر کی جائے گی تلوا زخمی، پنڈلی زخمی۔"[۳۰]

"— مجملاً حال میرا یہ ہے کہ قریب بہ مرگ ہوں۔ دونوں ہاتھوں میں پھوڑے، پاؤں میں ورم، نہ وہ اچھے ہوتے ہیں، نہ یہ رفع ہوتا ہے۔ بیٹھ نہیں سکتا۔ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔"[۳۱]

(۲۳- جولائی ۱۸۶۴ء)

"— میں قریب بہ مرگ ہوں۔ پاؤں کے ورم اور ہات کے پھوڑے نے مار ڈالا ہے۔"[۳۲]

بنام منشی نبی بخش حقیر:۔

"ایک مدت سے میرا پاؤں چھل رہا تھا، چھوٹے چھوٹے دانے بطریق دائرہ کف پا کے محیط تھے۔ ناگاہ جیسے ایک قوم میں سے ایک شخص امیر ہو جائے ایک دانہ ان دونوں میں سے بڑھ گیا اور پک گیا اور پھوڑا ہو گیا اور وہ قریب ٹخنے کی ہڈی کے تھا۔" (۱۸۵۰ء)[۳۳]

---

[۲۸] یادگار غالب حالی ص۳۲ [۲۹] خطوط غالب، مالک رام ص۵۳ (خط ۹۹) [۳۰] خطوط غالب مالک رام ص۸۸ (خط ۱۰۱)
[۳۱] خطوط غالب مالک رام ص۸۹ (خط ۱۰۳) [۳۲] خطوط غالب مالک رام ص۸۹ (خط ۱۰۴)

"— مجھ کو بھی بہ سبب فصل بہار کے ہیجان خون ہے۔ احتراق کے شدائد بہ نسبت اوروں کے زیادہ ہیں۔ لازم یوں تھا کہ شاہترہ پیتا اور مسہل لیتا مگر کچھ نہیں ہو سکا صرف فصد باسلیق پر قناعت کی اور آدھ سیر خون لے لیا۔" (مارچ ۱۸۵۱ء) ۳۴

"— میرے پاؤں میں دو ایک پھوڑے نکلے ہیں۔" ۳۵

"— آگے ایک قولنج کا دورہ تھا، اب وجع الصدر کا دورہ شروع ہو گیا ہے۔ جب یہ درد اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، چار پہر، چھ پہر، دو پہر رہتا ہے۔ پھر رفع ہو جاتا ہے۔" (۹ مارچ ۱۸۵۲ء) ۳۶

بنام قاضی عبدالجلیل جنون۔

"اب میں تندرست ہوں۔ پھوڑا پھنسی، زخم جراحت، کہیں نہیں۔ مگر ضعف کی وہ شدت ہے کہ خدا کی پناہ۔ ضعف کیوں نہ ہو؟ برس دن صاحب فراش رہا ہوں۔ ستر برس کی عمر، جتنا خون بدن میں تھا، بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا۔"

(نومبر ۱۸۶۳ء) ۳۷

بنام نواب انور الدولہ شفق۔

"سال گذشتہ مجھ پر سخت گزرا۔ ۱۲، ۱۳ مہینے صاحب فراش رہا، اٹھنا دشوار تھا، چلنا پھرنا کیسا؟ نہ تپ، نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ، ان سب سے بدتر ایک صورت پُر کدورت یعنی

---

۳۴ خطوط غالب مالک رام صفحہ ۱۰۹ (خط ۵۱)

۳۵ " " " صفحہ ۱۳۱ (خط ۱۳۰)

۳۶ " " " صفحہ ۱۱۵ (خط ۱۳۲)

۳۷ " " " صفحہ ۱۸۷ (خط ۱۵۰)

احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے، ہر پھوڑا ایک زخم، ہر زخم ایک غار، ہر روز بے مبالغہ بارہ تیرہ پھائے اور پاؤ بھر مرہم درکار۔"

(۱۵ر فروری ۱۸۶۴ء) ۳۸؎

بنام غلام حسنین قدر بلگرامی۔

"۔۔۔ میں برس دن سے بیمار تھا۔ ایک پھوڑا اچھا ہوا، دوسرا پیدا ہوا۔ اب فی الحال دونوں پاؤں ہاتھوں میں نو پھوڑے ہیں۔ دونوں پاؤں پر دو پھوڑے پنڈلی کی ہڈی پر ایسے ہیں کہ جن کا عمق ہڈی تک ہے۔"

(۲۲۔ اگست ۱۸۶۳ء) ۳۹؎

"۔۔۔ میں اب اچھا ہوں۔ برس دن صاحب فراش رہا ہوں۔ چھوٹے بڑے زخم بارہ اور ہر زخم خونچکاں۔ ایک درجن پھائے لگ جاتے تھے۔ جسم میں جتنا لہو تھا۔ پیپ ہو کر نکل گیا۔

(۲۴۔ نومبر ۱۸۶۴ء) ۴۰؎

بنام شیو نراین آرام

اور میرا حال یہ ہے کہ علاوہ اس دائیں ہات کے زخم کے سیدھی ران میں اور بائیں بائیں ہات میں ایک ایک پھوڑا ابھرا ہے۔ حاجتی میں پیشاب کرتا ہوں، اٹھنا دشوار ہے۔

(۳۔ مئی ۱۸۶۳ء) ۴۱؎

یہ غار سے زخم، ورم، کھولن، پھوڑے، دانے بطریق دائرہ، احتراق، وجع الصدر کا دورہ، پیپ، زخم، وغیرہ کوڑھ کے روگ کی علامتیں تو نہیں ہیں؟

تخم تاثیر صحبت کا اثر۔ مرزا کسبیوں اور جواریوں کی صحبت میں رہ کر اپنے خاصے بگڑ گئے تھے اس کا

۳۸؎ خطوط غالب مالک رام صفحہ ۲۱۳ (خط نمبر ۲۱) ۳۹؎ خطوط غالب مالک رام صفحہ ۲۰۱-۲۰۲ (خط ۱۸)

۴۰؎ " " " صفحہ ۲۹۱ (خط ۱۱۹)

۴۱؎ " " " صفحہ ۴۴۷ (خط نمبر ۲۵)

ثبوت ان کے وہ کلمات ہیں جو تہذیب سے گرے ہوئے ہیں مگر مرزا بے تکلفانہ اپنے خطوں میں استعمال کرتے ہیں کم ازکم مرزا کے شایانِ شان نہیں۔ مثلاً منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیٔ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں، جیسا وہ گھا گھس اُلّو عبدالواسع ہانسوی لفظ "نامراد" کو غلط کہتا ہے اور یہ اُلّو کا پٹھا قتیل . . . . . کو غلط کہتا ہے۔"

(اگست ۱۸۶۰ء) [۴۲]

بنام سید یوسف مرزا۔

"انیسویں اپریل کی صبح کو بھائی فضلو، جن کو میر کاظم علی بھی کہتے ہیں اور ہم نے احتلام الدولہ کا خطاب دیا . . . ." (۱۸۶۰ء) [۴۳]

"اُلّو کا پٹھا" اور "احتلام الدولہ" "پیر نور" کی صحبت کی غمازی کرتے ہیں۔

اگر بغور اس پہلو پر توجہ دی جائے تو مرزا کی "قدر ناشناسی" کا راز کھل جائے۔ غالب مشکل پسندی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے لاابالی پن کی وجہ سے بحیثیت انسان کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ حالی کا یہ بیان ہماری بات کی تصدیق کرتا ہے :-

"جب یہ مقدمہ داخل دفتر ہوگیا۔ ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گمنام خط . . . . . بھیجنے شروع کئے، جن میں شراب نوشی اور بدمذہبی وغیرہ پر سخت نفرین اور طعن و ملامت لکھی ہوتی تھی۔ ان دنوں مرزا کی عجیب حالت تھی، نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے۔" [۴۴]

. . . . . . اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی، مسکرا کر کہنے لگے کہ اس اُلّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بڈھے اور ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ

---

[۴۲] خطوط غالب مالک رام صـ۹۴ (خط ۹۵) [۴۳] خطوط غالب مالک رام ص۲۳۵ (خط ۱۰۱)
[۴۴] یادگار غالب ص۴۸-۴۹

ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ فرمساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا۔" [۲۵]

آخر غالب کو بھی اس کا احساس ہو چلا تھا کہ وہ بے دین اور گمراہ ہو گیا۔ واقعی وہ گنہ گار ہے۔ مثلاً قاضی عبدالجمیل جنوں کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"ایک کم ستر برس دنیا میں رہا، کوئی کام دین کا نہ کیا۔ افسوس ہزار افسوس"۔

(جون ۱۸۶۴ء) [۲۶]

یا یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

فرائڈ کا "جبلت جنس" کو محورِ حیات" قرار دینا مبالغہ آمیز سہی، تاہم اس نے کچھ باتیں بڑی پتے کی بتائی ہیں۔ مثلاً آرٹ کو جبلت جنس کا ارتفاعی عمل (SUBLIMATION) قرار دیتا ہے۔" جب ہم جنسی جبلت کو دباتے ہیں تو یہ دوسرا راستہ فنون لطیفہ کا ہوتا ہے۔" گویا جبلت جنس کا ارتفاع (SUBLIMATION) آرٹ کی شکل میں ظاہر ہوا ہے اس نفسیاتی حقیقت کے انکشاف نے ادب کے بہت سے تاریک گوشوں کو روشن کر دیا۔ فرائڈ نے ارتفاعی عمل کے سلسلے میں ایک نیا انکشاف یہ بھی کیا ہے کہ ہماری جملہ جنسی خواہشیں اعلیٰ وارفع نہیں ہو پاتیں بلکہ ان کا ایک جزو ہی ارتفاع پذیر ہوتا ہے [۲۷]

اگر ہم کسی ایسی خواہش کو جس سے جذبے کی کوئی شدید شکل مربوط ہو، دبالیں تو وہ ہمارے ذہن میں ہمیشہ اصلی حالت میں موجود رہتی ہے اور کسی نہ کسی طریق سے ہماری روزمرہ زندگی پر برابر اثر انداز ہوتی رہتی ہے [۲۸] مرزا کو ستم پیشہ ڈومنی کی یاد بڑھاپے میں بھی برابر آتی رہی۔

مرزا نے بے شمار خطاؤں اور خامیوں کے باوجود صنف اردو غزل کو فکر کی گہرائیاں اور تخیل کی بلندیاں عطا کی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے۔ غالب ریاکار نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے باطن کو کھول کر رکھ دیا تھا ؎

---

[۲۵] یادگار غالب ص ۵۱ [۲۶] خطوط غالب مالک رام ص ۱۹۰ (خط ۳۲)

[۲۷] جنسی جبلت اور اردو شاعری، (جاوید وششٹ) جوار بھاٹا مئی ۱۹۶۴ء

[۲۸] فرائڈ اور لاشعور مصنفہ پروفیسر ایم۔ اے قریشی ص ۱۵

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہ گار ہیں ہم

مگر بے چارے مرزا کے ساتھ نقادوں نے بھی بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ کسی نے انہیں فلسفی بنا دیا تو کسی نے صوفی یا پھر انہیں اخلاقی اور مذہبی عینکوں سے دیکھا گیا۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو مرزا کی شاعری میں ارتقائی عمل بھی برابر ارتقا پذیر نظر آئے گا۔ غالب نے اردو غزل کو رفعت و عظمت بخشی ہے۔ ایک ناآسودہ، تشنہ کام فنکار کی طرح مرزا نے شعر کے فن کو وہ جلا دی کہ آج وہ اس کی بدولت صحیح معنوں میں "غالب صدی" کا ہیرو ہے۔

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے!
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

کلامِ غالب

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ∗ زنہار، اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ∗ میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی، بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی ∗ مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے، کہ ہر گوشۂ بساط ∗ دامانِ باغباں و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ ∗ یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں ∗ نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ∗ اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے، یہ مضامیں خیال میں
غالب، صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

(ادارہ)

گلزار دہلوی

قطعات

شہرۂ آفاق ہمہ دور، بیانِ غالبؔ
آگہی بخشِ ہمہ عہد زبانِ غالبؔ
جس جا پہ ہے واللہ یقیں بھی مغلوب
مسکراتا ہے اُسی جا پہ گمانِ غالبؔ

*

ہوں عنادِل پر نوا سنجِ فغاں کوئی نہ ہو
داستانِ بے زبانی کی زباں کوئی نہ ہو
یوں روایاتِ کہن کو ختم کرنا چاہیئے
سرفروشانِ چمن کا بھی نشاں کوئی نہ ہو
موتیا، بیلا، چنبیلی، جُوہی، چمپا اور گلاب
سب فسردہ پھول، بہارِ بوستاں کوئی نہ ہو
اس طرح تجدیدِ علم و فن ضروری ہے ندیم
اگلے وقتوں کی نمایاں داستاں کوئی نہ ہو
حیف دِلی مٹ چکی وہ اہلِ دِلی بھی کہاں
تذکرہ بھی ان کا میرے مہرباں کوئی نہ ہو
اک نئے انداز سے آتش کدہ روشن کرو
آگ بھڑکے، لپکیں شعلے اور دھواں کوئی نہ ہو
اے خوشا کچھ خوش نظر بیچارے ہیں خیر سے
زندہ اُردو تو رہے اس کا مکاں کوئی نہ ہو
جشنِ غالبؔ ہی نہیں ہے جشنِ اُردو بھی ہے یہ
پھر زباں پر کس لئے ذکرِ زباں کوئی نہ ہو
اب تو غالبؔ کو سکونِ قلب ملنا چاہیئے
اب تو شاید آرزو دل میں نہاں کوئی نہ ہو
پوری خواہش ہو گئی اُن کی یہ آزادی کے بعد
"ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو"

حضرتِ گلزارؔ سے کہتے تھے کچھ اہلِ زباں
آرزو گر ہو تو ہو، عزمِ جواں کوئی نہ ہو

سید ناصر حسین

غالبؔ علاقہ او بہ زبان فارسی

فارسی کی روایات ہندوستان میں تقریباً اسی قدر پرانی اور قدیم ہیں جتنی خود ایران ہیں جب غزنوی سلطنت میں وسعت ہوئی تو مشرقی پائی تخت لاہور بنا جو پائے تخت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت جلد علم و ادب فارسی کا گہوارہ ہوگیا اور مسعود سعد سلمان، ابوالفرج ادنی اور نکاتی وغیرہ نے یہاں شعر و سخن کی شمع گرمائی وقت کے ساتھ ساتھ یہ صحت مند روایت گہری جڑیں پکڑتی گئی امیر خسرو اور حسن دہلوی نے اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کی۔

مغلوں کے دور حکومت میں فارسی علم و ادب کا مرکز ایران سے منتقل ہوکر ہندوستان آگیا اور وہاں کے بیشتر اہل قلم نے یہاں آکر اپنے فن کو فروغ دیا۔ ہندوستان کے فارسی ادب کی تاریخ میں دور مغل کی اہمیت دو وجہ سے ہے ایک تو اس طویل دور میں جو بابر سے شروع ہوکر بہادر شاہ ثانی پر ختم ہوتا ہے فارسی شعراء اور نثر نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے دوسرے یہ کہ ان میں صف اوّل کے شعراء اور نثر نگاروں کی کمی نہیں۔ اگر اس دور کے آغاز میں ظہوری نظیری، عرفی، فیضی اور ابوالفضل جیسی عبقری شخصیتیں ہیں تو اس دور کے آخر میں غالب کی بلند شخصیت ہے جس نے اپنی فارسی کے بارے میں کہا ہے۔

فارسی بین تا ببینی نقشہای رنگ رنگ — بگذر از اردو کہ این مجموعہ بی رنگ من است

تو ای کہ محو سخن گستران پیشینی — مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

مرزا اسد اللہ خاں غالب اکبرآبادی ثم دہلوی ۱۲۱۲ھ تا ۱۲۸۵ھ کے آبا و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے۔ ان کا سلسلہ نسب فریدوں تک پہونچتا ہے سلجوقیوں کے زوال کے بعد جب ایبک منتشر ہوئے تو ترسم خاں ایک امیر زادہ نے جس نے اپنی بود و باش سمرقند میں اختیار کی غالب کے آبا و اجداد جو ہندوستان آئے اسی ترسم خاں کی اولاد تھے چنانچہ غالب مہر نیم روز کے دیباچہ میں یوں لکھتے ہیں۔ از نوا پیہای این قافلہ نیای من کہ وزظلم و داد رانہ سمرقند شہر مسقط راس وی بود چون سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہ ہند آمد[1]

[1] یادگار غالب مرتبہ مولانا الطاف حسین حالی ص۱

اسی طرح درفش کاویانی میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "بالجملہ سلجوقیان بعد از زوال و برہم خوردن ہنگامۂ سلطنت در اقلیم وسیع الفضا رساور النہر پراگندہ شدند از ان جملہ سلطان زادہ ترسم خاں کہ ما از تخمہ ادیم سمرقند را بہر اقامت گزید تا در عہد سلطنت شاہ عالم نیا می من از سمرقند بہ ہندوستان آمد[1] غالب نے اپنے فارسی اشعار میں بھی جگہ جگہ اپنے نسب کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس پر فخر کیا ہے

غالب از خاک پاک تورانیم — لاجرم در نسب فرا مندیم
ترک زادیم در نژاد ہمی — بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم — دانی کہ اصل گوہرم از دودہ جم ست
میراث جم کہ می بود اینک بمن سپار — زین پس رسد کہ میراث ادم ست

مگر وہ ایسے دور میں پیدا ہوئے جب تلوار سے زیادہ قلم کی ضرورت تھی اور انھوں نے قلم کے جوہر دکھائے غالب کے قول کے مطابق ان کے آبا و اجداد کشاورزی اور شمشیر آزمائی کے ذریعہ اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔

ہمیں ان کے خاندان میں کسی ایسی شخصیت کا پتہ نہیں چلتا جو علم و فضل کے بلند مقام پر ہو۔ گویا غالب کا کمال ذاتی ہے آبائی نہیں۔

عرفی شیرازی نے اپنے ایک مشہور قصیدہ میں اس بات پر فخر کیا ہے کہ ان کی شخصیت کے شکستہ در و بام سے ان کے آبا و اجداد کی مٹتی ہوئی شان و شوکت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کی شخصیت میں جو کچھ کمال ہے اس کا فخر بہرحال اس کے آبا کو ہے۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ — آثار پدید ست صنادید عجم را
تا گوہر او م نسبم باز نہ ایستد — رابار خود از شرم اصحاب کرم را
وصف گل و ریحان بہ ہوا باز نگردد — ہرچند ہوا عطر دہد قوت شمم را
آقا نبود وصف اضافی ہنر ذات — این فتویٰ ای ہمت بود ارباب ہمم را[2]

لیکن غالب اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کا کمال ذاتی ہے آبائی نہیں ان کی شخصیت میں

---

[1] یادگار غالب صلہ [2] از قصاید عرفی مطبوعہ منشی نول کشور لکھنؤ صلہ

جو رنگا رنگی ہے وہ ان کے فن کی عظمت خود انھیں کی عبقریت کی احسان مند ہے۔

نازم بکمال خود و بر خود نغزایم — اثار در دبام صفا دیدعجم را
گوہر نہ بکان، کان بہ گہر روی شناسی ست — بہ فرض ذات دلیلم اب دام را
رای مرا تیغ و مرا کلک بہ ساز ست — دست است جدا گانہ بہر کار رہا ہم را
بلبل شیراز رکجا طوطیٔ آمل — تا پایہ بسنجیم نوا سنجیٔ ہم را

غالبؔ کی تعلیم

غالبؔ نے آگرہ کے ایک معلم شیخ معظم سے عربی او رفارسی پڑھی اس کے بعد ان کی ملاقات ایک ایسی شخصیت سے ہوئی جس نے ان کی فارسی کو جلا بخشی یہ شخصیت ہرمزد ایرانی کی تھی ہرمزد پہلے آتش پرست تھے۔ بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا نام عبدالصمد رکھا تھا وہ سیاحت کرتے ہوئے آگرہ آئے اور وہ دو سال غالبؔ کے ساتھ رہے اس دوران میں غالبؔ نے ان سے فارسی سیکھی غالبؔ عبدالصمد کی شاگردی پر بڑا ناز کرتے تھے ان کا نام بڑے احترام سے لیتے تھے اور ان کے نام کے ساتھ لفظ تیمار استعمال کرتے تھے۔

غالبؔ نے اس سلسلہ میں ایک جگہ یوں لکھا ہے:۔

"بدوی فطرت سے میری طبیعت کو فارسی زبان سے ایک لگاؤ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے یار مراد برائی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور اس سے حقائق و دقائق زبان فارسی کے معلوم کئے اب مجھے اس امر میں نفسہ مطلقہ حاصل ہے۔"[۱]

گویا یوں کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ ایران نہیں گئے مگر ان کی فارسی تعلیم سراسر ایک ایرانی استاد کی مرہونِ منت تھی۔ غالبؔ کی طبیعت میں اتنا کابے پناہ عنصر تھا جب فارسی نظم و نثر میں ان کا درجہ مسلم ہوگیا تو انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ عبدالصمد ایک فرضی نام تھا جسے میں نے اس لئے تراش رکھا تھا کہ لوگ مجھے "بے استادا" نہ کہیں غالبؔ کا یہ دعویٰ شاعرانہ تعلی سے زیادہ نہیں ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے بہت کم عرصہ کے لئے عبدالصمد سے فیض حاصل کیا۔ انھیں اپنی فطری صلاحیت اور خداداد ملکہ شاعری پر بجا

---

[۱] از کلیات غالبؔ نول کشور ۱۹۲۳ء صفحہ ۲۰، [۲] اردوئے معلی صفحہ ۲۹۹

نازتھا اور ان کا دعویٰ تھا کہ میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے مبدا فیاض سے حاصل کیا ہے۔

قاطع برہان کے آخر میں یوں لکھتے ہیں "میرا دادا توران سے آیا باپ دلی میں پیدا ہوا اور میں خود آگرہ میں ہوں، میں اپنے تئیں اہل زبان جانتا ہوں بلاشبہ زباں داں ہوں، میری زباندانی اور اسلامتی طبع دوسرے میری طبیعت فارسی سے فطرتاً مناسب واقع ہوئی ہے مگر افسوس لوگوں نے میرے کلام کی قدر نہ کی اور میری نظم و نثر کے کرشموں کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا گویا نیطری جنت آرام گاہ کا مقطع میرے حسب حال ہے۔"

تو نیطری زفلک آمدہ بودی چو مسیح   بازپس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ[1]

غالب اور فارسی لغت

غالب کو ادب فارسی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان اور لغت سے بھی گہری دلچسپی تھی الفاظ کی تحقیق و تلاش ان کا دلچسپ مشغلہ تھا، اس شغل نے ایک عجیب صورت اختیار کی ہوا یہ کہ غالب نے محمد حسین تبریزی کی برہان قاطع کا مطالعہ شروع کیا۔ دوران مطالعہ میں جو غلطیاں نظر آئیں انھیں وہ لکھتے گئے اور بعد میں یہ تمام چیزیں ایک کتاب کی صورت میں قاطع برہان کے نام سے شائع ہوئیں غالب کا یہ تجربہ فارسی لغت میں اپنی نوعیت کا واحد تجربہ تھا اور بقول جناب امتیاز علی عرشی" انیسویں صدی کے پرجمود اور تقلیدی تہذیب میں آزاد نقد و تبصرہ کا پہلا قدم تھا۔"

لیکن اس نقد و تبصرہ میں غالب نے جو طرز بیان اختیار کیا وہ متانت سے گرا ہوا تھا انھوں نے پوری کتاب میں مضحکہ خیز لہجہ باقی رکھا اور عجیب عجیب انداز سے ہندوستان کے فارسی دانوں کا خاکہ اڑایا غالب کا یہ طنز ہندوستان کا فارسی داں طبقہ برداشت نہ کرسکا اور ہر طرف سے ان کو ترکی بہ ترکی جواب ملا حالانکہ جہاں تک لغت کا تعلق ہے غالب کی بیشتر گرفت صحیح تھی چونکہ ان کے چند سال بعد ایران کے ایک دانشور رضا قلی خاں ہدایت نے مشہور لغت" فرہنگ انجمن آرائے ناصری" لکھا اور بہت سے الفاظ کی تشریح میں غالب کی ہمنوائی کی۔

اس مناظرہ سے غالب کو اور موقع ملا کہ وہ لغت کی تحقیق کریں انھیں پہلے سے فارسی کے قدیم الفاظ سے لگاؤ اور ان کے استعمال کا شوق تھا چنانچہ پنچ آہنگ میں ایسے الفاظ کی ایک طویل فہرست ہے۔

---

[1] یادگار غالب ص ۱۳۸ فرہنگ غالب امتیاز علی عرشی دہلی، ۱۹۴۷ء ص ۱۰-۱۱

اس معاوضہ میں جب غالب کی فارسی دانی پر۔ وہ پڑی تو انھوں نے قدیم اساتذہ اور لغت کی کتابوں کا بالاستعیاب مطالعہ شروع کیا اور اس مطالعہ سے ان کے علم زبان اور علم لغت میں یقیناً بہت وسعت ہوئی لیکن متاسفانہ انھوں نے وہی غیر متین اور ناہموار لہجہ باقی رکھا اور برہان قاطع کے مولف کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہندوستان کے مستند لغت نویس۔ جیسے میر جمال الدین حسین انجوی شیرازی مولف فرہنگ جہانگیری، ملا عبدالرشید ٹھٹھوی مولف فرہنگ رشیدی وارستہ مل سیالکوٹی مولف مصطلحات شعرا، لالہ ٹیک چند بہار مولف بہار عجم ملا غیاث الدین مولف غیاث اللغات اور محمد حسین قتیل وغیرہ کو بھی بے نقط سنانا شروع کر دیا

اس سلسلہ میں غالب کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ لغت کے معاملہ میں ہندوستان کے فارسی اساتذہ پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا سند صرف ایرانی اساتذہ سے لی جا سکتی ہے۔ مگر لطف بعض لیسے بھی مقامات آئے جہاں غالب نے ایرانی ادبا، اور شعرا کی بھی غلطیاں پکڑیں گویا انھوں نے لغت دانی کے زعم میں ایرانی اساتذہ کو بھی نہیں بخشا مثلاً لفظ "بے پیر کی تشریح میں یوں لکھتے ہیں" "تورانی بچہ ما ی بندی شر او کا تراشا ہوا ہے مرزا جلال مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں لیکن تعجب اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادۂ ایران ایسا لکھے۔

اسی طرح لفظ تہمتن کے بارے میں لکھتے ہیں۔ تہمتن بروزن قلم زن ہے۔ فردوسی نے سو جگہ شاہنامہ میں لفظ تہمتن بہ سکون ہای ہوز لکھا ہے پس کیا اس لغت کی دو سو تیں قرار پا گئیں لاحول ولاقوۃ لغت وہی بحرکت ہای ہوز ہے۔

لیکن اس معاوضہ کا ایک علمی فائدہ ہوا اور وہ یہ کہ اس سلسلہ میں لغت کی بہت ساری کتابیں وجود میں آئیں جن کو اگر باقاعدہ طور پر مرتب کیا جائے تو تحقیق لغت کے سلسلہ میں ایک مفید مواد فراہم ہو سکتا ہے۔ ان کتابوں میں سے جو قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئیں ہیں چند مشہور یہ ہیں۔

(۱) محرق قاطع برہان سید سعادت علی (۲) ساطع برہان رحیم بیگ رحیم میرٹھی (۳) قاطع القاطع امین الدین امین دہلوی (۴) موید برہان مولوی آغا احمد علی احمد۔ اسکے علاوہ غالب کی حمایت میں جو کتابیں لکھی گئیں یہ ہیں۔

(۱) دافع ہذیان مولوی نجف علیخاں (۲) لطائف غیبی (اردو) منسوب بہ میاں داد خاں سیاح (۳) سوالات عبدالکریم (اردو) (۴) نامۂ غالب (اردو) از غالب (۵) تیغ تیز (اردو) از غالب وغیرہ

غالب کی تخلیقات :۔ غالب نے فارسی اور اردو نظم و نثر کا ایک ضخیم سرمایہ چھوڑا ہے انکی اردو شاعری اور نثر نگاری نے ان کو اردو کے کلاسیکی اساتذہ میں ایک اہم مقام عطا کیا اور انکی فارسی نگارشات نے فارسی کے شعراء اور ادباء میں ان کو ممتاز کیا غالب کی فارسی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

نظم :۔ کلیات شعر غالب جو غزلیات قصائد مثنویات رباعیات اور قطعات پر مشتمل ہے۔

غالب کے کلیات میں ۳۷۰ غزلیات، ۶۴ قصائد، ۱۱ مثنویاں ۱۲۶ رباعیات ۳۵ قطعات[۲] مخمس ۱ ترکیب بند ۱ ترجیع بند ہیں اس کے علاوہ غالب کی مثنوی ابر گہربار دو قصیدے ۲ قطعہ اور چند رباعیاں سبد چین کے نام سے بعد میں چھاپا گیا ہے اور کچھ دنوں کے بعد اس میں نظم و نثر کا اور اضافہ کر کے سبد باغ دو در کے نام سے شائع ہوا۔[۱]

فارسی نثر

(۱) مکاتیب (۲) پنج آہنگ (۳) مہر نیم روز (۴) درفش کاویانی (۵) قاطع برہان (۶) دستنبو۔ (۷) کلیات کا دیباچہ اور خاتمہ (۸) تعریظیں (۹) لوگوں کی کتابوں پر دیباچے۔

غالب نے غزل، قصیدہ اور رباعی کا ایک ضخیم سرمایہ چھوڑا مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری کا اصل میدان غزل ہے۔ غالب کے دور میں نظیری، عرفی، ظہوری، طالب اور حزیں کا انداز غزل پر چھایا ہوا تھا۔ متاخرین میں بیدل کا انداز بھی مقبول تھا اگرچہ پیچیدگی کی وجہ سے اس کا تتبع آسان نہیں تھا۔ غالب انھیں اساتذہ کے تتبع میں غزل گوئی شروع کی اور کہیں بعینہ انھیں کی زمین اپنائی کہیں ردیف۔ کہیں قافیہ بدل کر اپنی انفرادیت باقی رکھی۔ غزل کے ابو بشر خواجہ حافظ شیرازی کی پیروی آسان نہیں تھی اس لئے غالب نے حافظ کی تقلید کی کوشش بہت کم کی ہے انھوں نے جہاں کہیں حافظ کا نام لیا ہے ادب و احترام سے لیا ہے ایک قصیدہ میں ان کے مصرعہ کی تضمین کرتے ہوئے انھیں دانائے دل شیراز کہتے ہیں۔

ہم ازیں جامعت کہ دانائے دل شیراز گفت   بندہ طلعت آں باش کہ آنی دارد (حافظ)

اس احتیاط کے باوجود غالب کی بعض غزلوں پر حافظ کا بہت واضح اثر ہے مثلاً مندرجہ ذیل غزل حافظ کی پہلی غزل کی یاد دلاتی ہے۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند   شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

گوہر از رایت شاہان عجم برچیدند   بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

ہرچہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند   تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند[۲]

سبد چین میں تین غزلیں ایسی ہیں جن میں حافظ شیرازی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۱) دورِ مغل کے فارسی شعراء میں غالب ظہوری سے بہت متاثر تھے ظہوری ترشیز کا رہنے والا تھا اور

---

[۱] کلیات غالب مرتبہ امیر حسین نورانی لکھنؤ فروری ۱۹۶۸ء

[۲] غالب نامہ مرتبہ شیخ محمد اکرام صفحہ ۲۳۹ احسان بکڈپو سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔

دکن کے عادل شاہی دربار میں ملک الشعرا تھا۔ اس نے عمدہ غزلوں کے علاوہ ایک خوب صورت ساقی نامہ اور نثر کی بہترین نگارشات چھوڑی ہیں۔ بیدل جیسا عظیم شاعر بھی ظہوری سے متاثر تھا غالب نے اپنی غزلوں میں جگہ جگہ ظہوری کو خراج عقیدت پیش کیا ہے مثلاً

غالب از من شیوۂ نطق ظہوری زندہ گشت
از نوا جان در تن ساز بیانش کردہ ام[1]

جب ہندستان کے فارسی دانوں نے غالب پر اعتراضات شروع کیے تو انھوں نے ایک دلگداز مثنوی بادِ مخالف لکھی جس میں اساتذہ فارسی کے تتبع کا ذکر کیا ہے ان اساتذہ میں انھوں نے ظہوری کا ذکر بڑی تفصیل اور احترام سے کیا ہے۔ وہ استاد روح روان معنی اور جہان معنی کہتے ہیں۔

دامن از کف کنم چگونہ را | طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح روانِ معنی را | آں ظہوری جہان معنی را
طرز اندیشہ آفریدہ اوست | در تن لفظ جان دمیدہ اوست[2]

ظہوری کا ہم عصر نظیری تھا جو عمر خیام اور عطار کے وطن نیشاپور کا رہنے والا تھا اس نے ہندوستان میں عبدالرحیم خانخاں کے زیر تربیت زندگی گذاری نظیری بنیادی طور پر غزل کا شاعر تھا اگرچہ اس کی قصیدوں کی تعداد بھی خاصی ہے اس کی استادی حیات میں مسلم ہو چکی تھی اور خود ظہوری نے اپنا دیوان اس کی خدمت میں پیش کیا تھا تاکہ اس کی رائے معلوم کر سکے سبک ہندی کے غزل نگاروں میں نظیری کا مقام بہ استثنار بیدل سب سے بلند ہے اور بعد کے شعرا پر اس کا اثر سب سے گہرا ہے۔ غالب ہی نظیری سے بہت متاثر ہیں اور اس کو اتنا بڑا شاعر مانتے ہیں کہ اس کی زمین میں غزل کہنا ہی گستاخی سمجھتے ہیں چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب | خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

خواجہ الطاف حسین حالی نے دونوں کی ہم طرح غزل (خفتہ است) کا موازنہ کیا کر کے بتایا ہے کہ مجموعی طور پر نظیری کی غزل غالب سے اچھی ہے اگرچہ غالب کا یہ شعر بہت خوب صورت ہے۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز | گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ است
بوادی کہ دراں خضر را عصا خفتہ است | بہ سینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتہ است
دگر ز ایمنیٔ راہ قرب کعبہ چہ خط | مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتہ است
بہ بیں زودد جو قرب شہ کہ منظر را | دریچہ باز و بہ دروازہ از دہا خفتہ است[3]

---

[1] کلیات غالب ص۲۹۶ [2] کلیات غالب ص۱۰۱ [3] یادگار غالب ص۲۵۵ تا ۲۵۶

لیکن غالب کی بہت ایسی غزلیں جو زبان و بیان میں نظیری کی غزلوں سے بلند مرتبہ ہیں جیسا کہ ڈاکٹر نذیر احمد کے مضمون نظیری و غالب سے معلوم ہوتا ہے بہرحال غالب کو یہ ملال تھا کہ ہندستان کا ذوقِ فارسی اتنا گر چکا ہے کہ اس میں نظیری جیسے استاد اور قتیل جیسے عام شاعر کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔

غالب سوختہ جان را چہ بگفتار آری

بہ دیاری کہ ندانند نظیری ز قتیل

ظہوری کا دوسرا اہم عنصر عرفی شیرازی ہے اگرچہ عرفی نے بہترین غزلیں کہی ہیں مگر نظیری کے برخلاف اس کی استادی کی معراج اس کے قصیدوں میں نظر آتی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

عرفی کی شاعری بے پناہ جوش، گہرے خلوص، اور پاکیزہ زبان کی بہترین مثال ہے نظیری کے دھیمے لہجے کے مقابلہ میں عرفی کا رنگ زیادہ بلند اور زندگی سے بھرپور ہے عرفی کے بعد طالب آملی نے فارسی شاعری کی یہ روایت اسی وقار اور حسن کے ساتھ باقی رکھی وہ جہانگیر کے دربار کا ملک الشعرا تھا اور جہانگیر جیسے صاحب ذوق کا ملک الشعرا ہونا خود طالب آملی کی استادی کا ثبوت ہے۔ غالب عرفی اور طالب سے اتنا متاثر تھے کہ انھوں نے خود اپنا مرتبہ اس شعر میں کہا ہے۔

رشک عرفی و فخر طالب مرد   اسد اللہ خاں غالب مرد

غالب کی پرجوش غزلیں عرفی کے مخصوص طرز کی آئینہ دار ہیں انھیں خود یہ احساس تھا کہ عرفی جس بادۂ شیراز کا ساقی تھا وہ اب صرف غالب کے جام میں موجود ہے۔

کیفیتِ عرفی طلب از طینتِ غالب   جام دگران بادۂ شیراز ندارد[1]

ایران کے دو اور شعرا نے غالب پر گہرا اثر چھوڑا ایک صائب تبریزی اور دوسرے شیخ علی حزین لاہیجانی اول الذکر کے متعلق کہتے ہیں سہ

این جواب آن غزل غالب کہ صائب گفتہ است   در نمودہ نقشہا بی اختیار افتادہ ام

ایران سے ہندوستان آنے والے شعرا میں حزیں اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں وہ ایک درویش صفت اور انسان دوست شاعر تھے جب گردش کرتے کرتے بنارس پہنچے تو وہاں کے روحانی ماحول کر سے اتنا متاثر ہوئے کہ وہیں بس رہے اور وہیں انتقال کیا حزیں کی شاعری پاکیزہ زبان، پرخلوص جذبات اور

---

[1] کلیاتِ غالب ص۲۴۶

اور انسان دوستی کی بہترین مثال ہے غالب ان کی استادی اور مہارتِ فن سے اتنا متاثر تھے کہ انھیں نظیری کے برابر مانتے تھے ایک شعر میں کہتے ہیں ۔

غالبؔ مذاقِ ما نتوان یافتن زما   زو شیوہ نظیری و طرزِ حزیں شناس

ایک جگہ ایک لفظ کے استشہاد کے لئے وہ حزیں کا شعر پیش کرتے ہیں اور انھیں فخر المتاخرین کے لقب سے یاد کرتے ہیں[1]۔ دیوانِ فارسی کے خاتمہ میں اساتذہ کے تتبع اور پیروی اور اپنی عقیدت مندی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں "شیخ علی حزیں بخندۂ زیرِ لبی بیراہہ روی ہای مرا در نظرم جلوہ گر ساخت۔ و زہر نگاہ طالب آملی و برقِ چشمِ عرفی شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبش ھائی نارواد رپای رہ پیمائی من بسوخت ظہوری بہ گرمی گیرائی نفس حرزی بباز وی و توشہ بکرم بست و نظیری لاابالی خرام بہنجار خاصہ خودم بچالش در رفتار آورد"

ہندوستان کے فارسی اساتذہ میں غالب امیر خسرو کے علاوہ کسی کو مسلم الثبوت نہیں سمجھتے تھے اور کہتے "میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے" "فیضی کو لوگ جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے[2]"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں "ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا کہ خسرو قلم رو سخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی وہم طرح سعدی شیرازی ہے۔ منت، بکینج، واقف و قتیل تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجئے ان حضرات میں عالم علم عربیہ کے محقق نہیں ہوں فاضل کہلائیں کلام میں ان کے مزہ کہاں ایرانیوں کی سی ادا کہاں"

غالب کو خود اس بات کا احساس تھا کہ وہ خود ہندوستانی تھے اس وجہ سے وہ ایک خط میں اس طرح صفائی پیش کرتے ہیں ۔

اگر کوئی مجھ سے کہے کہ غالب تیرا مولد ہندوستان ہے میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد پارسی زبان ہے[3] ہندی شعرا میں غالب مرزا عبدل قادر بیدل سے بھی متاثر ہیں بیدل عہد اورنگ زیب کے شاعر ہیں ان کی شخصیت ہر اعتبار سے دلچسپ تھی انھوں نے تقریباً ایک لاکھ اشعار کا ذخیرہ چھوڑا ہے جو خاص طور پر غزل اور مثنوی پر مشتمل ہے بیدل کے کلام میں فلسفہ اور شاعری یا فکر اور فن کا حیرت انگیز امتزاج ہے۔ ان کی مخصوص اصطلاحیں اور مخصوص ترکیبیں بھی انھوں نے تہہ در تہہ خیالات اور احساسات کے اظہار کے لئے جو عبارت اختیار کی وہ منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔

---

[1] فرہنگ امتیاز علی عرشی   [2] یادگار غالب ص ۔۔   [3] ۔۔ بیگم غالب ص ۳۰

[4] غالب نامہ ص ۱۰۹

اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے بعد زبان کی یہ تہہ داری رنگینی کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتی غالب جو طبعاً منفرد اور مشکل پسند تھے بیدل سے بہت کچھ اثر لیا یہ روش فارسی میں بڑی حد تک کھپ گئی کیونکہ اس میں اتنی لچک تھی مگر جب انھوں نے اس کا اردو میں تجربہ کرنا چاہا تو اُردو کی تنگ دامانی ساتھ نہ دے سکی اور یہ کہہ کر رہ گئے کہ طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسداللہ خاں قیامت ہے۔

غالب اور قصیدہ گوئی

غالب کے قصیدوں کی تعداد خاصی ہے اور تقریباً سبھی مدحیہ ہیں لیکن یہ مسلم ہے کہ ان کی قصیدہ گوئی میں وہی حیثیت ہے جو نظیری نیشاپوری کی غالب کے عہد تک قصیدہ گوئی کا ماحول بالکل بدل چکا تھا مغلیہ سلطنت چراغ سحری ہو چکی تھی۔ انگریزوں کی حکومت استحکام پکڑ رہی تھی مگر ان دونوں قصیدہ گو کے ساتھ انصاف کرنے والا کوئی نہیں تھا ایک خزانہ خالی تھا تو دوسرا ذوقِ شعر سے محروم تھا غالب کو قصیدہ لکھتے وقت خود یہ احساس تھا کہ جس بہادر شاہ ظفر کو وہ جمشید مرتبت اور دارا صولت کہہ رہے ہیں اس کی سلطنت لال قلعہ کی چہار دیواری تک محدود ہے اور جن فرنگی حاکموں کی شان میں وہ زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں ان کی مثال اس گنوار رئیس کی ہے جس کی شان میں ایک شاعر نے قصیدہ لکھا رئیس بولا کل انعام لے جانا اگلے روز شاعر پہونچا اور انعام کی درخواست کی رئیس نے کہا کیسا انعام تم نے قصیدہ لکھ کر کہہ کر ہمیں خوش کیا ہم نے انعام کا وعدہ کرکے تمہیں خوش کیا یہی وجہ ہے کہ ان قصیدوں میں وہ امداد جوش نہیں جو مثلاً عرفی یا انوری کے یہاں نظر آتا ہے غالب نے خود بھی ایک جگہ یہ اعتراف کیا ہے کہ میں تشبیب میں تو اساتذہ قدیم تک پہونچ جاتا ہوں مگر مدح میں ان سے پیچھے رہ جاتا ہوں۔

غالب کی قصیدہ گوئی پر سب سے زیادہ عرفی شیرازی کا اثر ہے عرفی ہندوستانی قصیدہ گوئی کا سرتاج ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بعض بعض مقامات پر وہ خاقانی تک بھی بلند ہے غالب کیلئے خاقانی اور انوری کی مثالیں بہت پرانی ہو چکی تھیں اس لئے انھوں نے اگرچہ ان اساتذہ کی زمینیں اپنائیں مگر ان پر بالواسطہ اور بلا واسطہ عرفی ہی کا اثر ہے یہ اثر خیالات اور اندازِ بیان دونوں پر بہت واضح ہے۔ عرفی شیرازی نے جناب امیر کی منقبت میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں بہت سی قسمیں کھائی ہیں اس طرح غالب نے اپنے ایک قصیدہ میں بہت سی قسمیں کھائی ہیں۔ بحر وہی ہے قافیہ بدل دیا ہے۔

بہ رہبری خدیو ہری کہ گرا بد بر سایۂ شمشیر	بہ تشنۂ کہ ستیز د بدشنۂ فولاد
بہ تازہ روی بستانیاں مہر و وفاق	بہ زشت خوی زندانیاں بغض و عناد
بہ انتشارِ شمیم و بہ انقباض مشام	بہ اہتزاز نباتات و بہ انقباض جماد

عرفی نے ایک مشہور قصیدہ میں کہا ہے۔

بکاوشِ مژہ از گورتا نجف بروم ‏ ‏ ‏ اگر بہ ہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار

اسی مضمون کو غالب نے ابرِ گوہر بار میں حضرت علی کی منقبت کرتے ہوئے کہا ہے۔

خوشا عرفی و گوہر افشاندنش ‏ ‏ ‏ با ندازِ دعوی پر افشاندنش

کہ ناگاہ کارِ خود از پیش برد ‏ ‏ ‏ بدشتِ نجف لاشۂ خویشتن برد

چو عرفی سر و برگِ نازم کجا ‏ ‏ ‏ بدعوی زبان درازم کجا

من این کار بر خود گرفتم بہ چشم ‏ ‏ ‏ بہ مژگاں گراو رفت رفتم بہ چشم

اسی طرح غالب کا مندرجہ ذیل عرفی کے شعر کی صدای بازگشت ہے جو عرفی نے شاہزادہ سلیم کی مدح میں کہا ہے۔

چہ گفت گفت کہ ای مخزنِ جواہر قدس ‏ ‏ ‏ چہ گفت گفت کہ ای مطلب بہشت نسیم[1]

غالب اس طرح کہتے ہیں۔

دیگر چہ گفت گفت کہ اے غالبِ حزین ‏ ‏ ‏ دیگر چہ گفت گفت کہ ای رندِ خاکسار

قصائدِ غالب کا بہترین حصہ وہ ہے جس میں ان کا فخر اور تشبیب ہے۔ خاقانی شروانی اور عرفی شیرازی کی طرح وہ بھی اپنے آپ کو خدای سخن اور آفریدگارِ شعر سمجھتے تھے۔ انہیں اس بات کا ملال تھا کہ بے رحم قسمت نے انھیں ایسے دور میں پیدا کیا ہے جب ان کے فن اور فکر کی صحیح قدر کرنے والا کوئی نہیں اور وہ اپنا دل بہلانے کے اس طرح کے اشعار کہتے تھے۔

اگر ز اکبر شہ بود بہرور عرفی ‏ ‏ ‏ وگر ز شاہجہاں بود مایہ دار کلیم (کلیات ص ۲۱۴)

نہ کمترم ز حریفان بہ فن شعر و سخن ‏ ‏ ‏ نہ کمتری ز شہان ماں بجود و خلق عمیم

عمر کے ساتھ غالب کا یہ احساس برتری ترقی کرتا گیا اور انھوں نے اساتذہ قدیم کی ہمسری بلکہ برتری کا دعوی شروع کر دیا جس نظیری کے لئے غزل میں وہ اتنے باداب نظر آتے ہیں اس کے لئے قصیدہ میں کہتے ہیں۔

بفن شعر چہ نسبت ہمین نظیری را ‏ ‏ ‏ نظیر خود بہ سخن ہم منم، سخن کوتاہ

یا خاقانی اور نظامی کے بارے میں کہتے ہیں

---

[1] قصائد عرفی ص ۳

امروز من نظامی و خاقانیم بدہر | دلی زمن بگنجہ و شروان برابر است
سلجوقیم بگوہر و فاقانیم لیکن | توقیع من سنجر و خاقاں برابر است

مثنوی

غالبؔ نے بہترین فارسی مثنویاں لکھی ہیں ان کی مثنویاں بتایت کہتر و بقیمت بہتر کی مصداق ہیں ان سے غالبؔ کی شخصیت اور فن کی بڑی واضح تصویر ابھرتی ہے اس سلسلہ میں مثنوی باد مخالف بہت اہم ہے جو کلکتہ کے حریفوں کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے قاطع برہان لکھ کر غالبؔ نے جو آگ بھڑکائی تھی اسے دوسرے لوگ برابر ہوا دیتے رہے اور اس سے تکلیف وہ صورتِ حال پیدا ہوگئی کہ غالبؔ کی زندگی ناسور بن گئی اس مثنوی میں جس کرب و سوز سے انھوں نے اپنی زندگی کے اس دردناک پہلو کو پیش کیا ہے اس کا جواب صرف فردوسی کے یہاں ملتا ہے۔

ای سخن پروران کلکتہ	ای زبان اوران کلکتہ
اسداللہ بخت برگشتہ	درخم و پیچ عجز سرگشتہ
بہ تظلم رسیدہ است اینجا	بامید آرمیدہ است اینجا
آرمیدن وحید روزی چار	خستہ ای را بہ سایۂ دیوار
کار احباب ساختن رسم ست	میہمان را نواختن رسم ست

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کلکتہ کے بے رحم لوگوں کے سامنے امداد کے لئے ہاتھ پھیلا رہے تھے اور وہ ان کا مذاق اڑا رہے تھے اور یہی احساس تھا جس نے غالبؔ کے انداز میں اتنا کرب پیدا کیا بہرحال غالبؔ نے تفصیل سے اپنے نظریہ شعر اور فن کے نقطۂ نظر پر روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ میں استادانِ فن کا پیرو ہوں اور میں ان سے کس طرح منہ موڑ سکتا ہوں۔

ای تماشائیان ژرف نگاہ	ہاں بگوئید حجۃ للّٰہ
کہ چساں از حزین پیچم سر	ان کجا دو روی بدہر نگر
دل و بر کنز اسیر بر گردم	زان نوآئین صفیر بر گردم
دامن از کف کنم چگونہ را	طالبؔ و عرفی و نظیری را
خاصہ روح روانِ معنی را	آن ظہوری جہانِ معنی را

صد ۱۱

اور چونکہ میں ان کا دلدادہ ہوں اس لئے میری نظر میں قتیل اور واقف۔ کی شاعری کیا وقعت

رکھتی ہے۔

فتنۂ گفتگوی اینا نم — مست لای مبوی اینا نم
انکہ علی کردہ ایں موانف را — چہ شناسد قتیل وو اتفد را

لیکن اگر احباب کو اصرار ہے کہ میں قتیل کی تعریف کروں تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں اس کے بعد غالب نے قتیل کی تعریف میں چند شعر کہے ہیں جو طنز ملیح کی بہترین مثال ہیں اور حقیقت ہے کہ غالب نے قتیل کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس میں ان اشعار سے زیادہ اسکو غارت کرنے والی اور کوئی چیز نہیں۔

می شوم رایہ صلح دلیل — می سرایم نوای مدح قتیل
گرچہ ایراتمیش نخواہم گفت — سعدیٔ ثانیش بخواہم گفت
یک ازایں ہزار بار بجاست — از من و ہم چو من ہزار بجاست
می شوم رایہ صلح دلیل — می سرایم نوای مدح قتیل
خاصہ تہری و پارسی دانش — ہندیاں مرحبط فرمانش

ان ذاتی مسائل کے علاوہ غالب کی مثنویوں سے ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو بہت واضح ہوتا ہے اور وہ ہے ان کی مذہبیت غالب بظاہر مذہبی رسوم کے پابند نہیں تھے نماز روزے سے انھیں یونہی سا لگاؤ تھا شراب ان کی روزانہ خوراک تھی مومن کی طرح انھوں نے جہاد کی آرزو نہیں کی مگر خدا اور رسول اور حضرت علی کے لئے ان کے دل میں بے پناہ محبت تھی اس اعتبار سے ان کی بہترین مثنوی ابر گوہر بار" جو ان کی طویل ترین مثنوی ہے غالب کی خواہش تھی کہ ابتدائی اسلام کے غزوات کو نظم کریں لیکن کبرسنی اور ضعف کے باعث وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے ابر گہربار اسی منصوبہ کی نامکمل شکل ہے مثنوی حمد، نعت، معراج، منقبت علیؓ کے بعد ساقی نامہ اور مغنی نامہ بھی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مثنوی دنیا کے بہترین ادب کا نمونہ کہی جا سکتی ہے اور اس میں غالب کے فکر اور فن کا عروج ہے مثلاً مسلمانوں کا عقیدہ ہے جسم نبی کا سایہ نہیں پڑتا تھا اس بات سے شعراء نے نئے نئے خیالات پیدا کئے ہیں۔ غنی کشمیری کہتے ہیں۔

خوشا عہدی کہ مردم آدم می سایہ را دیدند — غریب است ایں زمان گرید آدم شود پیدا

غالب کہتے ہیں کہ نبیؐ اور علیؓ ایک ہی نور کے دو پیکر تھے اس لئے جب نور ایک تھا اور اس کا سایہ بھی صرف ایک جگہ یعنی جسم علیؓ سے پڑتا تھا۔

نبی را اگر سایہ صورت نداشت — ترو ونداز ضرورت نداشت

دو پیکر دو پیکر دو جا در نمود آمده — اثر ہا بیک جا فرود آمده

دو فرخندہ یار گرانمایہ ہیں — دو قالب زیک نور و یک سایہ بین

بدان اتحادی کہ صافی بود — دو تن را یکی سایہ کافی بود

بہر سایہ کا قد زبالای او — بود از نبی سایہ ہمپائی او

زہی قبلۂ اہل ایمان علی رضؓ — زمین گشتہ ہمسایہ جان علی

یا مثلاً واقعہ کربلا کے بارے میں کہتے ہیں ۔

زخونیکہ در کربلا شد سبیل — ادا کرد وام زبان خلیل[1]

معراج کے سلسلہ میں کہتے ہیں ۔

بہ دور تو شد لن ترانی کہن — فصاحت مکرر نگنجد سخن

ترا خواستنگار است یزدان پاک — ہرا نبہ از لن ترانی چہ باک[2]

ابر گوہر بار میں غالب کا ذاتی غم جس گداز اور درد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔ وہ مثنوی باد مخالف سے زیادہ موثر ہے موخر الذکر میں ایک واقعہ کی تلخی ہے مگر ابر گہر بار میں تو انھوں نے اپنی کربناک زندگی کی تلخیاں نچوڑ کر رکھ دی ہیں ۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے جو انھوں نے خدا کو اشارہ کر کے لکھے ہیں ۔

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم — پرستار خورشید و آذر نیم

نکشتم کسی را بہ ابرا ہمنی — نہ بردم زکس مایہ در رہزنی

مگر می کہ آتش بگورم از دست — بہ ہنگام پروازی مودم از دست

حساب می و رامش و رنگ و بوی — ز جمشید و بہرام و پرویز جوی

کہ از بادہ تا چہرہ افروختند — دل دشمن و چشم بد سوختند

نہ از من کہ از تاب می گاہ گاہ — بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ

افق ھا پر از ابر بہمن ہمی — سفالیہ جام من از می تہی[3]

غالب کو احساس تھا کہ مثنوی میں ان کا درجہ استاد نظامی اور زلالی خوانساری سے بلند ہے چونکہ غالب کا فن کسی کا مرہون منت نہ تھا جبکہ نظامی نے خضر سے فیض پایا اور زلالی نے نظامی سے غالب کہتے ہیں ۔

نظامی نیم کز خضر در خیال — بیا موزم آئین سحر حلال

زلالی نیم کز نظامی بخواب — بہ گلزار دانش برم جوی آب

لہ غالب نامہ ص[illegible] ؎ غالب نامہ ص[illegible]

نظامی کشش نازنا کم کجا | زلالی بود خفتہ خوابم کجا
نیاشم گر از گنجہ گنجم بس است | بہ غم گر چنیں بردہ سنجم بس است

مثنوی میں ساقی نامہ نظامی کی ایجاد ہے ساقی نامہ درحقیقت ایک طرح کا وقفہ ہے جو نفسیاتی اعتبار سے قارسی کے لئے بہت ضروری ہے مگر نظامی کا ساقی نامہ خیالی ہے اس لئے اس کے ساقی نامہ میں قال ہے حال نہیں ہے غالب اس سلسلہ میں بھی اپنی برتری جتاتے ہیں اور ساقی سے کہتے ہیں۔

بیا ساقی آئین جم تازہ کن | طراز بساط سخن تازہ کن
مبادہ نظامی زراہمت برد | بدستان سوی خانقاہت برد
فریبش مخور چوں ہی آشام نیست | ستم دیدۂ گردش جام ہست [1]

رباعیات و قطعات

غالب رباعی کے مردِ میدان نہیں تھے لیکن انھوں نے فخرو مباہات خمریات، غم روزگار، درد عشق اور تصوف پر عمدہ رباعیاں لکھیں ہیں۔ خمریات میں عمر خیام کا اتباع کیا ہے۔ ان کی یہ فخریہ رباعی واقعی ان کے حسب حال ہے۔

گر شعر و سخن بدہر آئین بودی | دیوان مرا شہرت پروین بودی
غالب اگر این فن سخن دین بودی | آن دین را ایزدی کتاب این بودی

غالب کی رباعیات کی زبان صاف اور موثر ہے ان میں غیر معمولی شگفتگی اور گرمی ہے

آن مرد کہ زن گرفت دانا نبود | از غصہ فراغتش بجانا نہ بود
دارد بہ جہاں خانۂ زن نیست درو | نازم بخدا چرا توانا نہ بود [2]

ایک اور رباعی میں شوخی قابلِ ملاحظہ ہے۔

درعالم بی زری کہ تلخ است حیات | طاعت نہ تواں کرد بہ امید نجات
ای کاش ز حق اشارتِ صوم و صلوٰۃ | بودی بوجود مال چوں حج و زکوٰۃ

امید بے جا کا اظہار یوں کیا ہے۔

بازی خور روزگار بودم ہمہ عمر | از بخت امیدوار بودم ہمہ عمر

---

[1] غالب نامہ ص ۱۲۰ [2] یادگار غالب ص ۲۶۹ [3] یادگار غالب ص ۲۶۳ [4] یادگار غالب ص ۲۶۵

بے مایہ بفکر سود ماندم ہمہ عمر　　　نی وعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

غالبؔ کے بہت سے قطعات بھی شوخ اور رندانہ ہیں۔ مثلاً

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار　　　ساقی و مغنی و شرابی و سرودی

زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند　　　حق را بہ سجودی و نبی را بہ درودی[1]

غالبؔ نے نثر فارسی کا خاصہ سرمایہ چھوڑا ہے۔

غالبؔ کی فارسی نثر

روایات فارسی کے مطابق غالبؔ نے بھی نثر مقفیٰ و مسجع لکھی ہے اور مشکل الفاظ کا استعمال جیساکہ رواج تھا کیا ہے غالبؔ کی فارسی نثر کی کتب مندرجہ ذیل ہیں۔

مکاتیب، پنج آہنگ۔ مہر نیمروز، درفش کاویانی قاطع برہان۔ دستنبو۔ کلیات کا دیباچہ اور خاتمہ تقریظیں اور شاگردوں اور احباب کے دواین پر دیباچے وغیرہ۔

غالبؔ نے نثر میں بہت محنت تندہی اور جگر کاری سے کام لیا ہے ان کے اکثر فارسی خطوط میں قوت متخیلہ اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے گویا وہ بھی بلا وزن و اوزان شاعری ہے۔ جس میں نظم کا سا مزہ غزل کا سا رس ہے۔

غالبؔ سے قبل ابوالفضل، فیضی، ظہوری ترشیزی، شیخ علی حزیں لاہیجانی نے بھی نثر نگاری کی ہے۔ غالبؔ نے نثر میں ان حضرات کا تتبع کیا ہے۔

شیخ علی حزیں لاہیجانی نے اپنے دیوان پر جو فخریہ فقرے اپنے کلام کے بارے میں لکھے ہیں۔ غالبؔ نے بھی اپنے کلیات کے دیباچہ میں ویسے ہی فقرہ لکھے ہیں اور جس طرح ظہوری نے ابراہیم عادل کی شاہ تاریخ لکھی ہے اور اس کی مدح کی ہے غالبؔ نے بھی مہر نیمروز میں بہادر شاہ مرحوم کی مدح کی ہے۔

غالبؔ کے یہاں گو کہ عربی الفاظ کا استعمال بہت کم ہے مگر انھوں نے "دستنبو" میں بالخصوص یہ التزام کیا ہے کہ عربی کا کوئی لفظ نہ آنے پائے۔

افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے غالبؔ کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں، فارسی نثر نگاری کا رواج ختم ہو گیا ہے۔

---

[1] یادگار غالب ص۳۱

غالب کی فارسی کے بارے میں خود ان کی رائے اور خاتمہ۔

غالب نے اپنی فارسی شاعری پر جا بجا فخر کیا ہے۔ اور ناظم ہروی کی چند مشہور ابیات پر اضافہ کیا ہے۔

شنیدم کہ در دورہ گاہِ سخن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی — بہ فردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی اور دسر در کفن — بہ خاقانی آمد بساطِ سخن
چو خاقانی از دار فانی گذشت — نظامی بہ ملک سخن شاہ گشت
نظامی چو جام اجل در کشید — سر چتر دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فروشد زکار — سخن گشت بر فرقِ خسرو نثار
زخسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید
زجامی بہ عرفی وطالب رسید — زعرفی وطالب بہ غالب رسید[1]

غالب خود اپنے بارے میں ایک جگہ اور کہتے ہیں۔

بود غالب عندلیبی از گلستانِ عجم — من زغفلت طوطیِ ہندوستاں نامیدمش

اس کے باوجود غالب اس مرتبہ پر راضی نہ تھے مگر شعر نے خود یہ خواہش کی کہ وہ غالب کا فن بن جائے

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب — شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

چنانچہ کہتے ہیں۔

تا زدیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن — ایں می از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است — شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

اور یہ پیش گوئی آج حرف بحرف صادق آرہی ہے۔

گو آج کی تمام شہرت کا دارو مدار ان کی اردو تخلیقات پر مانا جاتا ہے مگر خود انہیں یہ احساس تھا کہ ان کے فن کا اصل جمال وجلال ان کی فارسی نگارشات میں ہے۔

چنانچہ کہتے ہیں۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ — بگذر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من ست
فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال — مانی وارژنگم آں نسخہ ارژنگ من ست

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۱۹۶ غالب نامہ صفحہ ۱۱۳

صیقلی آئینہ ام ابن جوہران زنگ من ست   کی درخشد جوہر آبا... کی است نژست

ہندوستان کے فارسی ادب کی عمارت چار عظیم ستونوں پر قائم ہے۔ امیر خسرو، مرزا عبدالقادر بیدل غالب اور اقبال اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس قدر غالب اپنے پیشرو بیدل سے متاثر تھے اتنا ہی اقبال غالب سے متاثر تھے انھوں نے فارسی ادب میں اپنی تخلیقات کے جو پھول کھلائے ہیں وہ سدا بہار رہیں گے۔

"۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں میں قوم کا سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماورا النہر سے۔ شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا تھا۔ سلطنت ضعیف ہوگئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا بعد میں چند روز حیدر آباد جاکر نظام علیخاں کا نوکر رہا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا کئی برس وہاں رہا وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا وہاں راؤ راجہ بختیار سنگھ کا نوکر ہوا وہاں کسی لڑائی میں بہادری کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔"

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ہی ذریعہ عزت نہیں مجھے

لطیفہ:۔ جب نواب یوسف علی خاں والی رام پور کا انتقال ہوگیا تو مرزا تعزیت کے لئے رام پور تشریف لے گئے۔ نواب یوسف علیخاں کے بعد نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔ اتفاقاً ایک روز نواب کلب علیخاں صاحب لفٹننٹ گورنر سے ملنے بریلی جارہے تھے۔ روانگی کے وقت جہاں اور بہت سے لوگ تھے وہاں مرزا بھی موجود تھے مرزا سے رخصت ہوتے ہوئے نواب صاحب نے رسماً مرزا سے کہا۔

"اچھا مرزا صاحب خدا کو سونپا" مرزا صاحب نے برجستہ کہا۔ حضور غضب ہے۔

نواب صاحب نے پوچھا ـــ کیوں؟

مرزا نے جواب دیا "خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا تھا۔ آپ پھر خدا کے سپرد کئے دیتے ہیں۔

غالب صدی میں اُردو

جاوید وششٹ

اک تماشائے "خلشِ جلوۂ خوں ریز" سہی!
"اے تماشائیِ نیرنگِ تمنا" جاوید!
چشم ہر رنگ میں وا ہونے کی پاتی ہے سزا!

"رنجِ نومیدیِ جاوید" صدی غالب کی
"آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں" وہ بھی
چشمِ اُردو سے چھلکتا ہے بہاروں کا غرور!

وقت وہ آن پڑا ہے تری اُردو پہ اسدؔ!
"دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں"
"شکوہ سمجھو اِسے یا کوئی شکایت سمجھو!"

نامِ اُردو تو ہے دستور میں بھارت کے مگر،
کوئی پردیش؟ علاقہ کوئی اُردو کو ملا؟
کیا ضرورت ہے اِسے یہ تو ہے اک "امربیل"

تنگ نظروں نے محبت کی زباں کو تاکا"
زہر پھر فرقہ پرستی کا فضا میں گھولا'
سخت جاں اُردو ہے غالبؔ کی چہیتی اُردو!

سارے بھارت میں ہر اک سمت چلن اِس کا ہے
آج اُردو ہے سیاست کے مگر کی صیدِ زبوں
حق کی آواز کبھی قتل نہیں ہو سکتی!

بزمِ جمہور کا آغوش، مقامِ اُردو!
عزمِ جمہور کی مشعل ہیں فروزاں تا دُور
آج اُردو کسی دربار کی زینت کیوں ہو!

اور کیا عرض کریں اہلِ جنوں اُردو کے
"ہم ہیں مشتاقِ ستم، ہم پہ جفا اور سہی
تم ہو بے داد سے خوش، اِس سے سوا اور سہی"

عطاءاللہ خاور ہاشمی

غالبؔ کی خمریات

اُردو شاعری میں خمریاتی رنگ فارسی روایت سے آیا ہے۔ عمر خیام کے یہاں غمریات کی حیثیت ایک فلسفہ کی تھی۔ انھوں نے زندگی کے سنگین حقائق اور انسان کی ہستی ناپیدار کو ایک ایسی بے رحم صداقت سمجھا جو اندر ان کے اندر سے سرچشمہ خوشی کو پھوٹنے نہیں دیتی۔ کسی مغربی مفکر کا قول ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر دنیا میں وہ ہر جگہ پابہ زنجیر نظر آتا ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک دن کو اتنی بھی اجازت نہیں کہ آزادی کے ساتھ رقص کر سکے۔ ان کے نزدیک بھی احساس مجبوری اکثر و بیشتر غم زیست اور مصائب حیات کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ خیام زندگی کے ان گنے چنے لمحات کو جو روز ازل سے اپنی تقدیر میں لے کر آتا ہے یونہی رائیگاں کھونے پر تیار نہیں۔ وہ زندگی کا ہر لمحہ ہر پل خوشگوار بنانا چاہتا ہے اور اس دنیاوی نشاط کی مستی کو زندگی کا حاصل سمجھتا ہے۔

برخیز و بیا بتا برائے دل ما
حل کن بجمال خویشتن مشکل ما
یک کوزہ مے بیار تا نوش کنم
زاں پیش کہ کوزہ ہا کنند از گل ما

دوسرے فارسی شعرا بھی زندگی کو شاہد و شراب رقص و موسیقی شباب و مستی اور نیرنگی رنگ و بو سے بامراد اور سرشار و کامران بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ حافظ کی شاعری کا بھی مستانہ وار خرام لوگوں کے دلوں کو گدگداتا ہے۔ انھوں نے معبود کو بھی شاہد رعنا کے روپ میں دیکھا ہے اور اطاعت کو بھی سرخوشی جذبات کا آئینہ دار اور رطلب جمال کی مستی رندانہ بنا دیا ہے۔

اُردو شاعری میں بھی متصوفیانہ رنگ اس پابہ زنجیر ہستی کے لئے آزادی کا پیغام مسرت بنکر آیا۔ معبود کوئی حاکم نہیں رہا۔ اس کا حکم شریعت کسی قید و بند کے نعوذ کی شکل میں ظاہر نہیں ہوا۔ بلکہ ایسا حسن و لطافت پیکر بن گیا جس کے جلووں سے نگاہیں نور بن گئیں اور روح شاداب ہو گئی۔ غالب کی شاعری

کی جڑیں بھی ہر چند کہ اس کلاسیکل شاعری کی زمین میں پیوست ہیں مگر وہ اس میں ایسے گلہائے تازہ کھلاتے ہیں جن کی بہار وقت کی اسیر نہیں رہتی۔ بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا رہا اس کا رنگ و روپ اور نمایاں ہوتا گیا۔ بقول خود ان کے۔

رنگ کھلتا جائے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

حافظ شیرازی کا محبوب اپنے ہاتھوں میں جام لئے آدھی رات ان کے پاس آتا ہے اور سوتے ہوئے جگا دیتا ہے مندرجہ ذیل اشعار میں یہ منظر دیکھئے۔

زلف آشفتہ و خوی کردہ و خنداں لب و مست
پیرہن چاک و غزلخوان و صراحی در دست
نرگسش عربدہ جو و لبش افسوس کناں
نیم شب مست بہ بالین من آمد بنشست
سر فرا گوش من آورد و بہ آواز حزین
گفت کائے عاشق شوریدہ من خوابت ہست
عاشقے را کہ چنیں بادہ شب گیر دہند
کافر عشق بود گر نبود بادہ پرست

غالب بھی اپنے محبوب کو اسی عالم مے نوشی میں دیکھنا چاہتے ہیں مگر معاملات کی تفصیل میں پڑنے کے بجائے فروغ حسن کی اس نالش سے لطف اندوز ہوتے ہیں جو بہ سبب گرمی صہبا پیدا ہوئی ہے۔ غالب کے یہ تمثیلی پیکر (IMAGES) کتنے لطیف اور دلنواز ہیں۔

کہوں کیا گرم جوشی مے کشی میں شعلہ رویاں کی
کہ شمع خانہ دل آتش مے سے فروزاں کی

مے نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب
اے شوق! یاں اجازت تسلیم ہوش ہے

اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

غالب کے تصور کی شوخی ان اشعار میں اور بھی غضب ڈھاتی ہے جب وہ محبوب کو اس عالم سرمستی میں پاکر اس سے کھل کھیلنے کی خواہش دل میں جگاتے ہیں :-

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یا رب !
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

اصغر نے کہا تھا۔

چمن میں کس مزے سے چھیڑتی ہے غنچہ و گل کو
مگر پھر بھی صبا کی پاکدامانی نہیں جاتی

غالب کی خمریات کی یہی پاکدامانی ان کو جوش، مجاز، فراق، داغ اور دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے وہ شراب کو غم روزگار کا مداوا نہیں بناتے بلکہ وہ شراب کو بھی دنیا کی دوسری رنگینیوں کی طرح قبول کرتے ہیں۔ وہ نہ بدمست شراب ہیں نہ شراب طہور کے قائل۔ ان کے یہاں شراب زندگی کی رونق بن کر آئی ہے۔ ضرورت بن کر نہیں۔ نہ شراب ان پر حاوی ہے اور نہ وہ خود نشہ کے غلام ہیں۔ جس طرح دوست احباب کا خلوص عیار طبع خریدار کی قدرشناسی شوخ محبوب کی عشوہ گری حفظ و ضعداری کا بانکپن نیرنگیٔ عالم کی طرفگی ان کے لئے آرائش حیات کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اس طرح بادہ ناب بھی ان کے ہاتھوں کی لکیروں کو رگ جان بنا دیتی ہے۔ وہ ان کی تمناؤں کو جلا بخشتی ہے مگر ان کی غذا نہیں بنتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شراب سے رنگارنگ مختلف النوع اور گوناگوں قسم کی مسرتوں کو حاصل کرتے ہیں کبھی شراب کو قابل پرستش بنا دیتا ہے یہ قوس قزح ان کے اشعار میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

شراب فروغ حسن کا سبب ہے۔ یہ اشعار آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں اب دیکھیے حسن کی مستی اور رنگینی شراب کو کس طرح حیات افروز اور پر نور دیتی ہے۔

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسب رنگ فروغ
خط پیالہ سراسر نگاہ گل چیں ہے
خیال جلوہ گل سے خراب ہے میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا
شیشے میں نبض پری پنہاں ہے موج بادہ سے

موج گل سے چراغاں ہے گزرگاہ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موج شراب

عروج نشہ ہے سرتا قدم قد چمن رویاں
بجائے خود وگرنہ سرو بھی مینائے خالی ہے

اب ان اشعار کو بھی دیکھیے جب شراب عشق کے ولوں کو ابھارتی ہے اور خاکستر جذبات میں چھپی ہوئی چنگاری کو ہوا دے کر شعلہ جوالا بنا دیتی ہے۔

قطرہ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خط جام مے سراسر رشتہ گوہر ہوا

ذرہ ذرہ ساغر مے خانہ نیرنگ ہے
گردش مجنوں بہ چشمک ہائے لیلی آشنا

مستی بہ ذوق غفلت ساقی ھلاک ہے
موج شراب یک مژہ خواب ناک ہے

وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

جاں فزا بادہ ہے جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہوگئیں

بے مے کسے ہے طاقت آشوب آگہی
کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کا

شراب جہاں عشق میں روح پھونکتی ہے۔ وہاں عشق بھی شراب کو حیات جاوداں بخش دیتا ہے۔ غالب کے یہاں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جب شراب ان کے لیے حسن بن جاتی ہے۔ وہ شراب کو منور اور روشن دیکھتے ہیں۔ جس کی شعاع تو بر زندگی میں جگمگاہٹ بکھر آتی ہے۔ شراب کی تقدیس بھی جذبہ عشق سے قائم ہوئی ہے۔ عشق ہی اس کی پرستش کرتا ہے عشق ہی اسکو چاہتا ہے یہی علم بغاوت اٹھاتی ہے کبھی اچھی بھلی توبہ توڑ ڈالنے پر اکساتی ہے اور کبھی تنگ بخشی ساقی گردوں کا گلہ کراتی ہے۔ کبھی مجبور ہو کر قرض کی پینے پر مجبور کرتی ہے اور اگر بالفرض محال قرض کی بھی نہ ملے تو پھر اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ کہلواتی ہے عشق شراب کو بارگاہ تقدیس میں پہنچاتا ہے۔

شرح ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسم گل
رہبر قطرہ بہ دریا ہے خوشا موج شراب

یعنی بہ حسب گردش پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیئے

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے　　　غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

عشق جب شراب میں حسن تلاش کرتا ہے اور اس کے جلوہ رنگین سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

چار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو
موج گل موج شفق موج صبا موج شراب

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر آئینہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

ساغر جلوہ سرشار ہے ہر ذرہ خاک
شوق دیدار بلا آئینہ سامان نکلا

شرر فرصت نگہ سامان گردش ہیچ پیمانہ محفل کا
ہوا وصال سے شوق دل حریص زیادہ
لب قدح پہ کف بادہ جوش تشنہ بھی ہے

لب قدح پہ کف بادہ جوش تشنہ بھی ہے غالب کے جمالیاتی ذوق کا نقطہ عروج ہے

اے خوشا وقتے کہ ساقی یک خمستان وا کرے
تار و پو و فرش محفل پنبہ مینا کرے

انجمن چسمت گوہر آگیں فرش
نور مے ماہ ساغر ہمیں

عشق جب شراب کو پرستش کی حد تک عزیز رکھنے لگتا ہے اور اس میں ادائے معشوقانہ تلاش کرکے اس کے ناز اٹھاتا ہے۔

بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یک بار امتحان ہوس بھی ضرور ہے
اے جوش عشق ! بادہ مرد آزما مجھے

اگر آسودگی ہے مدعائے رنج بے تابی
نثار گردش پیمانہ مے روزگار اپنا

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے تو مرا جام سفال اچھا ہے

عشق جب شراب کی طلب اور خواہش کرتا ہے۔

ہے زور قدح وجہ پریشانی صہبا
یک بار لگا دو خم مے مرے لبوں سے

مے پرستاں! خم مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
غم سے جب ہوگئی ہے زیست حرام

عشق جب شراب کی مستی کو چشم تصور سے دیکھتا ہے۔

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موج ہستی کو کرے فیض ہوا موج شراب۔

صاف دردکش پیمانہ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

عشق جب اس لال پری کی طرفداری میں شیخ کے مقابلے پر آکھڑا ہوتا ہے اور اس کو چڑانے کے لئے اپنی خوش قسمتی شیخ کی بد نصیبی شراب کی تعریف اپنی وسیع المشربی اور انسان دوستی کی قدروں کی عظمت کا احساس دلاتا ہے اور اس کے عقائد کو وہم پرستی اور اس کی طرز فکر یا مذہب کی پابندیوں کا خاکہ اڑاتا ہے۔ اگرچہ یہ ایک روایتی انداز ہے مگر غالب اپنی طنزیات کو یہاں بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کے طنز میں تیکھا پن اور نشتریت اس کے انداز بیاں میں توانائی اور ندرت ہے۔ جو شگفتگی کے باوجود اپنا اثر نہیں کھوتی۔ وہ ان مضامین میں ایسا مضحکہ خیز پہلو ڈھونڈ نکالتے ہیں جو ایک طرف رندوں کی ٹولیوں کو لوٹ پوٹ کر دیتا ہے دوسری طرف اس سے شیخ کے ماتھے پر غصہ کی شکن ہی نہیں پڑتی۔ بلکہ اس کے عقیدوں میں زلزلہ سا آجاتا ہے۔

وہ چیز جس کیلئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم
دھوئے دھبے جامہ احرام کے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

طاعت میں تا رہے نہ مے انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

حالاں کہ ہے یہ سیلی خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشہ سے کا گمان ہے

زمزم پہ ہی چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے
آلودہ مے جامہ احرام بہت ہے

غالب کے ان اشعار میں شراب ایک شے بے حاصل کی طرح وارد نہیں ہوئی۔ انھوں نے مے کشی کو بامقصد کہا ہے۔

نشہ کے پردے میں ہے محو تماشائے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سر نشو و نما موج شراب

یہی وجہ ہے کہ نشہ ان کے ذہن پر چھا کر بے نیاز کون و مکاں نہیں بناتا۔ ان کی بے خودی یا ان کا عالم سرور بھی محو تماشائے دماغ ہوتا ہے اور اس کی نوعیت اور نشو و نما صرف شراب کے ذریعہ ممکن ہے۔

اب وہ عالم بھی دیکھئے جب شیخ سے نپٹنے کے بعد اپنے ساقی مجازی سے بھی پینے کو نہ ملے اور ساقی گردوں بھی ان کے ظرف قدح خوری کی پرواہ نہ کرے۔

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

مے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

مے عقیدت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

غالب کی خمریات کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ ہم اس امر کا اندازہ نہ کریں کہ غالب کے شعور میں شراب کس حد تک داخل ہو چکی تھی غالب کا ایک شعر ہے۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہاں لفظ بادہ و ساغر بطور کنایہ استعمال ہوا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ غالب کے فکر و خیال میں ساغر و مینا کی ایک حسین دنیا آباد تھی۔ انھوں نے مے کشی اور آلات مے کشی دونوں سے خوب خوب کام لیا ہے۔ ساغر۔ شیشہ۔ پیمانہ۔ مینا۔ شراب۔ موجِ بادہ ناب۔ خطِ ساغر۔ وغیرہ ان کے یہاں الفاظ کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ایک خیال کی۔ ایک تصور کی اور بڑی حد تک ایک تمثیلی پیکر کی صورت میں ان کے ذہن کے اندر نشو و نما پاتے ہیں۔ یہی پیکر ان کے اظہارِ خیال میں ممد و معاون ہوتے ہیں اور بعض اوقات ان کے مختلف النوع خیال آرائیوں میں ایسی گلکاریاں ہوتی ہیں جیسے ان کے تحت الشعور میں ایک بزمِ مے و مینا سجی ہوئی ہے اور وہ اس میں سے جس شے رنگین کو چاہیں حسبِ ضرورت اپنے تصرف میں لے آئیں۔ ان کے خیالوں کی ندرت اور ان کے بیان کی لطافت بھی زیادہ تر اسی شے لطیف کی مرہونِ منت ہے۔

مندرجہ ذیل مثالوں سے یہ بات اور واضح ہو جائے گی اور یہ ماننا ہی پڑے گا کہ اگر دوسروں نے نہیں تو غالب نے ضرور مشاہدہ حق کے اظہار میں ساغر و مینا کا سہارا لیا ہے ایک قصیدے کی تشبیب میں طلوعِ آفتاب اور شفق زارِ منظر کے لئے ان کی تشبیہات ملاحظہ فرمائیں۔

صبح آیا جانبِ مشرق نظر اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب رد سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے — رکھ دیا ہے ایک جام زر کھلا

غالب کے ذہن میں خمریاتی رنگ اس طرح رچ بس گیا ہے کہ خواہ کوئی عنوان ہو اس میں اس کی جھلک ضرور آجاتی ہے۔ در درح ڈلی قطعے میں جہاں انھوں نے اس چکنی ڈلی کے لئے اور بہت سی اچھوتی اور نادر تشبیہات صرف کی ہیں وہیں یہ شعر بھی تحریر کیا

صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہا نماز
میکدے میں اسے خشت خم صہبا کہیے

دلچسپ بات یہ ہے کہ مہا نماز کے مقابلے میں خشت خم صہبا کو کس خوب صورتی کے ساتھ لا کھڑا کیا ہے" "مثنوی در صفت انبہ" میں انکا دماغ کئی بار اس طرف منتقل ہوا ہے۔ قصیدہ میکلوڈ بہادر کا ایک شعر ہے

جس بزم میں کہ ہو انہیں آئین مے کشی
واں آسمان شیشہ ہے آفتاب جام

انھوں نے مناظر فطرت کی آرائش میں تزئین نقش و نگار بھی کی ہے۔ انھوں نے زندگی کو بے ثبات اور ناپائیدار سمجھ کر غرق جام و سبو نہیں کیا۔

مختصر یہ کہ غالب کی خمریاتی شاعری اپنے ایک نئے انداز میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے جس میں نہ بدمستی ہے نہ سیاہ مستی نہ محویت کا وہ عالم ہے جس سے اپنے وجود کا بھی احساس نہ رہے نہ کھوئے جانے اور نہ بھٹکنے کی سی کیفیت ہے لیکن پھر بھی انکی خمریات میں ایک لہک ہے۔ کیف بے سر شاں کی نشاط ہے۔ دیدہ و دل کے طرب انگیز نغمگی اور سحر کن فضائے لطیف ہے۔ تمناؤں کی بالیدگی۔ امنگوں کی لہلہاہٹ اور شباب و شعر کی بزنائی ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے خمریاتی رنگ سے خیال آرائی بھی کی ہے اور زندگی کے بصیرت افروز مرقعے بھی کھینچے ہیں۔

ھلال رامپوری

تضمین

(بر غزل مرزا اسد اللہ خاں غالب مصرعے ہلال رضوی)

کہا میں نے جو نیتا لیکے ٹھیکے کی رقم نکلے کوئی خواہش نہیں ابتو سب ارمان کرم نکلے
سُنا اور سُن کے فرمانے لگے ہاں محترم نکلے ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

چلا بھی گر مرض برت اپنا جلوہ گاہ پُر فن پر بلیڈ ہو جائے گا جب تُو تو جالیٹوں گا مدفن پر
رہے گا ڈاکٹر کی جیب یا نرسوں کے دامن پر ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اُس کی گردن پر
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

کہا تھا راشننگ والوں نے ہم ہیں بھوک کے ضامن طلب نے گیہوں کی راشن آفیسر یہ دکھایا دن
پھٹے کپڑے گھر آئے جو نہ ممکن تھا ہوا ممکن نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

الیکشن میں ہر اک ووٹر سے باتیں کیں ٹھکانے کی نئے کی منتیں کیں تو خوشامد کی پرانے کی
غرض ہر اک کوشش کی انہیں کے جیت جانیکی ہوئی جن سے توقع خستگی میں داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے

ہر اک لیڈر یہ کہتا ہے بھلا میں اور ناکامی ہوں اپنے عہدہ کا حافظ ہے زندہ مجھ سے خیامی
مری پکی بھی پکی ہے نہیں رہتی کوئی خامی ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام و جم نکلے

تو نقشہ ہے تو ماہر ہے فریب قلب سازی کا ۔۔۔ کبھی پیارا برہمن کا کبھی پیارا نمازی کا
کبھی گو تیری ٹھوڑی پہ دھوکا ہے ایازی کا ۔۔۔ بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا

اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

لرز تو جائے رشوت کچھ تو دولت کو بخار آئے ۔۔۔ بدل تو جائیں یہ حالات جھنتا تو سکوں پائے
مناسب ہے کہ اندراجی کو ہر اک کی خبر جائے ۔۔۔ مگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

نہیں ممکن کہ چاہے بیعت پیر مغاں واعظ ۔۔۔ نہیں ممکن کہ ہو جائے بڑھاپے میں جواں واعظ
ہلاک آیا نہ ہو لینے ہمارا امتحاں واعظ ۔۔۔ کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ

پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالبؔ کے ایک خط کا اقتباس

"جب تک نہ سمجھو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے۔ سنو۔ عالم دو ہیں، ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لمن الملک الیوم؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے۔ للہ الواحد القہار۔ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیجکر سزا دیتے ہیں چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۸۔ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈالدی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈالدیا۔

فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا برسوں کے بعد میں جیل خانہ سے بھاگا تین برس بلاد شرقیہ پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔"

Annual Prize Distribution

1968-69

Chief guest Mrs.-Tarkeshwari Sinha M. P.

Anisur Rehman (Secy. Bazm-e-Adab)

Zafar Mehmood vice President (union)

Shamsuddin (Jt. Secy. Persian)

Qazi Azhar Ahmed (Secy. Arabic)

ANNUAL PRIZE DISTRIBUTION
1968-69

Shamsul Haq
Debator

Ubaidur Rehman
Secy. (Persian)

ANNUAL MUSHAIRA
1968-69

Dr. Aslam
President Bazm-e-Adab
Thanking the poets, guests and audience.
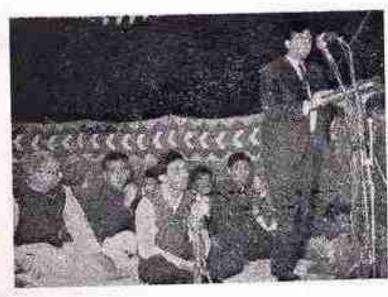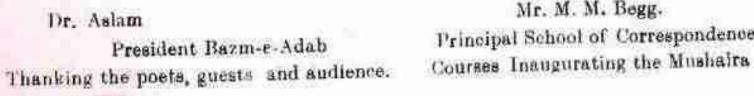
Mr. M. M. Begg.
Principal School of Correspondence
Courses Inaugurating the Mushaira

معروف الحسن صدیقی

غالب :- ایک تجزیہ

ہر ایک تخلیق اپنے خالق کے گرد و پیش کی آئینہ دار اور اس کے جذبات اور احساسات کی ترجمان ہوتی ہے کسی بھی تخلیق کے آئینہ میں ہمیں اس دور کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی نیز خالق کے ذاتی حالات اور ماحول کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ دراصل ماحول اور حالات سے فرار نا ممکن ہے ایک عام آدمی بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا نتیجہ کے طور پر اس کی زندگی میں اس کا عکس جھلکتا ہے۔ فنکار ایک عام انسان کے مقابلہ میں زیادہ بیدار اور تخلیقی ذہن لے کر پیدا ہوتا ہے اس وجہ سے وہ شعوری اور لاشعوری طور پر حالات کے اثرات قبول کرتا رہتا ہے اور یہی احساسات و تاثرات تخلیق کے لئے بنیادوں کا کام کرتے ہیں جن پر وہ اپنے فن کے محل تعمیر کرتا ہے۔ اگر ہم کسی بھی ادبی تخلیق کو تنقید کی کسوٹی پر رکھ کر اس کا تجزیہ کریں تو ہمیں قدم قدم پر اس دور کے معاشرے کے نقش مل جائیں گے اور وہ تصویریں بھی مسکراتی ہوئی ملیں گی جو وقت کے ساتھ ساتھ دھندلی ہو گئی ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ کسی بھی فنکار کا اجمالی جائزہ لینے سے قبل اس دور کے حالات کے آئینہ میں فنکار کو دیکھا جائے

غالب ہندوستان کا واحد فنکار ہے جس کے متعلق اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اگر اس کو جمع کر کے ایک کمرہ میں رکھ دیا جائے تو اس پر ایک لائبریری کا گمان ہو سکتا ہے۔ غالب کے مداحوں نے غالب کو افلاک کی ان بلندیوں پر پہونچا دیا جہاں شاید تخیل کے پر بھی جلے بغیر نہیں رہ سکتے دوسری طرف غالب کے مخالفوں نے اُن کے فن سے قطع نظر صرف اُن کی بادہ نوشی اور زندگی کے چند پہلوؤں کی آڑ لے کر اُن کے ساتھ نا انصافی کی اس میں شک نہیں غالب کی زندگی میں چند نقوش ایسے ضرور مل جاتے ہیں جن پر مخالفین کو لب کشائی کی جرأت ہوتی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ غالب کے یہاں زندگی کی وہ روشن حقیقتیں بھی ملتی ہیں جو نہ صرف اس دور کے ادب بلکہ ماضی اور مستقبل کے ادب میں بھی ان کی انفرادیت کا حق تسلیم کراتی ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض مرتبہ ان کے عقیدت مند اس درجہ آگے بڑھ جاتے ہیں کہ انھیں انسان سے بالاتر کوئی مخلوق تصور کرنے لگتے ہیں مثال کے

طور پر بجنوری کا یہ اعلان "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک مقدس وید اور دوسرا دیوانِ غالب" دراصل غالب کی شخصیت ایسی ہمہ رنگ شخصیت ہے کہ اس کو جس پہلو سے دیکھا جائے ایک نئی تصویر نظر آتی ہے اور یہی رنگارنگی اور ہمہ رنگی غالب کے عقیدت مندوں اور مخالفین غالب کے نظریات میں ایک تضاد کی صورت اختیار کر لیتی ہے دراصل یہ سب بھی اس دور کے معاشرے، سیاسی، سماجی حالات اور اخلاقی اقدار اور کردار کی دین اور گرد و پیش کے تقاضوں کا ردِ عمل ہے اس وجہ سے غالب پر حرفِ اول کہنے سے قبل ضروری ہے کہ غالب کے وقت کے ہندوستان اور خاص طور پر غالب کی دلی کا ایک اجمالی جائزہ لیا جائے تاکہ اس جائزہ کی رہنمائی میں غالب کے فنِ شعر گوئی کو سمجھنے میں مدد مل سکے کیونکہ غالب نے بھی جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا وہی سپردِ قلم کر دیا وقت کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں بھی تغیر ملتا ہے اور بعض جگہ یہ تغیر تضاد کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

خوش قسمتی یا بدقسمتی سے غالب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ سیاسی، تہذیبی اور سماجی اعتبار سے ایک منتشر اور بے ربط ماحول تھا۔ ایک سیاسی نظام دم توڑ رہا تھا دوسرا نظام اس کی آخری ہچکی کا منتظر تھا۔ ایک معاشرت کی بنیادیں ہل چکی تھیں دوسرا معاشرہ اس لرزتی ہوئی دیوار کے گرنے کے انتظار میں تھا تاکہ اس کے ملبے کے ڈھیر پر اپنے خوابوں کی نئی عمارت تعمیر کرے وہ تہذیب جس نے ہندوستان کو جینا سکھایا تھا جس نے انسان کو انسان کی تصویر دکھلائی تھی جس نے حیوان اور انسان کا فرق بتلا کر زندگی کا سلیقہ بخشا تھا جس کے روشن کئے ہوئے چراغ نے مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک تہذیب کی روشنی پھیلائی تھی آج اس تہذیب کا وہی چراغ آندھیوں کی زد پر تھا۔ ہوائے تند کا ہر ایک جھونکا اس عزم کے ساتھ آتا تھا کہ اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دے۔ مغلوں کے اقبال کا سورج گہن میں آچکا تھا اب وہ صرف نام کے حکمراں رہ گئے تھے طاقت ختم ہو چکی تھی تیموری خاندان کا لہو بابر، ہمایوں، اکبر اور اورنگ زیب کی رگوں سے ہوتا ہوا بہادر شاہ ظفر کی رگوں تک پہونچتے پہونچتے سرد ہو چکا تھا شاہجہانی دور کا سکون اور اطمینان ایک انقلاب کی زد میں آچکا تھا اورنگ زیب کی وسیع حکومت آج محدود ہو کر لال قلعہ کی چہار دیواری میں نظر بند ہو چکی تھی۔ اس طرح صدیوں کی نی بنائی عظیم اور پروقار حکومت خاک میں مل رہی تھی کسی بھی حکومت کی کمزوری سے جو انتشار اور افراتفری وابستہ ہو سکتی ہے وہ اس ماحول میں عام تھی۔ عوام زندگی سے مایوس اور بیزار نظر آتے تھے وہ حال کی تاریکی میں مستقبل کی جھلک دیکھنے سے بھی قاصر تھے زندگی میں استواری کا تصور تک نہ تھا افراد خود کو غیر محفوظ سمجھتے تھے اس سیاسی انتشار نے زندگیوں کو سماجی طور پر بالکل کھوکھلا کر دیا تھا بے عملی عام تھی عوام اس درجہ بیزار تھے کہ وہ انجام سے بے خبر سفینۂ حیات کو وقت کے تیز دھارے کے سپرد کر چکے تھے جد و جہد اور فکر کا فقدان تھا البتہ تغیر کا عمل جاری تھا انفرادی

نئے سماجی حالات پیدا ہو رہے تھے نئی نئی اقدار کا وجود عمل میں آ رہا تھا کچھ لوگ ان نئی قدروں سے لاشعوری طور پر ہم آہنگی پیدا کر رہے تھے لیکن کثرت ایسی تھی جس کے لئے یہ تغیر عجیب و غریب تھا اور نتیجہ کے طور پر وہ اپنے آبائی ورثے اور سماجی روایات کو ایک شیر خوار بچے کی طرح سینے سے لگائے رکھنا چاہتے تھے۔ انھیں اپنے اس صدیوں کے سرمائے کے لٹ جانے کا انتہائی غم تھا لیکن اشک شوئی کی صورت نظر نہ آتی تھی لوگ ماتم کرتے تھے آنسو بہاتے تھے لیکن مایوسی اور بے عملی نے انھیں اس درجہ بے حس کر دیا تھا کہ وہ جدوجہد سے بے نیاز خود کو حالات کے سپرد کر بیٹھے تھے لیکن ایک امید موہوم کا عکس ضرور نظر آتا تھا۔

تہذیب کی جو عظیم روایات شاہانِ مغلیہ نے قائم کی تھیں ان کا ارتقاء نہ صرف رک گیا تھا بلکہ زوال پذیر تھا ظاہر ہے یہ تہذیب سب کو عزیز تھی اور اس کی تباہی ایک غم مشترک کی حیثیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے سب کی آنکھیں نم تھیں۔ تہذیب کا خورشید نو طلوع ضرور ہو چکا تھا لیکن ابھی انتشار کی تاریکیوں کا باہر نہ آیا تھا۔۔ زندگی کو بدلنے کی خواہش نامعلوم طور پر ظہور میں آ رہی تھی ان خواہشات نے نیم مذہبی اور نیم سیاسی تحریکوں کی صورت اختیار کر لی تھی لیکن ان تحریکوں کے سامنے بھی کوئی واضح نصب العین نہیں تھا کارواں ایک نئے سفر کی طرف روانہ ہو رہا تھا لیکن منزل کا تعین نہیں ہو سکا تھا ظاہر ہے اس بے ربطی اور انتشاری کیفیت سے کامیابی کی توقع بے سود تھی

پرانے جاگیردارانہ نظام کی بنیادیں زلزلوں کی زد پر تھیں لیکن ان کی جگہ کوئی نیا مستقل اور مربوط نظام نہ لے سکا تھا۔ نئی جاگیرداری کے لئے راہیں ہموار ہو رہی تھیں لیکن ابھی اس نئے نظام کا بیڑا پار نہیں ہوا تھا اس وجہ سے ہر شخص مالی طور پر پریشان، مادی اور ذہنی طور پر پریشانی اور زبوں حالی کا شکار تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ مستقبل کس لباس میں آئے گا زندگی کونسی کروٹ اور حالات کونسا رخ بدلنے والے ہیں۔ زندگی مر مر کے جیئے جانے کا نام ہو کر رہ گئی تھی پورا ماحول یاس و حرماں اور غم و اندوہ کی چادر میں لپٹا ہوا سسک رہا تھا۔

غالب اسی ناگفتہ ماحول کی پیداوار ہیں ان کی شخصیت پورے طور پر اس کی آئینہ داری کرتی ہے ان کا فن اس کا ترجمان ہے اور ان کے خیالات و نظریات بھی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں غالب صرف اپنی انفرادیت ہی میں گم نظر نہیں آتے۔ ان کی آنکھیں صرف اندر کی ہی طرف نہیں دیکھتیں بلکہ وہ اپنی ذات سے باہر نکل کر بھی دیکھتے اور عام زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس زمانے کی اجتماعی زندگی کا پورا نقشہ ان کے ذہن کے پردہ پر موجود تھا ان کی آنکھیں تمام نشیب و فراز دیکھتی تھیں ان تمام حالات سے منہ موڑنا انسانی فطرت اور خاص طور پر غالب جیسے حساس فنکار کے لئے ممکن نہ تھا چنانچہ انھیں حالات نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اپنی غزلوں میں حالات کی ترجمانی کریں نتیجہ کے طور پر ان کا فن اسی معاشرے کا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے جس میں جگہ جگہ تجدید کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے جس کے آئینہ میں ہمیں غالب کے ترقی پسند رجحانات کے نقوش مسکراتے نظر آتے ہیں اور غالب کے ذکر کی اس منزل کی ایک دھندلی سی تصویر کا بھی عکس ملتا ہے جو انھوں نے اپنے ذہن

میں تعین کی تھی یا جس کے وہ خواہش مند تھے۔

غالب کے دادا سمرقند چھوڑ کر دہلی آئے تھے گو یہ وہ دور تھا جب دہلی تباہی کے باوجود ہندوستان کو درس تہذیب دے رہی تھی لیکن غالب کو احساس تھا کہ ہندوستان میں وہ بات کہاں جو ایران کے ترقی یافتہ دور میں رچی تھی چنانچہ "مہر نیم روز" کے دیباچہ میں انھوں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "میرے بزرگوں کا یہاں آنا ایسا تھا جیسے پانی اوپر سے نیچے کو آتا ہے۔" غالباً غالب کا یہ خیال سلجوقیوں کے عروج یافتہ دور اور شاہانہ مغلیہ کی آخری بدحالی کا ردعمل ہے اور اسی سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ الفاظ لکھے ہیں۔ غالب کو اپنے خاندان اور باپ دادا کے وقار پر فخر تھا۔ ان کی انفرادیت پسندی نے بار بار انھیں اس کے اظہار پر مجبور کیا اور ان کے قلم نے وہ کچھ لکھا جو غالب کی روح کو بے نقاب کرتا ہے

غالب کا گھرانہ ایک ترکوں کا ایک کھاتا پیتا گھرانہ تھا جو صرف پچاس سال قبل ہی سمرقند چھوڑ کر ہندوستان آیا تھا غالب کے اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا جس میں انھوں نے بیش بہا کارہائے نمایاں انجام دیئے اور انھیں کارناموں نے انھیں سلاطین وقت کے قریب تر کر دیا ان کی ننھیال بھی کافی دولت مند تھی۔ باپ اور چچا کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا اس وجہ سے ان کی جوانی آزادانہ بسر ہوئی اور انھیں ایک طرح کی بے فکری حاصل رہی لیکن اس دولت اور بے فکری نے انھیں اپنے طبقہ میں محدود کر دیا اور ان حالات نے بعد میں کافی حد تک غالب کے نقادوں کے لئے مواد فراہم کیا۔ یہ ضرور ہے کہ حالات کی وجہ سے غالب کی ابتدائی تعلیم رسمی حدود کو پار نہ کر سکی لیکن ان کے ذاتی مطالعہ نے نہ صرف اس خلیج کو پر کیا بلکہ انھیں امتیاز بخشا۔ آج کل کچھ نقاد غالب کو کم پڑھا لکھا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب وہ ہمیں مولانا فضل خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، حکیم احسن خاں، شیفتہ، مومن اور صہبائی جیسے جید عالموں کی صحبت میں نظر آتے ہیں تو ہمیں غالب کی علمی صلاحیتوں اور بیدار مغزی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

غالب کی آزادی میں پہلی رکاوٹ ۱۸۱۰ء میں صرف ۱۳ سال کی عمر میں ان کی شادی تھی جس نے غالب کے الفاظ میں ان کے پاؤں میں بیڑی ڈال دی اور وہ ایک زنداں میں قید ہو کر رہ گئے۔ غالب کو شاعری ورثہ میں نہیں ملی تھی ان کے باپ دادا تلوار کے دھنی تھے غالب تلوار کے دھنی تو نہ ہو سکے لیکن قلم کے دھنی ہو گئے۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

غالب شعور شعر گوئی ازل سے لے کر آئے تھے جو وقت کے ساتھ ساتھ نکھرتا گیا۔ غالب کو ذوق شعر گوئی آگرہ سے ہی تھا اس کے بعد وہ دہلی کی لٹتی ہوئی بہار دیکھنے آ گئے اس خزاں رسیدگی کے باوجود اس اجڑے چمن میں کچھ گل تر یا نیم تر باقی تھے عالموں کا مجمع اور شاعروں و سخنوروں کا ایک ہجوم تھا تباہی کے باوجود دلی میں ایک عظمت باقی

تھی جو قدیم جاگیردارانہ تصورِ حیات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھی۔ ہر نظام کا اپنے زوال کے زمانہ میں تضاد کا شکار ہونا ناگزیر ہے زندگی کے تقاضے انسان سے کچھ اور مطالبے کرتے ہیں لیکن ماضی کی عظمت تصورات میں کچھ اور دنیا بساتی ہے چنانچہ انسان اسی تضاد اور انتشار کا شکار رہتا ہے دلی نے بہت سے انقلاب دیکھے لیکن پھر بھی کسی نہ کسی حد تک جاگیردارانہ نظام سے لپٹی رہی۔ جنگ آزادی میں (جس کو عرف عام میں غدر کہا جاتا ہے اور بدقسمتی سے غالب نے بھی اس کو غدر ہی کہا) ہندستان کے اس جاگیردارانہ نظام کو شکست ہوئی اور اس جاگیرداری کے ان کھنڈرات پر نئے محل تعمیر ہونے کے اور کائنات نئے سانچے میں ڈھلنے لگی۔

اس دور میں غالب نے زندگی کے بڑے تجربے کیے۔ پنشن بند ہو جانے کی وجہ سے اس سلسلے میں انھیں کلکتہ جانا پڑا یہ سفر ان کی ذہنی تشکیل میں کئی خصوصیات کا حامل ہے یہاں وہ معاشی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں اور پنشن کے اجرا کی خاطر انگریزوں کی مداح گوئی میں وہ قصیدے لکھتے ہیں جن کی مثال شاید فارسی میں بھی مشکل سے ملے۔ لیکن ان قصائد میں فن سے قطع نظر خوشامد اور مقصد برآوری پیش نظر دیا گیا ہے۔ غالب کی انگریزوں سے ویسے بھی ملاقات تھی اور چند یورپین ان کے حلقۂ احباب میں بھی تھے لیکن پنشن کے جھگڑے اور عدالتوں کی مسلسل حاضری نے انھیں انگریزوں کو اور قریب سے دیکھنے کے مواقع فراہم کیے بنارس اور لکھنؤ کا سفر بھی ان کی زندگی میں اہم خصوصیات کا حامل ہے۔ اسی دور میں انھیں بنگال سے پھوٹتی ہوئی نشاۃ ثانیہ کی کرنیں نظر آئیں جن سے ان کا ذہن بدلا گو اس وقت تک انگریز محسوس کر رہے تھے کہ ابھی ہوا سازگار نہیں ہے وقت کی ایک کروٹ ان کے ارادوں کو چکنا چور کر سکتی ہے لیکن کلکتہ میں یہ سب کچھ نہ تھا وہاں کی حسین عمارتوں اور پری چہرہ حسینوں نے غالب کا دل موہ لیا اور وہ وہاں کی چہل پہل سے مبہوت ہو کر رہ گئے بنارس کے حسین مناظرِ فطرت نے ان کے حسن پرست دل پر کاری زخم لگایا اور وہ ان سب حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کلکتہ کے دو سال کے قیام نے ان کی زندگی اور فن کا رخ کافی حد تک بدل دیا۔

انھوں نے زندگی کے تقاضوں کو قبول کیا سائنس کی برکتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ترقی کی علامتوں اور سائنس کے روشن امکانات کو سراہا اور اسے اپنے دائرہ تخیل میں جگہ دی یہی وجہ ہے کہ غالب نے آئین اکبری پر اس نئے نظام کو ترجیح دی جو ان کی نظر میں سائنس کی برکتوں سے زندگی کو مالا مال کر سکتا تھا یہاں انکی فکر کا انداز ضرور بدلا اسی لئے ایک جگہ لکھتے ہیں "جب نئی زندگی سے خوشہ چینی کا موقعہ مل رہا ہے تو پھر کوئی اس خرمن سے (آئین اکبری) خوشہ چینی کیوں کرے ہاں ابوالفضل کا طرزِ تحریر خوب ہے۔

ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است	گر ہنرے ہست افسرے ہم بودہ است
مبداء فیاض را مشمر بخیل	نور میریزد در طلب بازان نخیل
مردہ پروردن مبارک کار نیست	خود بگو کان نیز جز گفتار نیست

غالب اس طرح مردہ پرستی پر بھی چوٹ کرتے ہیں اور مستقبل سے بھی پُر امید ہیں کیونکہ ان کے نزدیک

زندگی کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے انسان جب بھی چاہے ان سے تسکین تشنگی کر سکتا ہے۔

غالب کا دور تاریخ میں عبوری دور ہے جس کا سمجھنا سہل کام نہیں غالب کے یہاں زندگی کی بنی بنائی کوئی مکمل تصویر نہیں ہے ان کے یہاں ہر دور اپنا الگ راستہ بناتا ہے ان کے یہاں زندگی سے فرار کا تصور نہیں ہے وہ ہر حال میں جینا چاہتے ہیں مر مر کے جینا غالب کی زندگی کا مقصد ہے وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں خواہ کسی حال میں رہیں لیکن شاندار اور طویل زندگی کی آرزو رکھتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے کسی قسم کا بھی قدم اٹھاتے سے نہیں چوکتے حالانکہ وہ مغلیہ خاندان سے وابستہ رہے ہیں لیکن انھیں مغل حکومت ختم ہونے کا کوئی خاص صدمہ نہیں گویا انھیں اس کا یقین تھا۔ "دستنبو" میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ دستنبو ایک یادداشت ہے جس میں غدر (جنگ آزادی) کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ مہر نیمروز ہمایوں کے زمانہ تک کی مختصر تاریخ ہے جس کا دوسرا حصہ ماہ نیم ماہ رکھا تھا نہ لکھا جا سکا اس سے غالب کو مورخ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ سو صفحوں کی مختصر کتاب میں ایک ہزار سال کی تاریخ کس طرح لکھی جا سکتی تھی البتہ اسکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے بعد نئے آدمی کا ظہور ان کا عقیدہ ہے اور وحدت الوجود کے عقیدے پر یقین رکھتے ہیں۔

غالب کے یہاں زندگی اور جینے کی چاٹ لگی ہے وہ خوشحال زندگی اور طویل عمر کے متمنی ہیں اسی وجہ سے ان کی عملی زندگی محدود ہے وہ صرف کسب معاش اور تحصیل زر کے لیے جد و جہد کر کے ادبی کارناموں میں لگے رہتے تھے تاکہ قدردانی ہو اور لوگ ان کی تعریف کریں وہ قصائد لکھ کر قدردانی چاہتے تھے ان کے باپ دادا نے تلوار اور فن سپہ گری میں عزت پائی تھی وہ قلم سے وہ کام کے کردار فن چاہتے تھے کیونکہ انفرادی اور ذاتی تجربات کا بھی لازوال خزانہ ان کے پاس موجود تھا۔ غالب کی نظم اور نثر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات صرف کتابوں تک محدود نہ تھی وہ وقت کے تقاضوں کو سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ زندگی میں تبدیلی کے قائل تھے غالب کی آخری عمر میں جب دلی سوسائٹی قائم ہوئی تو غالب نے دلچسپی لی۔ لاہور کی انجمنوں کے متعلق بھی معلومات فراہم کیں وہ اخبار بینی بھی کرتے تھے تاکہ دنیا کے حالات سے باخبر رہیں اور ترقی اور تبدیلی کے سانچے میں خود کو ڈھالتے رہیں نیز نئے امکانات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں تاکہ زندگی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہیں انھیں اس بات کا علم تھا کہ اگر یہ عملی زندگی ختم ہو جائے تو انجام کچھ بہتر نہ ہوگا اس لئے اس کے لئے جد و جہد ضروری ہے۔ شعر ؎

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں　　ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

انھیں اپنی جد و جہد کے ساتھ لاچاری کا بھی احساس ہے لیکن وہ مایوس نہیں ہیں آسودگیٔ خیال کی منزل تک پہونچنے کیلئے راستہ تلاش کرتے ہیں لیکن منزل اور راہ کا تعین نہیں ہے۔ اس کے باوجود جستجو اور تلاش کے عمل میں فرق نہیں آتا شعر ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

غالب کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ انھیں یقین ہے کہ اب عیش و عشرت کا دور خیالِ خام ہے جو

کبھی واپس نہیں آئیگا چنانچہ اس اعلان کے ساتھ دعوتِ عمل کی طرف بھی اشارہ ہے۔ شعر ؎

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے ۔۔۔۔۔۔ متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

گھر ہمارا جو نہ روتے تو بھی ویراں ہوتا ۔۔۔۔۔۔ بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

وہ تعمیر اور تخریب کا گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں انھیں ہر ترقی میں زوال کا بھی پہلو نظر آتا ہے اسی وجہ سے وہ صرف اُمیدوں کے محل تعمیر نہیں کرتے۔ اور نہ کسی خوش فہمی کا شکار نظر آتے ہیں۔ شعر

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ۔۔۔۔۔۔ ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ ۔۔۔۔۔۔ کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

غالبؔ کو اپنے طبقہ کے مٹنے اور حالات کی خرابی کا احساس ہے وہ اپنے حالات کو شایانِ شان نہیں سمجھتے لیکن انہیں حالات میں زندہ رہنے پر مجبور بھی ہیں، لیکن اس کی شکایت ضرور کرتے ہیں ؎ شعر

جو چاہیئے نہیں وہ مری قدر و منزلت ۔۔۔۔۔۔ میں یوسفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج ۔۔۔۔۔۔ میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

غالبؔ دراصل اپنے دور میں "گلشنِ نا آفریدہ" کا عندلیب تھا لیکن جس گلشن کا وہ بلبل تھا وہ عہدِ حاضر کا اور وہ اسی زمانہ کا شاعر تھا جو تم ظریفیٔ وقت سے سو سال قبل پیدا ہو گیا تھا۔

بجنوری نے دیوانِ غالبؔ کو الہامی کتاب قرار دیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ دیوانِ غالبؔ ہندوستان کی الہامی کتاب ہو نہ ہو وہ دورِ ماضی کی تکمیل اور دورِ جدید کا آغاز ضرور ہے۔ بقول سرور صاحب "غالبؔ کی عظمت اور موجودہ مقبولیت کا راز یہ ہے کہ وہ بعض حیثیتوں سے پرانے ہیں اور بعض حیثیتوں سے نئے اور انکی لے میں ہمیں انکی آواز کے ساتھ انکے دور کی اور آنے والے دور کی کتنی ہی آوازیں سنائی دیں" گویا غالبؔ کے یہاں قدیم اور جدید کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔

غالبؔ کسی بھی منزل پر مایوس نہیں ہوتے ان کے یہاں شکایت اور مایوسی میں بھی انفرادیت موجود ہے شعر ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ۔۔۔۔۔۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس ۔۔۔۔۔۔ برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

غالبؔ کے یہاں غم و اندوہ کا پہلو بھی نمایاں ہے لیکن ہر رنگ میں زندگی سے ٹکرانے کی مسلسل جدوجہد ملتی ہے۔ ایک مرتبہ لینن نے فنونِ لطیفہ کا ذکر کرتے ہوئے [illegible] سے کہا تھا کہ خوب صورت چیزوں کو خواہ وہ پرانی ہی کیوں نہ ہوں ہمیں محفوظ رکھنا چاہیئے۔ اس لئے غالبؔ کا فن ہمارے لئے ایک قومی سرمایہ ہے۔

غالبؔ نے ہمارے ادب میں ایک تشنگی محسوس کی اور نظم و نثر دونوں میں ایک نئے انداز کی طرح ڈالی اسالیبِ بیان کو وسعت دی۔ اُردو شاعری میں فکر و اجتہاد کی ابتداء غالبؔ سے ہی ہوتی ہے۔ انھوں نے اُردو شاعری کو روشن دماغ

اور فلسفیانہ آہنگ دیجیے ہم کو ایسے جذبات و تاثرات دیئے جو زندگی میں ہر موڑ پر اور قدم قدم پر ہماری دستگیری کرتے ہیں اس لئے ہم دیوان غالب کو بجنوری کے الفاظ میں ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب تصور کریں یا نہ کریں لیکن محمد حسین صاحب کے الفاظ میں "نئی نسل کی انجیل" ضرور قرار دے سکتے ہیں

اردو میں غالب پہلے شاعر ہیں جو قافیہ پیمائی اور معنی آفرینی میں امتیاز کرتے تھے اور اس پر شدت سے زور بھی دیتے تھے ؎

غالب نبود شیوہ شیوۂ قافیہ بندی　　ظلمی ست کہ بر کلک و ورق می کنم امشب

اقبال کے الفاظ میں "شاعری کی جان معنویت اور خیالات ہیں" غالباً اکبر الہ آبادی نے اقبال کے اسی نظریہ کی تائید میں کہا ہے شعر ؎

"قاعدوں میں حسن معنی گم کرو　　شعر میں کہتا ہوں مجھے نظم کرو"

بقول ایک حکیم کے "دم تحریر قلم تو مصنف کے ہاتھ میں ہوتا ہے لیکن چلاتی اس کو کوئی اور روحانی طاقت ہے ورنہ یہ مضامین خیال جو کسی فنکار کے طرۂ امتیاز ہوتے ہیں دسترس انسانی سے باہر ہوتے ہیں" غالب اسی الہام کے قائل ہیں ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں　　غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

SPENSER نے بھی اس الہامی نظریہ کی تائید کی ہے وہ کہتا ہے کہ "شاعری ایک عطیہ الٰہی ہے جو مشقت اور مطالعے سے حاصل نہیں ہو سکتا ہاں ان دونوں سے سنوارا جا سکتا ہے"۔

غالب ہر منزل میں معنویت کے عاشق رہے ہیں اس افتاد طبیعت کا ثبوت ان کا وہ رجحان ہے جو ان کو ظہوری، حزیں اور بیدل کے عقیدت مندوں میں شامل کر دیتا ہے۔ بیدل کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے　　مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب　　عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامۂ بیدل کا

گر ملے حضرت بیدل کا خط لوح مزار　　اسد آئینۂ پرواز معانی مانگے

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب　　میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

ابتدا میں غالب نے بیدل کی پیروی اور مشکل پسندی اپنا شعار بنا لیا لیکن بیدل کے یہاں مشکل پسندی کے باوجود جو نزاکت اور حسن شعری ملتا ہے غالب اس تک نہ پہونچ سکے البتہ بیدل کی پیروی کے جنون میں کچھ دنوں دشوار گزار گھاٹیوں اور جنگلی میدانوں میں بھٹکتے رہے لیکن جلد ہی ان کے ذوق سلیم نے انھیں صراط مستقیم پر لا کھڑا

کیا۔ یہاں سے وہ کچھ راہیں بدل کر آگے بڑھتے ہیں اور میر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ میر کے یہاں جو جذبے اور احساس کی شدت تھی اس نے بہت جلد انھیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ میر کے جذبات کی وارفتگی اور تندی سے ان کا آبگینۂ قلب پگھلنے لگا اور میر کے متعلق کہتے ہیں۔ شعر۔

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب — جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غالب الفاظ و اسلوب کو بھی شعر کی خوبی و بقا کے لئے جز لازم قرار دیتے ہیں لیکن ان کا ذہن بار بار شعر کی معنویت اور ندرت خیال کی طرف بھاگتا ہے لفظی گورکھ دھندوں، صنعتوں کے استعمال اور محاورہ بندیوں وغیرہ سے وہ کوسوں دور تھے انھیں صرف شعر کی معنویت عزیز تھی۔ اقبال نے لکھا ہے کہ "شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں"۔ اقبال کا یہ مقولہ غالب پر حرف بحرف صادق آتا ہے لیکن وہ شعر کی ظاہری ہیئت پر بھی گہری نظر رکھتے تھے شاعری کو اقبال کے الفاظ میں "ارتباط لفظ بمعنی ارتباط جان و تن" سمجھتے تھے انھیں اپنے انداز بیان پر بھی فخر تھا اور وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ وہ اپنے فن میں طاق اور منفرد ہیں اور یہی احساس جرات رندانہ کے ساتھ انھیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے — جو لفظ کہ غالب، مرے اشعار میں آوے

غالب کے یہاں رمز و کنایات کی بہترین مثالیں ملتی ہیں وہ بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کرتے ہیں۔ شعر۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں بادہ و ساغر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

رمز شناس نہ ہر نکتہ ادائے دارد — محرم آن است کہ رہ جز باشارت نرود

غالب کو خود اپنے اس "رمز دیدیم" کا احساس تھا کہ انھوں نے متنوع موضوعات کو غزل کا پیکر دیا ہے اسی لئے وہ کبھی کبھی اپنے قارئین سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں۔ شعر۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات — دے دل اور ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

فرقیست نہ اندکے زو لم تا بہ دلے تو — معذوری اگر حرف مراز و دنیا بی

دراں دیار کہ گوہر فریدن آئین نیست — دکاں کشودہ ام و قیمت گہر گویم

غالب نہ صوفی ہیں نہ فلسفی بلکہ وہ مفکر ہیں اور ان کا یہ فکری عنصر انہیں شعور کے آئینہ میں مستقبل کی تصویریں دکھلاتا ہے ان کے یہاں تصوف کے اشعار بھی مل جاتے ہیں اور بعض جگہ فلسفہ کا بھی عکس ملتا ہے ؎

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

گر تجھ کو ہے یقین اجابت، تو دعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لیکن ان اشعار سے یا اس قسم کے دوسرے اشعار سے ہم غالب کو صوفی یا فلسفی نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ ان کی ہمہ رنگی کا ردعمل ہے جو ان کی بےچین طبیعت نے ان کے رگ و پے میں سمو دی تھی۔

ان کے یہاں فکر کا عنصر ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ [illegible] اور اسکی آمیزش ان کے یہاں گہرائی پیدا کرتی اور انہیں منفرد بناتی ہے نیز ان کی جستجو کی معاونت کرتی ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب — ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا

شوریست نوا ریزیِ تارِ نفسم را — پیدا نہ ادائے جنبشِ مضراب کجائی

غالب کے جن اشعار میں فکر کا عنصر نہیں ہے انہیں بھی وہ آہنگ و لہجہ اور بندش الفاظ سے اس طرح سجاتے ہیں کہ ان کے اسلوب کی ندرت بن جاتی ہے۔

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع — راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی — جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالب کے یہاں مذہب کا کوئی خاص اثر نہیں ہے وہ صرف انسان سے محبت کرتے ہیں ان کے نزدیک انسانیت ہی مذہب ہے ان کے حلقۂ احباب میں شیعہ سنی، انگریز، برہمن، مولوی اور رند سب ہی شامل ہیں اور غالب سب میں گھل مل جاتے ہیں انکے تعلقات میں مذہب و ملت کی دیوار نہیں ہے بلکہ وہ انسانیت کو سب سے بڑا مذہب سمجھتے ہیں ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

غالب کو زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں کا بھی پورا احساس ہے وہ ان کلفتوں سے دو چار نظر آتے ہیں لیکن اس طرح بیان کرتے ہیں گویا ان کی لذتوں میں پوری طرح غرق ہیں۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے — مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول — آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

کاؤ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

غالب کا قلم جب اخلاق و شرافت کی اقدار کو چھوتا ہے تو وہ ایک ناصح بن جاتے ہیں اور امن و آشتی کے پیغامبر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اس وقت یہ اندازہ بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ باتیں غالب جیسے رند خرابات نے کہی ہیں ؎

نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اور جب یادِ رفتگاں انھیں بے چین کرتی ہے تو وہ سکونِ دل کی خاطر انھیں اس طرح ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ عقیدت کے ساتھ ساتھ مرنے والوں کی بزرگی کا بھی صاف جھلکتا ہے خواہ یہ بزرگی کسی بھی قسم کی

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم — تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

ویسے لگتا ہے کہ غالب کو زندگی بھر حضرت ناصح سے بیر رہا ہے اور یہی جذبہ انھیں ناصح پر طنز کرنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ بعض جگہ ایک چیلنج کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے جس میں شکایت اور طنز دونوں پہلو اجاگر نظر آتے ہیں اور شعر کی لطافت میں اضافہ کرتے ہیں۔

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا — آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

حضرتِ ناصح گر آویں دیدہ و دل فرشِ راہ — کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی — ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

غالب کے یہاں سوز و گداز میں میر جیسا والہانہ پن تو نہیں ہے لیکن ان کے اسلوبِ بیان کی جدت طرازی نے اسے ایک خاص انداز دے دیا ہے۔ اسی کے ساتھ غالب موت کو بھی یاد رکھتے ہیں اور انھیں یہ احساس شدت سے ہے کہ شمعِ حیات کو ایک نہ ایک دن خاموش ہونا ہے اس وجہ سے اس کے انتظار میں زندگی بلکان

کرنے سے کیا حاصل ذیل کے اشعار اس کی عمدہ مثالیں ہیں ۔ جو ان کے اس احساس کی آئینہ داری کرتے ہیں ۔

دھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
موت کا ایک دن معیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا — نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
نامہ کے ساتھ آیا پیغامِ مرگ — رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے — بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایکدن
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ — کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

غالبؔ کی اُردو اور فارسی شاعری کا بنیادی تصور الگ الگ نہیں ہے یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے انھوں نے فارسی ترکیبوں کو اُردو کے ساتھ اس خوب صورتی سے ہم آہنگ کیا ہے کہ وہ ایک حسین امتزاج بن گیا ہے اور دونوں کے مزاج میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہے اور یہی ہم آہنگی انھیں میدان شعر و سخن میں منفرد کرتی ہے۔

غالبؔ کی شاعری میں آفاقیت ضرور ہے لیکن اقبال کی طرح کوئی خاص پیغام اور مخصوص فلسفہ نہیں ہے غالبؔ کے یہاں میرؔ جیسا سوز و گداز نہیں ہے لیکن میرؔ کی طرح عشق میں صرف ہندوستانی تصوف کا روایتی تصور بھی نہیں ہے ان کے یہاں حد بندی نہیں ہے ان کا تصور ایران، سمرقند بخارا کا مشترکہ تصور ہے اور بعض مرتبہ اس کی پرواز ان سے بھی آگے ہوتی ہے ۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ غالبؔ کسی خاص نظریہ کے علمبردار نہیں ہیں بلکہ ان کی شخصیت ہمہ رنگ ہے ان کے یہاں ہر موضوع پر بہترین اشعار مل جاتے ۔ انھوں نے شاعری کو حسن و عشق، گل و بلبل اور جام و مینا ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس سے بڑھ کر ہر مضمون کو بڑے خوب صورت اور فنکارانہ انداز میں اس طرح باندھا ہے کہ تنوع جدت طرازی اور نکتہ آفرینی صاف جھلکتی ہے لیکن ہر بیان میں غالبؔ غالب نظر آتے ہیں ان کی انفرادیت کہیں دھندلی نہیں ہوتی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ نکھرتی جاتی ہے اور اپنے آئینہ میں ہر انسان کو اپنی تصویر دکھلاتی ہے ۔ حسن و عشق کے میدان میں جب ان کا قلم چلتا ہے تو وہ منفرد عاشق نظر آتے ہیں ۔

کرنے ہو قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا — تیری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

غالب کے یہاں ثمریات ظرافت و شوخی بھی اپنا الگ مقام رکھتی ہے جس میں بعض جگہ طنز کی بھی خوب صورت چاشنی ملتی ہے لیکن برجستگی اور فنکاری نمایاں ہے۔

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں — حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب — مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے — مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم — دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار — یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

غالب کے یہاں روایتی رقابت پر بھی اشعار ملتے ہیں لیکن ان میں بھی انھوں نے خود کو منفرد رکھا ہے۔

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل — میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف — عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش جانتا نہ تیری رہگزر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر ایک سے پوچھتا ہوں جاؤں کدھر کو میں

دشمنی اور شکایت کا بھی ان کے یہاں عام روایتی انداز نہیں ہے بلکہ وہ بڑے تیکھے اشاروں میں اس طرح اظہار کرتے ہیں جن میں شعر کی ہر بندش میں ان کی فنکارانہ صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب — تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو — دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو	کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو	کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے
مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور	رکھ لی میرے خدا نے مری بے کسی کی شرم
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ	اسقدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج	شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل	جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اردو کے علاوہ ہندوستان کی کسی بھی زبان میں طنز و مزاح کے نمونے نہیں ملتے غالب نے اس طرف خاص توجہ دی اور اپنی شاعری کو طنز و ظرافت سے اس طرح سجایا کہ آج ہم غالب کو اردو شاعری میں طنز و ظرافت کا موجد کہنے پر مجبور ہیں غالب سے پہلے بھی اساتذہ کے یہاں خال خال اس کی مثالیں مل جاتی ہیں لیکن جو حسن برجستگی اور تیکھا پن غالب کے یہاں ہے وہ کسی کے یہاں نہیں ہے وہ رمز و کنایات میں ہی سب کچھ کہہ جاتے ہیں دراصل غالب کے یہاں ایک ایسی رنگین شخصیت ملتی ہے جو مذہبی اور اخلاقی سہارے ڈھونڈتی بلکہ اس نے فن کی بنیاد HUMANITIES سہاروں پر ہیں انھوں نے فارسی ترکیبوں پر خوبصورت خاکے بنا کر ذرا ذرا سی بات کی وہ تصویر کشی کی ہے جو ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منواتی ہیں۔

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا	بس چپ رہو ہمارے بھی منھ میں زبان ہے
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا	جتنے عرصہ میں میرا لپٹا ہوا بستر کھلا
بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی	آخر زباں تو رکھتے ہو گر دہاں نہیں
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں	عذر میرے قتل کرنے میں اب وہ لائیں گے کیا
غالب تیرا احوال سنا دیں گے ہم ان کو	وہ سن کے بلا لیں یہ اجارہ نہیں کرتے

اس کے بعد ان اشعار میں حسین طنز کے ساتھ ساتھ کتنی نزاکت اور برجستگی ہے اور ساتھ ہی معشوق کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے کہ وہ کتنا نازک اور گل بدن ہے۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا ہے وہ کہیں	دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پاؤں
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں	کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئی	اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بعض جگہ غالب کے یہاں اس قسم کا تضاد ملتا ہے جو ان کی پروازِ تخیل اور فکر و فن سے تو ہم آہنگ نظر آتا ہے لیکن ان کی خود دار طبیعت کے قطعی منافی ہے ذیل کے اشعار میں یہ تضاد کافی حد تک واضح ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزاد و خودبیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اس سے زیادہ خودداری کی اور کیا منزل ہو سکتی ہے لیکن وہی غالب جب ضرورت سمجھتا ہے تو کہتا ہے:-

دے جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے — بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

یہاں غالب کی مصلحت آمیزی بھی سامنے آتی ہے۔ غالب کو ہر وقت اپنی برتری کا احساس رہتا ہے اور وہ اپنے کلام پر فخر کرتے ہیں اور دوسروں سے داد تحسین کے طالب نظر آتے ہیں۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بعض جگہ ان کی آرزو نے قدردانی حد سے تجاوز کر جاتی ہے اور وہ علی الاعلان ایک چیلنج دیتے ہوئے نظر آتے ہیں مثال کے طور پر سہرے کے اس شعر میں گو نام کا اظہار نہیں ہے لیکن استاد محمد ابراہیم ذوق کو کھلا چیلنج ہے۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں — دیکھیں اس سے کہدے کوئی بہتر سہرا

اس شعر میں ذوق کی لال قلعہ سے وابستگی پر حسد کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

بیدل اور ظہوری وغیرہ کے بعد غالب میر سے عقیدت کی حد تک متاثر نظر آتے ہیں اور میر سے عقیدت اور میر کے فن کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں۔

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

لیکن یہ عقیدت بھی زیادہ دنوں نہیں چلتی احساس برتری اور شوق خودستائی انھیں مجبور کرتا ہے منشی نبی بخش کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "غزل کی داد دینا اگر ریختہ یہ ہے تو میر اور مرزا کیا کہتے تھے اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے؟" یہاں غالب نے نہ صرف میر کی برابری کی ہے بلکہ دبے الفاظ میں میر پر سبقت کا دعویٰ کیا ہے۔ دراصل یہ انکی خود پرستی ہی کا ردِ عمل ہے اور یہی خود پرستی اور انانیت انھیں کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک — اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

یا منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں "نواب اسد اللہ خاں لکھو یا مرزا اسد اللہ خاں بہادر کا لفظ دونوں حال میں واجب ولازم ہے۔"

حد یہ ہے کہ وہ معشوق کی بھی خوشامد نہیں کرتے بلکہ اپنی برتری قائم رکھتے ہیں حالانکہ بارگاہ حسن میں بڑے بڑے شعرا سجدہ ریزی کرتے نظر آتے ہیں خواجہ حافظ شیرازی اپنے محبوب کے لئے فرماتے ہیں۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را　　　بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

حالانکہ حافظ کی معشوق کو یہ بخشش مشروط ہے لیکن معشوق کی عظمت اور برتری سامنے آجاتی ہے۔

حضرت امیر خسرو کے معشوق کی قیمت کچھ اس سے بھی زیادہ نظر آتی ہے۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ ای　　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

لیکن غالب حضور حسن میں سر خم نہیں کرتے وہ معشوق کی قدر تو کرتے ہیں لیکن اسی حد تک جہاں تک اپنی خودداری قائم رہے وہ سبک سری کے قائل نہیں۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں　　　سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع　　　راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

یہی نہیں بلکہ بعض مرتبہ ان کے یہاں شدت بھی آجاتی ہے اور وہ اس حد تک تیار ہو جاتے ہیں۔

عجز و ناز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

غالب کی شاعری میں حسن و عشق کا بھی نمایاں پہلو ہے جو ان کی اردو اور فارسی شاعری میں مشترک ہے۔ اور وہ اس میدان میں بھی شہسوار نظر آتے ہیں۔ ان کے عشقیہ اشعار میں تنوع۔ جدت طرازی، اور نکتہ آفرینی کا حسین عکس ملتا ہے جس میں ان کے فن کے نقش و نگار جھلکتے ہیں۔ غالب کے یہاں غزل کے روائتی عاشق، مجنوں سے لے کر شمع و پروانہ اور گل و بلبل تک سب کچھ ملتا ہے لیکن ان روائتی مضامین کی انھوں نے اس فن کارانہ طرز ادا کے ساتھ گہر سفتی کی ہے۔ کہ ان کا ہر شعر منفرد نظر آتا ہے۔ غالب نے حسن و عشق کے ہر پہلو کی نقاب کشائی کی ہے لیکن وہ نسوانی حسن و جمال میں غرق نظر نہیں آتے۔ غالب کے یہاں حسن کی تصویر سے زیادہ تاثیر کی قدر ہے اور وہ حسن کی مصوری کے وقت اس پہلو کو کبھی فراموش نہیں کرتے، بلکہ ایسے حسین اشارے دے جاتے ہیں کہ قاری سوچتا رہے اور محظوظ ہوتا رہے۔

منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں　　　زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ　　　جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

دعویٰ اندر ارابود دلیل بدیہی　　　خندہ دنداں نما بہ حسن گہر زد

شوخی نیمش بپا، جنبش نشیمش ہیں　　　غنچہ راست آمیختہ سرو راست رفتارے

غالب کے یہاں، خال، زلف، رخسار وغیرہ سب کا ذکر ہے لیکن قامتِ یار کی رعنائی ان میں سب سے زیادہ مرغوب ہے۔

اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز آجاوے　　کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

اسد بہار تماشائے گلستانِ حیات　　وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

اسد اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش　　لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

اس مضمون کو فارسی میں اور بھی نازک انداز میں بیان کرتے ہیں

چو غنچہ جوشِ صفائے تنش ز بالیدن　　دریدہ بر تنِ نازک قبائے تنگش را

اُردو اور فارسی شاعری میں زلفِ سیاہ ایک سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ تقریباً ہر شاعر کا موضوعِ سخن رہی ہے لیکن یہی زلف جب غالب کی فنکارانہ صلاحیتوں سے ٹکراتی ہے تو اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ اور اس کے سائے مختلف صورتوں میں نظر آتے ہیں۔

تو اور آرائشِ خمِ کاکل　　میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

زلفِ پری بہ سلسلۂ آمد و رسا　　یک عمر دامنِ دلِ دیوانہ کھینچیے

زلفِ خیالِ نازک و اظہار بے قرار　　یارب بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو

یہاں سیاہ فام معشوق کی زلف کی آڑ میں کتنی حسین تعریف کرتے ہیں۔

رچ گیا جوشِ صفائے زلف کا اعضا میں عکس　　ہے نزاکت جلوہ اے ظالم سیاہ فامی تری

اور جب یہی زلف اُردو سے فارسی میں جاتی ہے تو جذبات میں ایک ہل چل پیدا کر دیتی ہے اور جنت الفردوس سے بھی بلند مقام پالیتی ہے۔

بہ مشامے کہ رسد نکہتِ زلفِ سیہے　　کہ ہمہ بے خودیٔ بادِ صبا خیزد ازو

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضواں رفتم　　ہوسِ زلفِ ترا سلسلہ جنباں رفتم

غالب معشوق کی چشم و نگاہ کی لذتوں کو حسن کا بڑا جوہر سمجھتے ہیں ان کے یہاں سیاہ چشم جادو جگاتی ہے۔ وہ حسنِ خداداد کی پرستش کرتے ہیں جس حسن کو حنا اور غازے سے سنوارا جائے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن　　دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

سرمۂ مفتِ نظر ہوں میری قیمت یہ ہے　　کہ رہے چشمِ خریدار پہ احسان میرا

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب　　کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلادے مجھے

غالب نے چشم و نظر کے عنوان سے نئے نئے انداز پیدا کئے ہیں چشم، نظر، نگہ اور مژگاں کا ذکر ایسے ایسے

اچھوتے انداز میں کیا ہے کہ جس کا تصور بھی مشکل ہے۔

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز　　　میں اور دکھ تیری مژہ ہائے دراز کا

مدتی ہوئی آنکھوں کا حسن بھی کس فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا　　　تیری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

شرم وحیا سے زمین کو تکتی ہوئی آنکھوں نے پلکھوں کی دلفریبی اس قدر بڑھا دی کہ یہ ادا ایک حسن بن گئی۔

نہ از شرم است کز چشم مے آساں بر نمی آید
نگاہش بار رازی ہائے مژگاں بر نمی آید

یہاں کس حسن وخوبی کے ساتھ محبوب کی پلکھوں کو دل کے پار کیا ہے۔

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار　　　جو میری کوتاہئ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

غالب بظاہر حسن و عشق میں غرق نظر آتے ہیں اور ان پر بعض مرتبہ جذباتی کیفیت بھی طاری ہوجاتی ہے لیکن وہ ہر جگہ بڑی خوب صورتی سے اپنا دامن بچا لیتے وہ کہیں بھی حسن سے مرعوب نظر نہیں آتے۔

غالب انسان ہیں اور انسانی فطرت کے مطابق عمر کے ساتھ ساتھ ان کے فکر اور انداز بیان میں تبدیلی ملتی ہے۔ نوجوانی کے اشعار میں شدتِ جذبات اور والہانہ پن ملتا ہے اِس دور میں معشوق کو انھوں نے ہر پہلو سے دیکھا ہے اور لذتِ بوس و کنار میں غرق ہو کر اپنے نیکھے شعر کہے ہیں جن کی مثال کم ملتی ہے۔

امیدوار ہوں تا ثیر تلخ کامی سے　　　کہ قیدِ بوسۂ شیریں لباں بکر ر

اس لبے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں　　　شوقِ فضول و جراتِ رندانہ چاہیئے

دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آتا تھا　　　کہ سب خیال میں بوسوں کا اژدہام رہا

ساقیہ دے ایک ہی ساغر میں سب کچھ کہ آج　　　آرزوئے بوسۂ لب ہائے میگوں ہے مجھے

اِس کے بعد مے پرستی کا عذر لے کر کس حسین انداز میں اظہار تمنا کرتے ہیں لیکن اس طرح کہ خود داری بھی برقرار رہے۔

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن　　　ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

اس کے بعد جب اس عنوان پر جذبات میں کچھ تسکین محسوس کرتے ہیں تو خواہش کے ساتھ ساتھ احتیاط کا بھی دامن تھام لیتے ہیں۔

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر　　　ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہوجائے گا

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں　　بوسے کو پوچھتا ہوں میں منھ سے مجھے بتا کہ یوں

غالب محبوب کی آواز پر جان دیتے ہیں اور اس کی شیریں زبانی کے شیدائی ہیں۔ زبان میں لکنت بظاہر عیب گفتار سمجھا جاتا ہے لیکن غالب نے معشوق کی لکنت کو بھی سراہا ہے۔

مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند سر اڑ جائے　　جلاد کے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

ز لکنت می تپد نبض رگ لعل گہر بارش　　شہید انتظار جلوۂ خویشست گفتارش

غالب کے یہاں ہوس بدن نہیں ہے بلکہ وہ ذوق جمال سے سرشار نظر آتے ہیں اور ہوس بدن کو نظر تحقیر دیکھتے ہیں۔ اور اس کو شریفوں کا شیوہ نہیں سمجھتے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

یہی نہیں بلکہ ان کے یہاں عشق کے تقاضے دین اور دل کے تقاضوں سے بھی کہیں بلند ہیں۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی　　جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالب کے یہاں شیریں فرہاد، قیس و لیلیٰ اور لیلیٰ مجنوں کی طرح عشق کا وہ روائتی تصور نہیں ملتا جو ان کے دور میں اور اُن سے قبل عام تھا کہ کسی ایک کے عشق میں گھل گھل کر جان دیدی۔ وصال نصیب نہ ہوا اور پاکدامنی خصوصیت رہی وہ نہ معشوق کے غم میں گھلنے کے قائل ہیں اور نہ ہی بارگاہ حسن میں سجدہ ریزی کے وہ کسی بھی منزل پر تمکنت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ وہ غم فراق میں زندگی کو جلا کر لطف خاص حاصل کرنے کو زندگی نہیں سمجھتے بلکہ وصل کو زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں معشوق کی خوشامد کا تصور ہی نہیں ہے بلکہ جگہ کھلا CHALLANGE ہے لیکن ہر جگہ SENSE OF HUMOUR منعکس نظر آتا ہے۔

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام　　قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

مجھ سے وناز سے تو نہ آیا وہ راہ پر　　دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا　　تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے　　وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تیری عادت ہی سہی

غالب کے یہاں روائتی اور بے مقصد حسن پرستی نہیں ہے غالب اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ وہ نہ صرف حسن و عشق کے باہمی معاملات کی تصویر کشی کرتے ہیں بلکہ بڑی صفائی اور حسن و خوبی سے ان محرکات کی بھی آئینہ داری کرتے ہیں جن کا ردعمل یہ معاملات ہیں ان کے یہاں عشق میں معاملہ بندی کا تصور بھی روائتی نہیں ہے وہ بڑے حسین پیرائے میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ محبوب کی شرم و حیا کے ذکر میں بھی وہ جدا روش رکھتے ہیں۔ جب محبوب

کی نظرِ التفات ہوتی ہے تو اس کے احسان مند نہیں ہوتے بلکہ نظرِ التفات کے وقت بھی اس کی جفاؤں کی یاد دہانی کراتے ہیں۔

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے	جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے
غیر کو یا رب وہ کیونکر منع گستاخی کرے	گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی	ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے	بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا	غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

غالب بذات خود کسی کے عاشق تھے؟ اس کا مکمل طور پر تو کوئی ثبوت نہیں ملتا لیکن ان کی افتاد طبع اس کی غمازی کرتی ہے اور غالب کے بیشتر اشعار اور احباب کے نام خطوط میں بھی ان کا عشق مترشح نظر آتا ہے۔ بعض جگہ انھوں نے اپنے عشق کا اعتراف بھی بڑی صفائی سے کیا ہے۔ مرزا حاتم علی مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں "مغل بچے بھی عجیب ہوتے ہیں کہ جس سے عشق کرتے ہیں اُسے مار رکھتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی جوانی میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی سے عشق کیا اور اس کو مار رکھا۔"

اس عبارت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ تحریر غالب کی اس عمر کی ہے جب انسان جذباتی نہیں رہتا بلکہ اس کے جذبات اور احساسات میں ٹھہراؤ آجاتا ہے اس عمر میں اپنی جوانی میں عشق کا اعتراف اور وہ بھی ڈومنی سے غالب کی صاف گوئی اور اعلیٰ کرداری کی بھی غمازی کرتی ہے کیونکہ غالب کو اپنے خاندان پر فخر تھا اعلیٰ نسبی کو اپنے لیے وجہ شان سمجھتے تھے ذہن خالص جاگیردارانہ تھا وہ اپنے گرد وپیش میں بھی یہی ماحول دیکھنا چاہتے تھے آج کچھ لوگ ان کی صاف گوئی اور وسیع القلبی سے قطع نظر ڈومنی سے ان کے تعلق کو ان کی شخصیت اور کردار پر بدنما داغ بتلاتے ہیں یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس کا اعتراف نہ کرتے در اصل یہی اعتراف غالب کی اعلیٰ ظرفی کا بھی ضامن ہے۔ کیونکہ اس سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ غالب صرف شعر و سخن کی حد تک ہی عاشق نہ تھے بلکہ انھوں نے عشق کی ایک ضرب کاری بھی کھائی تھی اس کے علاوہ انھوں نے اپنے محبوب کی موت پر ایک مرثیہ بھی لکھا ہے جس کا ہر شعر محبوب سے بے پناہ لگاؤ اور اس کی موت پر جو کوہِ الم ان پر ٹوٹا اس کی آئینہ داری کرتا ہے ہر شعر ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ایک آواز ہے جو یقیناً ان کی اپنی آپ بیتی ہے ممکن ہے یہ مرثیہ اسی ڈومنی کی موت پر لکھا ہو جس کے عشق کا اعتراف کیا ہے۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے	کیا ہوئی ظالم تیری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ	تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں	ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا — خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی — یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا — دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی — اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال — ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال — ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی الفت کا رنگ — رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

غالب مرثیہ لکھنے کے عادی نہ تھے یہ مرثیہ ان کے خصوصی لگاؤ کا ردِ عمل ہے جو درحقیقت اپنی نظیر آپ ہے۔ ہر شعر سے احساس کی شدت کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ اس مرثیہ کے علاوہ بھی غالب کے اشعار میں اعتراف عشق ملتا ہے جو ان کے ذاتی عشق کی غمازی کرتا ہے لیکن غالب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ناکامیِ عشق سے رنجیدہ نظر نہیں آتے وہ غموں میں بھی مسکراہٹوں کے نغمے بکھیرتے ہیں اور اپنے لئے کسی نہ کسی حد تک سامانِ دلبستگی مہیا کر لیتے ہیں۔ ان کے یہاں عشق اور تکالیف لازم و ملزوم ہیں اسی لئے وہ عشق کی پریشانی اور ناکامی سے بھی لذت لیتے ہیں۔ عشق کی ناکامی میں بھی زندگی سے فرار کا تصور نہیں ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع — شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا
عشق نے غالب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ — سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں
تاہم ز دل برد کافر ادائے — بالا بلندے کوتہ قبائے

ناکامیِ عشق پر غالب آنسو نہیں بہاتے بلکہ کبھی معشوق کے قد و قامت کی، کبھی نقاب کی، کبھی ساعدِ سیمیں کی اور کبھی اس کے خرامِ ناز کی تعریف کر کے دل بہلاتے ہیں اور زخمِ عشق کو مندمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم — میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
دیکھ کر اس کے ساعدِ سیمیں و دستِ پرنگار — شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمع، گل پروانہ تھا
اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز آ جاوے — کفِ ہر شاخِ گلشن قمری نالہ فرسا ہو
آئے بہارِ ناز کے تیرے خرام سے — دستارِ گردِ شاخِ گل نقشِ پا کرے

دیکھو تو دلفریبیٔ انداز نقشِ پا | موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
اسدؔ بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ | اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے
جو کچھ ہے محوِ شوخیٔ ابروئے یار ہے | آنکھوں کو رکھ کے طاق میں دیکھا کرے کوئی

غالبؔ کے محبوب میں معشوقانہ ضد تو ہے لیکن ان کا محبوب ظالم نہیں ہے اس کے یہاں ناز و غمزہ ہے لیکن ظلم کا تصور نہیں ہے۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں | بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے
دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں | رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

تکالیفِ عشق میں مسکرانے سے یہ مقصد نہیں ہے کہ ان کا احساس باطل ہو گیا بلکہ انھیں ان کا پورا پورا احساس ہے لیکن وہ انھیں باعثِ صد فخر اور خود کو ان کا اہل سمجھتے ہیں۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ | کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق | ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

دوسرے شعر میں غالبؔ کی خود پرستی اور انانیت کی کھلی عکاسی ہے وہ ہر منزل پر اپنی برتری خود بھی قائم رکھتے ہیں اور دوسروں سے بھی توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کی برتری تسلیم کریں لیکن اس تمکنت اور احساس برتری کے باوجود غالبؔ کو اپنی کمزوریوں کا بھی احساس ہے اور وہ بعض جگہ خود پر بھرپور تنقید بھی کرتے ہیں انھیں اپنی بادہ نوشی کا احساس ہے اور اسے وہ ایک انسان کامل ہونے میں رکاوٹ بھی سمجھتے ہیں اور اپنی شراب نوشی پر تنقید کرتے ہوئے اس کا اعتراف کرتے ہیں لیکن ان کے اس اعتراف میں بھی ان کی شانِ خود پسندی برقرار رہتی ہے۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ | ہم تجھے ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

کس خوب صورتی کے ساتھ بادہ نوشی پر تنقید کرتے ہوئے زندگی کے دوسرے تمام پہلو محفوظ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری جگہ پھر بھرپور تنقید کرتے ہوئے پھر اپنی نامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ | شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالبؔ کے یہاں بھرپور جینے کی تمنا ملتی ہے وہ جینا چاہتے ہیں اور خوشحال زندگی کے طالب ہیں زندگی کا پورا پورا لطف اٹھانا ان کا نصب العین ہے لیکن وہ جینے کی اس چاٹ اور عیش و عشرت کے خواہشمند ہونے کے باوجود موت سے بے خبر نہیں ہیں وہ تمام حالات میں موت کو یاد رکھتے ہیں لیکن اس سے فکر مند نہیں ہیں بلکہ زندگی کے آخری لمحہ تک کا بھرپور لطف لینا چاہتے ہیں۔

موت کا ایک دن معین ہے | نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

غالب کی خواہشات کا سلسلہ لا متناہی ہے جس کی تکمیل کے لئے انھوں نے زندگی بھر جد و جہد کی اور تحصیل زر کی خاطر کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا جہاں جیسا مناسب سمجھا کر گزرے پنشن کی واگذاری کے سلسلے میں انگریز افسروں کے لیے ان کے قصائد ان کی مصلحت آمیزی کی کھلی غمازی کرتے ہیں۔ انھوں نے زمانہ سے کچھ زیادہ توقعات وابستہ کر رکھی تھیں اور یہی توقعات جب حسب مرضی پوری نہ ہوئیں تو وہ زمانہ کی شکایت کرنے لگے ۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی　　　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

وہ ہمیشہ زمانے کے شاکی رہے انھیں یہی شکایت رہی کہ زمانہ نے ان کو وہ مرتبہ نہیں دیا جس کے وہ اہل تھے ان کی وہ منزلت نہیں ہوئی جس کی ان کی ذات متقاضی تھی لیکن نا امیدی یہاں بھی نہیں ملتی انھیں اعتمادِ کامل تھا کہ جیسے جیسے وقت گذرے گا ان کے عقیدت مندوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا انھیں یہ اعتماد اس لئے تھا کہ انھوں نے مستقبل کی آہٹ سن لی تھی اور وہ یقین رکھتے تھے کہ مستقبل کے جلوے حال کے شکست خوردہ ماحول کی تاریکیوں کو منور کر دیں گے اس وجہ سے وہ مستقبل کے نقیب بن گئے یہ ان کی خود شناسی اور اپنے فن سے پوری واقفیت کی دلیل ہے اسی وجہ سے انھوں نے پورے اعتماد کے ساتھ یہ پیش گوئی کی ۔

نازد بیوا تم کہ سرمست سخن خواہد شدن
این مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

غالب کا ذہن اس وجہ سے تنقیدی تھا کہ وہ مروجہ طریقوں کو جوں کا توں قبول نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی تنقید کی کسوٹی پر رکھ کر اس میں کچھ جدت پیدا کر لیتے تھے اس طرح ان کی روش دوسروں سے جداگانہ تھی ان کی طبیعت اس درجہ جدت کی عاشق تھی کہ وہ ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ بات میں بات پیدا ہو اور وہ کسی پرانی بات کو بھی اس ڈھنگ سے کہا جائے کہ وہ بالکل نئی معلوم ہو اور ایسا لگے جیسے یہ بات پہلی مرتبہ کہی گئی وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ شاعری تہذیب کا بنیادی جز ہے اور کس طرح شاعری کے ذریعہ تہذیبی اقدار ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہتی ہیں وہ معاشرہ میں شاعر کی حیثیت سے بھی پوری طرح واقف تھے اور اس کے اثرات سے بھی بے خبر نہیں تھے اصلاح وہ قدیم اور جدید کے درمیان ایک ایسا پل بن گئے جس سے گذر کر ادب جدید تک پہونچا جا سکے ان کے اس احساس اور بروقت زمانہ اور حالات کی نبض پر ہاتھ رکھنے نے انھیں اُردو کا سب سے بڑا جدید شاعر بنا دیا۔ غالب اپنے اشعار سے زیادہ اپنی نثر میں جو بیشتر خطوط کی شکل میں ہے، کھل کر سامنے آتے ہیں جس سے ان کے بے مثال ذہنی ارتقاء اور مستقبل بینی کا ثبوت ملتا ہے اور اس طرح سے غالب کی نظم و نثر سے جدید اردو ادب کی ابتدا ہوتی ہے اور اسی

جدید ادب کا دامن تھامے ہمارے سامنے بعد میں حالی اور سرسید بھی آتے ہیں جو یقیناً غالب کی اس جدت پسندی اور خواہش تجدید و تعمیر سے متاثر تھے سرسید کی غالب سے آئین اکبری کی تقریظ لکھنے کی درخواست اس کا کھلا ثبوت ہے۔

اپنے اسلوب خاص کی مدد سے کر غالب نے فکر اور جذبے کو اس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے کہ ہر سطح کا انسان اس میں اپنے فکر یا اپنے جذبات کا عکس دیکھتا ہے بعض دفعہ تو ایسا لگتا ہے جیسے کہ شاعر نے جو بات کہی ہے وہ ہمارے دل میں بھی ہے اور غالب نے خود اپنے اس فن کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب نے اردو خطوط نویسی میں جس طرز کی بنا ڈالی غالب کو جاوید بنانے کے لئے وہی کافی ہے غالب کے خطوط ان کی زندگی کی کھلی کتاب اور شفاف آئینہ ہیں ان کے بے تکلف اور غیر رسمی انداز بیان میں ان کی خوبیاں اور کوتاہیاں صاف نظر آتی ہیں غالب کی شخصیت مافوق الفطرت نہیں ہے بلکہ وہ بھی ہمارے جیسے انسان تھے ان میں بھی وہی خوبیاں اور خامیاں موجود تھیں جو ہر انسان کا مشترک سرمایہ ہیں ان کے اشعار کی طرح خطوط میں بھی وہی برجستگی، سادگی اور پُرکاری ملتی ہے ان کا مذہبی تصور تعصب کی تنگ چہار دیواری میں مقید نہیں ہے وہ ہندو، مسلمان اور نصرانی سب کو عزیز رکھتے ہیں ان کے یہاں تفریق کا تصور تک نہیں ہے وہ اپنے مخالفین تک سے وقار کے ساتھ ملتے تھے اور ان کا حسب مراتب احترام کرتے تھے۔

غالب کی بیدار مغزی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے انیسویں صدی میں ہی سو سال بعد کی آہٹیں محسوس کر لی تھیں اور وہ اس فکر میں لگ گئے کہ تباہی کے ماتم سے بہتر یہ ہے کہ مستقبل کے لئے راہیں پیدا کی جائیں اسی وجہ سے وہ مغل حکومت کے زوال کے ماتم اور گریہ زاری میں دوسروں کے ہم زبان نہیں ہیں۔ بلکہ انھوں نے مستقبل کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر دعوتِ عمل دی ہے۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند   شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

اور اسی وجہ سے انھوں نے مغربی علوم کی ترویج کا خیر مقدم کیا۔ وہ کہتے ہیں اہل ہند کے پاس بلا سے گو ہر و تاج باقی نہ رہا ہو لیکن مغربی تعلیم سے ذہنی ترقی کا جو سامان مہیا ہو گیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ غالب عمر بھر ذاتی اور معاشرتی پریشانیوں کا شکار رہے لیکن کبھی مایوس نہیں ہوئے ان کے یہاں امید کی شمع کبھی گل نہیں ہوئی اور اسی امید پرستی کے سہارے وہ زندگی کے آخری لمحے تک لطف اٹھاتے رہے اور اسی بنیاد پر وہ کہتے تھے کہ اگر آج نہیں تو کل لوگ مجھے پہچانیں گے اگر زندگی میں مجھے اطمینان اور سکون میسر نہیں آیا تو اس سے کیا ہوا ایک

دن وہ ہوگا کہ میرے مزار کے چاروں طرف چمن بندیاں ہوں گی۔ یہ اس لئے کہ زندگی میں میرا دل کسی کے حسن کر جلووں سے معمور اور اس کے قرب کا متمنی نہ تھا لیکن یہ تمنا میرے مزار کے چاروں طرف لالہ وگل کی شکل میں نمایاں ہوگی۔

مردن زپردہ داریِ شوقم نجات داد صد رنگ لالہ زار زخاکم دمیدہ باد

یہ غالب کا اعتمادِ کامل ہی ہے کہ انھوں نے زندگی میں جو بھی پیشین گوئی کی وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی آج نہ صرف ان کے مزار کے ارد گرد چمن بندیاں ہو رہی ہیں بلکہ پورے ملک میں ان کی صدی بڑی پورے اہتمام کے ساتھ منائی گئی ہے اس کے علاوہ اس تاجدارِ ادب، شہسوارِ علم وفن نے پوری دنیا سے خراج تحسین وعقیدت وصول کیا ہے۔ اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی غالب پر کام ہو رہا ہے لیکن اس وقت غالب کا نام آتے ہی ایک سوالیہ نشان ذہن میں ابھرتا ہے اور جب ذہن اس کا جواب سوچتا ہے اور تجزیہ کرتا ہے تو مختلف ضمنی سوال اور ابھر آتے ہیں مثلاً غالب کو غالب بنانے والی کیا چیز ہے؟ غالب کی شخصیت شہرت اور ہر دلعزیزی کے پس منظر میں کیا چیز کار فرما ہے، غالب کس معاشرہ اور تہذیب کا فرزند تھا، اور اسی قسم کے سیکڑوں سوال ہو سکتے ہیں لیکن سب کا جواب ایک ہے...... اُردو......

حقیقت یہی ہے کہ غالب کو غالب بنانے والی اور انھیں حیاتِ جاوید دینے والی یہی بدنصیب اردو زبان ہے جو آج ایک لاوارث اور یتیم و اسیر کی طرح وقت کی ٹھوکروں میں ہے حیرت کی بات ہے کہ غالب کے لئے آج ہندوستان میں سب کچھ کیا جا رہا ہے لیکن جس زبان کا پروردہ غالب ہے اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔

غالب کی تمام عمر دلی میں گذری لیکن ستم ظریفیٔ حالات کہیے یا ایک اتفاق کہ انھیں اپنا ذاتی گھر بھی نصیب نہ ہوا کرایہ کے مکانوں میں زندگی کے ستر بہتر سال گذار دیئے۔ شاید اُردو کے اس عظیم شاعر کی اس وضع داری اور روایت کو زندہ رکھنے کے لئے ہندوستان میں بھی غالب کی زبان کے لئے کوئی مستقل گھر نہ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ بقول ایک بزرگ کے "آج حکومت نے اُردو کو نعوذ باللہ خدا کا درجہ دے رکھا ہے جو ہر جگہ ہے بغیر اس کے کوئی کام نہیں ہو سکتا لیکن نظر نہیں آتا اسی طرح ہر زبان پر اُردو اُمڈ رہی ہے لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو نظر کہیں نہیں آتی۔"

غالب کو بامِ عروج پر لے جانے والوں سے، غالب کے پرستاروں سے، غالب کی عظمت کے معترفوں سے، غالب کو سرکاری طور پر عظیم ترین شاعر تسلیم کرنے والوں سے سوال ہے کہ آج جس ملک میں غالب غالب کے چرچے ہیں اس ملک میں غالب کی زبان کو بھی کوئی جگہ ملے گی، جس دل میں غالب کے لئے بڑا دروازہ کھلا ہوا ہے کیا اس دل کے کسی گوشے میں غالب کی زبان کے لئے بھی کوئی گنجائش ہو؟

کیا اپنے ہی گھر میں بے گھر زبان کو کبھی کوئی جگہ میسر ہوگی ؟ یہ ایک مستقل سوال ہے شاید مستقبل کی کوئی مصلحت یا ضرورت اس کو حل کر سکے ۔

رشید احمد صدیقی صاحب نے غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے کہ "اگر مجھ سے کوئی معلوم کرے کہ مغل حکومت نے ہندوستان کو کیا دیا تو میں بلا تکلف کہوں گا کہ غالب، اردو اور تاج محل ۔"

تاج محل کی عظمت آج بھی مسلمہ ہے اور دنیا کے سیاح اس کی خوب صورتی سے متاثر ہیں اور ہمارا محکمہ آثارِ قدیمہ اس کی پوری پوری نگرانی کرتا ہے تاکہ مغل تہذیب کی اس دین کا حسن برقرار رہے ۔
غالب کے لئے جو کچھ ہو رہا ہے اور مستقبل قریب و بعید میں جو پروگرام ہیں وہ کسی نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں غالب کو جو مقام ملا وہ یقیناً ان کے شایان شان ہے ۔
لیکن جس زبان نے وہ تہذیب بنائی جس کی دین غالب اور تاج محل ہیں خود ہندوستان میں اس کا مستقبل کیا ہے یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب شاید مستقبل کا کوئی مورخ ہی دے سکے گا ورنہ . . . . . ہر جد و جہد ناکام ہر درخواست نظر انداز ، ہر امید بے ثمر اور آج اردو خود اپنے لئے یہ کہنے پر مجبور ہو ۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی . . . . کیوں . . . ؟

اسلم پرویز

ہے دیوان غالب میں کوشش ۔۔۔ ہیں رفت نہیں
خطوط غالب جو مولوی مہیش پرشاد صاحب نے
مہیش پرشاد صاحب کی کاوش

غالب اور میں

میں کہ اک شاعرِ آوارہ و رسوا و خراب
گردشِ دہر کے آئینے میں خود اپنا جواب

فکر میری بھی بلند اوجِ ثریا کی طرح
بخت میرا بھی سیہ خالِ سویدا کی طرح

فلسفے گردِ مرے جال بنا کرتے ہیں
عقل و ادراک مرے پاؤں چھوا کرتے ہیں

میں نے بھی سعدی و رومی و نظیری کو پڑھا
میں نے بھی عرفی و جامی و ظہوری کو پڑھا

فکر میں میری بھی گہرائی ہے گیرائی ہے
میرے احباب میں حالی کوئی صہبائی ہے

موت کا میری بھی یوں تو ہے معین اک دن
نیند مجھ کو بھی نہیں رات بھر آتی لیکن

طاعت و زہد کا سب راز عیاں ہے مجھ پر
اور مسلمانوں کو کافر کا گماں ہے مجھ پر

قرض کی مے تو نہیں پیتا ہوں لیکن پھر بھی
ساہو کاروں ہی کے گھر جاتی ہے پونجی میری

قتل ہونے کے لئے تیغ و کفن باندھے ہوئے
گامزن میں بھی ہوں جلاد کے آگے آگے

نامہ بر میرے بھی سب اُس کے ہی عاشق نکلے
"کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجئے"

میں مصاحب تو کسی کا بھی نہیں تھا اب تک
لیکن اب سوچتا ہوں ایسے کٹے گی کب تک

مشترک گرچہ ہیں یوں سینکڑوں غم دونوں میں
لیکن اک فرق بہرحال ہے ہم دونوں میں

میں کہ خود اپنے زمانے میں بھی گم نام سا ہوں
اور اک تو کہ نہیں ٹوٹتا تیرا افسوں

انگلیاں میری فگار اور ہے دل بھی زخمی
خونچکاں خامہ نہیں تیری طرح سے پھر بھی

لکھنا لو چاہتا ہوں میں بھی حکایات جنوں

اک طرف زیست کے آلام سے ہوں برسرِ جنگ

کیا اپنے ہی گھر میں بے گھر زبان کو بھی کوئی جگہ میسر ہوگی

یا ضرورت اس کو حل کر سکے۔

۔۔۔ت جنوں

رشید احمد صدیقی صاحب

۔۔۔ سے آلام سے ہوں برسرِ جنگ

چین لینے دیں اگر مجھ کو مقامات جنوں

ایک طرف شعر اگر لکھوں تو ہے قافیہ تنگ

بربطِ دل سے کوئی لے جو نکل آتی ہے

دشتِ اظہار میں گم ہوتی چلی جاتی ہے

آج کے دور کا ہر غم ہے تیرے غم سے سوا

ظلم کی ریت نئی جور کا دستور نیا

گر ستائش کی تمنا ہو صلے کی پروا

پھر بھی فن کار کی کرتا نہیں کوئی پروا

مجھ کو کھانے کو میسر ہو اگر نان و کباب

ساری آبادی کی نسبت سے لگاتا ہوں حساب

تجھ کو یہ غم تھا کہ غیروں نے چمن لوٹ لیا

مجھ کو برباد مرے گھر میں خود اپنوں نے کیا

تیرا ادراک بلند اور تھی دنیا محدود

میرا ادراک بلند اور جہاں لامحدود

بات پر عہد میں تیرے جو زباں کٹتی تھی

تو میرے دور میں جینے کی سزا ہے سولی

میں خدا رکھتا نہیں ہوں جو تیری طرح تو کیا

آج کے دور کا ہر ایک خداوند خدا

میرا غم تیرے ہر اک غم سے سوا ہے غالب

تیرے اسلوب میں میرے لیے کیا ہے غالب

بحر و اوزان مری فکر کی زنجیریں ہیں

یا مرے خوابوں کی ناکام سی تعبیریں ہیں

یہ ردیف اور قوافی یہ غزل کے سرخیل

ان سے تخئیل ہے مسموم تو جذبات قتیل

جوہرِ معنی کو ڈس لیتی ہے یہ مار کے پھن

صنعت و صنف کے الفاظ کی کالی ناگن

زیب دیتا ہے تیرے فن کو یہ سنگین حصار

مجھ کو اب ڈھونڈنی ہے اور ہی طرزِ گفتار

میں بھی جب منہ میں زباں دل میں تڑپ رکھتا ہوں

کیوں نہ غالب کی طرح بات نئے ڈھب سے کہوں

نطقِ غالب ہیں رمز ادا ہو کیوں کر

اور ادا ہو بھی تو پھر فتنہ بپا ہو کیوں کر

ہے۔ دیوانِ غالب ملیں گو ؤئی ۔۔ بیٔیں رفت نہیں
خطوطِ غالب۔ جو مولوی مہیش پرشاد صاحب نے
مہیش پرشاد صاحب کی کاوش

غالب کے مہرباں

بہت بڑی تعداد ہے غالب کے مہربانوں کی لیکن مرفہرست چند لوگ ہی آتے ہیں یا مانے جاتے ہیں جن کو ماہر غالبیت کہا جاتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کتنے ہیں جو واقعی غالب کے صحیح قدرداں اور مہربان ہیں اور کتنے ہیں جنھوں نے غالب کو ایک بت بنا دیا ہے اور اس کی پرستش فرض ٹھہرا دی ہے، عقیدت کی بات اور ہے اور صحیح قدر و قیمت جاننے کی بات اور، یہیں میں توازن نہیں رہ جاتا اور عجیب عجیب انکشاف کئے جاتے ہیں یا ایک معمولی بات کو بھی معجزہ ٹھہرایا جاتا ہے دوسری میں حقیقت اور اصلیت کو ابھار دیا جاتا ہے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا جاتا ہے، کوئی رو رعایت نہیں رکھی جاتی ظاہر ہے کہ یہ صورت صرف اس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب کسی کی شخصیت بلکہ دل سے مرعوب نہ ہو جائے ورنہ کوئی کوشش اور کوئی جائزہ صحیح نتیجہ برآمد نہیں کر سکتا۔

غالب کو دونوں قسم کے مہربان ملے ہیں پہلی قسم کے مہربانوں کی فہرست طویل ہے لیکن دوسری قسم کے مہربان صرف دو چار کی تعداد تک ہی رہ جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو پہلی قسم کے مہربانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر غالب کی زبان ہی سے کہنا پڑتا ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

ایک جم غفیر ہے اسی میں دو چار کتنے ہوئے سنائی دیتے ہیں ؎

خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

بہرکیف میرزا کو 'یاروں' نے ہر رخ سے نرغے میں لینے کی کوشش کی ہے لیکن میرزا کو کسی ایک رخ سے بھی نرغے میں لینا کوشش کی نوعیت پر مبنی ہے، دیکھنا چاہئے کہ اس سمت میں کس کس نے کیسی کیسی کوششیں کی ہیں۔ اور ان سے کیا نتیجہ نکالا ہے،

حالی پہلے شخص ہیں، ان میرزا کے متعلق لکھنے والوں میں انھوں نے میرزا کو بہت کچھ دیکھا ہے اور میرزا

گیا اپنے ہی گھر میں بے گھر زبان کو بھی کوئی جگہ میسر ہو گئی مرزا کو دیکھنے سے زیادہ مرزا کے دیکھنے والوں کو دیکھا ہے اور حرف بحرف یا ضرورت اس کو حل کر سکے۔ پہنچے ہیں یہ درست ہے کہ انھوں نے مرزا کو بہت
رشید احمد صدیقی صاحب ... اتنا بھی بہت کم لوگ دیکھ سکتے ہیں شکر ہے کہ انھوں نے "مرثیہ غالب" کا

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرثیہ میں یہ انداز بالکل فطری ہے اس میں مرثیہ کہنے والے کے حقیقی جذبات ہیں۔ یادگار غالب میں نہیں رکھتا۔ ورنہ وہ بھی جیسے مولانا محمد حسین آزاد ذوق کے نادان دوست ثابت ہوئے ویسے ہی غالب کے نادان ثابت ہوتے۔ لیکن ان کی اس کمی کو ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے پورا کر دیا۔ انھوں نے ہندوستان کی دو الہامی کتابیں تسلیم کیں، ایک "وید مقدس" اور دوسری "دیوان غالب"۔ یہی نہیں بلکہ ہر انداز سے یہ ثابت بھی کیا ہے کہ غالب کے یہاں جو کچھ بھی ہے وہ عین الہام ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رائے رائے کے مقابلے میں زیادہ فقرہ بازی ہے۔ اسی لئے ایک طوفان سا اٹھا اور غالب کے پرزے اڑنے لگے، چونکہ غالب کی شاعری اپنے محاسن کے سبب خواص و عوام کو گرویدہ رکھتی اس لئے یہ تماشا ہوا ورنہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی تھی۔

ڈاکٹر عبداللطیف، یگانہ چنگیزی، کلیم الدین احمد اور دوسرے اصحاب کا غالب پر عتاب لیسے ہی ہوائی نفروں سے رہا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر عبداللطیف نے ان کے کلام کی کے اعتبار سے ترتیب دینے کی کوشش کی اور یگانہ چنگیزی کہنے لگے ؎

صلح کر لو یگانہ غالب سے
تم بھی استاد وہ بھی اک استاد

اور کلیم الدین احمد نے بھی غالب کی شاعری کی اہمیت اور عظمت ایک نہیں تو دوسرے انداز سے مان لی تقریب قریب یہی صورت دوسرے حضرات کو بھی پیش نظر رکھنی پڑی، یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ سب لوگ اعتراضات برائے اعتراضات کرتے رہے، ان میں وزن بھی ہے۔

مالک رام صاحب نے بھی اپنا بھر اچھی ہی کوشش کی، اور جہاں تک ممکن ہو سکا، معلومات فراہم کیں۔ تحقیق کی لگن انھیں کتابوں کے علاوہ اشخاص کے پاس بھی لے گئی اور انھوں نے شخصی معلومات سے استفادہ کیا، ذکر غالب کی ترتیب دے لی تلامذہ غالب بھی لکھ ڈالی اور دیوان غالب بھی ترتیب دے دیا زندگی کے بارے میں ان شخصی معلومات کے سوا ان کے یہاں اکرام صاحب اور مہر صاحب سے کچھ زیادہ نہیں پایا جاتا" تلامذہ کے تذکرے کو اچھا خاصہ کر دیا اگرچہ یہ اپنی ابتدائی صورت میں "نادرات غالب" کے ایک حصے میں

موجود ہے لیکن بھرپور اور مکمل صورت تلامذہ غالب ہی میں ابھرتی ہے۔ دیوان غالب میں گوئی ... بہر رفت نہیں ہے، یہ ضرورت ہے کہ سب کچھ ایک جگہ جمع ہو گیا ہے۔ ان کے علاوہ خطوط غالب جو مولوی مہیش پرشاد صاحب نے جمع کرکے شائع کئے تھے، دو حصوں میں ترتیب دیئے۔ اس کے لئے تو مولوی مہیش پرشاد صاحب کی کاوش ہی کو سراہا جائے گا۔ اگرچہ مالک رام صاحب نے بھی اسے ترتیب دیدیا، میری نظر سے مولوی مہیش پرشاد صاحب کی خطوط غالب، نہیں گذری، اسلئے اس میں کیا ترتیب رہی تھی اس کے متعلق کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ جو دیباچہ مولوی مہیش پرشاد صاحب کا خطوط غالب میں شامل کیا گیا ہے، اس سے انکی محنت شاقہ کا پتہ چلتا ہے اور یہ کہ انھوں نے کس کس انداز سے اور کہاں کہاں سے خطوط دستیاب کئے اور اس کی تصحیح کا خیال کس کس امر کے پیش نظر رکھا "درحقیقت مالک رام صاحب اخذ و استفادہ کے بادشاہ ہیں اور نہایت محنت سے تحقیق و تصدیق کی کوشش کرتے ہیں"۔ اردو کے محققوں میں مالک رام کی حیثیتوں سے امتیاز رکھتے ہیں وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے ہر پہلو کا غائر مطالعہ کرتے ہیں، تمام ضروری مواد مہیا کرتے ہیں اور نہایت سلجھے ہوئے اور شگفتہ انداز میں یہ مواد پیش کردیتے ہیں۔"

خطوط غالب۔ آل احمد سرور (تعارف) ان کے ذرائع بھی بہت سے ہیں اور زندگی کا آسان ماحول بھی کچھ زیادہ ہی سازگار ہے لیکن اس کے پیش نظر نتیجہ کچھ زیادہ تہتم بالشان نہیں ہے، مگر ان کی دھن اور ان کی لگن کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہی ہوگی۔

آفاق حسین کی نادرات غالب بھی مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، لیکن یہ ضمیمہ ہی معلوم ہوتی ہے اور باقی کچھ بات بنانے کے لئے یکجا کردیا گیا ہے۔ فقیر صاحب کے نام میرزا کے سب خطوط جمع کردیئے اور انکے متعلق مفید معلومات بھی فراہم کردی ہیں۔ اس کے باوجود ہم اسے میرزا کے بارے میں کوئی مستقل تصنیف قرار دینے سے قاصر ہیں۔ حالانکہ اس میں کچھ باتیں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔

مختار الدین آرزو، قاضی عبدالودود کے قریب بھی ہیں اور مالک رام صاحب کے بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مالک رام صاحب ہی کی لائنوں پر زیادہ چلتے ہیں۔ انھوں نے احوال غالب اور نقد غالب ترتیب دے کر ایک اچھا کام کیا ہے، جو اپنی ابتدائی صورت میں علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر تھا۔ اس صورت میں بھی یہ ایک اچھا خاصا کام تھا لیکن بڑھ کر اور کتابی بن کر اور بھی مفید کام ہو گیا۔ ان کی افادیت سے کوئی بھی معقول شخص انکار نہیں کر سکتا لیکن ان میں وہ خود کہاں ہیں اور کتنے ہیں، اس کی تلاش مشکور ہی نہیں ہوتی۔

خورشید الاسلام صاحب نے میرزا کے ابتدائی دور کی تحقیق پیش کی ہے، اور جو انہیں اس سلسلے میں مواد مل سکا، اسے سلیقے سے ترتیب دیدیا ہے۔ ابتدائی دور سے متعلق اس کتاب میں اور کہیں سے زیادہ ہی معلومات پائی جاتی ہیں۔ اور شوکت بخاری، مرزا جلال اسیر، بیدل، غنی اور ناصر علی، ناسخ کے اثرات کی نشاندہی

کی ہے۔ صاحب کو بھی غالب کے سوشرات میں سے ایک ہے، وہ خود دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب کا موضوع، غالب کا ابتدائی دور ہے یعنی یہاں مجھے ان کے اس کلام سے بحث نہیں ہے جو ہند ایرانی تہذیب کا بہترین سرمایہ ہے بلکہ مجھے صرف اس سرمایہ سے بحث ہے، جو انھوں نے کم و بیش ۲۵ سال کی عمر تک جمع کیا تھا۔" (دیباچہ)

لیکن غالب پرستی کے جوش میں یہ بھی بہک بہک جاتے ہیں۔

"ان دو زمانوں سے تعارف (متاخرین شعرائے فارسی اور اکبری عہد کے شعرائے ہند اور اورنگ زیب کے بعد تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے مطالعے سے ہم اردو شاعری کی روح تک پہنچ جاتے ہیں، جس میں ایک طرف شکست اور کاری گری کا رجحان کام کرتا نظر آتا ہے۔ جو ناسخ کے یہاں اپنے کمال کو پہنچ جاتا اور دوسری حقیقت پسندی اور اخلاقانہ توانائی کا جو میر و سودا کی تب و تاب کو سموتا ہوا، غالب کے یہاں ایک غیر معمولی وسعت، گہرائی اور پیچ فکر کی پیغمبرانہ شان اختیار کرتا ہے۔" یہ کہنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"اس دور میں (۲۵ سال کی عمر تک کا زمانہ) انھوں نے متاخرین کی تعبیرات اور فن دونوں کو اس کمال تک پہنچا دیا جہاں ناسخ جیسے ماہر بھی کئی زندگیاں مستعار لے کر نہ پہنچا سکتے۔"

یقیناً خورشید الاسلام صاحب کی نظر سے میرزا کی ناسخ کے متعلق ارائے اور خطوط گذرے ہوں گے پھر بھی اس قسم کی بات کہہ جانا اس جیسے حقیقت پسند اور حقیقت جو کے لئے کہاں تک مناسب اور درست ہے یہ وہ جانیں۔

ہئیت شعری کے سلسلے میں انحطاط، تمثیل نگاری، خیال بندی اور مناسبات لفظی کا غالب کے رجحانات میں پتہ لگایا ہے، اور ان پہلوؤں کو تجزیہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں بھی ایک خاص زاویۂ نظر رکھتے ہیں، انھوں نے بھی بعض پہلوؤں پر اچھے مضامین لکھے ہیں۔ رشید احمد صدیقی صاحب کے مضامین بھی اچھی خاصی بصیرت کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری جیسی بلند پرواز تو نہیں کرتے لیکن بڑے سنبھلے ہوئے انداز میں کہتے ہیں:

"مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا، غالب، اردو اور تاج محل!"

"اردو، اور غالب کس حد تک مغلیہ سلطنت کی پیداوار ہیں یہ بات غور طلب ہے،

شوکت سبزواری لسانیات کے شہسوار ہیں، لیکن انھوں نے غالبیات میں بھی پیچھے نہ رہنے

کے لئے کچھ کوشش کی ہے اسے کسی حد تک ہی مشکور کہا جا سکتا ہے کیونکہ غالب کے یہاں فلسفہ پایا جاتا ہے یا سرے سے پایا ہی نہیں جاتا یہ مسئلہ ابھی جیسا چاہئے ویسا حل نہیں ہو سکا ہے ان کی تصنیف فلسفہ کلام غالب سے یہ خوف محسوس ہوتا ہے کہ کلام غالب کی پیچیدگی اور بھی پیچیدہ محسوس کی جانے لگے گی۔ ان کی دوسری کتاب "غالب کا فکر و فن" ہے یہ بھی ان کے مزاج کے مطابق ہی ہے۔

اُردو کے تنقید نگاروں میں جیسی نگاہ احتشام حسین صاحب نے پائی ہے ویسی اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی انہیں پیچیدگی کو سلجھانے کا نہایت اچھا سلیقہ حاصل ہے۔ ان کی تنقیدی تحریریں اس نسل کے تنقید نگاروں کی رہنمائی کرتی ہیں وہ ایک ہمہ جہت نقاد ہیں، ان میں محقق اور نقاد کی خصوصیات جمع ہو گئی ہیں۔

"غالب نے اپنے خطوں اور شعروں میں اپنی ذات اور شخصیت کے ظاہری اور باطنی خد و خال زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے عہد نے انہیں پوری طرح نہیں پہچانا۔ انھوں نے فن کو نئے زاویے بخشے لیکن ہم عصروں نے انہیں نظر انداز کیا۔ انھوں نے فکر کو نئی سمتیں عطا کیں لیکن وقت کے محدود انداز نظر نے اسے بت شکن سمجھا، ان باتوں نے کبھی انہیں اپنی ذات و صفات کی عظمت کا احساس دلایا۔"

کتنی پتے کی بات کہتے ہیں۔

"کسی شاعر کا کلام اگر اس کے بعد بھی متاثر کرتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کے بعد کی نسل اپنے بدلے ہوئے مزاج کے باوجود اس میں تسکین و تحریک کا کوئی پہلو دیکھتی ہے اور اسے جذباتی یا فکری تاویل و توجیہ سے اپنی ذات سے ہم آہنگ کر لیتی ہے۔"

(فروغ اردو۔ غالب نمبر)

ایک مضمون "غالب کے نغموں میں وحدت انسانی اور آفاقیت کے تمر" میں جہاں وہ غالب کی علامتوں میں انفرادیت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کو غالب کے طرز فکر اور احساس فن سے مربوط کرنا غالب کی انفرادیت کے خد و خال سمجھنے کے لئے ضروری بتاتے ہیں وہاں صوفیانہ فکری مسئلے کی شاعرانہ انداز میں پیش کش اور پیغمبرانہ لب و لہجہ کی نشاندہی کرتے ہیں اس کے ساتھ ہی وہ کہتے ہیں

"جو لوگ غالب کے طرز فکر اور انداز بیان سے واقف ہیں انہیں اندازہ ہوگا کہ یہ اشعار محض شگفتہ مزاجی، رندمشربی یا اظہار آزادہ روی کا نتیجہ نہیں ہیں لیکن ان کے پیچھے انسانیت پرستی کا ایک عظیم الشان تصور کام کر رہا ہے۔ یہ تصور تعصب، فرقہ پرستی، تنگ نظری، نسلی افتراق، قومی اختلاف اور انسان دشمنی کے جذبات پر کاری ضرب لگاتا

لگتا ہے اور جب غالب جیسے فنکار کے مضمون میں ڈھل جاتا ہے تو زمین و آسمان کی حدیں مل جاتی ہیں اور ان سے وحدت انسانی اور آفاقیت کے سُر نکلتے ہیں "

پروفیسر آل احمد سرور بڑے سنبھلے ہوئے انداز کے نقاد ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے مضامین میں غالب کی صحیح قدر و قیمت معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی لے احتشام حسین صاحب کے مقابلے میں نرم ہے، لیکن ہمہ گیری بھرپور ہے ان کے یہاں مسائل سے نبرد آزمائی نہیں ملتی وہ نہایت سہولت سے سررشتہ تلاش کرتے ہیں۔ نقد غالب کے تعارف میں لکھتے ہیں۔

"غالب پر اتنا لکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ اب اس موضوع کو پامال سمجھنے لگے ہیں در حقیقت ایسا نہیں ہے غالب بڑی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت رکھتے تھے۔ انھوں نے نظم و نثر میں جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ ہر لحاظ سے برگزیدہ، جاندار اور تہ دار ہے"

مسائل تصوف میں بیان غالب کی اہمیت کس سے پوشیدہ ہے؟ لیکن فطرت اور انسانیت کے متعلق جو بصیرت انھوں نے حاصل کی تھی اس کے فیض سے ان کے یہاں انسانی نفسیات، ایک نئی شخصیت، ارضیت، صحت مند تشکیل، ایک حسن لطیف کے جوہر ملتے ہیں۔ وہ ان کو جدید ذہن کا پیش رو اور جدید اردو نظم و نثر دونوں کی بشارت دینے والا بنا دیتے ہیں۔

انھیں ایک معنی میں ایک نئی زبان بنانی پڑی جس کے لئے انھوں نے بیدل اور دوسرے فارسی شعراء سے مدد لی" .... انھوں نے استعارے کی مدد سے زبان کا تخلیقی استعمال کیا اور آرائش خم کاکل کے ذکر میں اندیشہ ہائے دور دراز کی ایک دنیا تعمیر کر دی۔ جو ہمیشہ صحیح بات نہیں کہتا، اپنی ضد میں کبھی دوسرے کی ہر بات کو رد کر دیتا ہے، مگر جو ہمیشہ زندہ، جاندار، پہلو دار بات کہتا ہے"

دیوان غالب (نسخہ عرشی) کی تقریب میں عرفان غالب آثار ابھارتے ہیں۔

"غالب کا کلام واقعی ایک جام جہاں نما ہے ان کے تخیل میں بلندی ہے ان کے احساس میں تندی و تیزی۔ وہ صورت گری کے بادشاہ ہیں وہ افکار و اقدار کے شاعر ہیں۔ وہ انسانیت کے ہر رنگ میں پرستار ہیں انھوں نے بت شکنی بھی کی ہے اور نئے افکار کے صنم خانے بھی بنائے ہیں وہ دلوں کی گہرائیوں میں بھی جھانک سکتے ہیں اور ذہن کے ہر پیچ و خم سے بھی واقف ہیں وہ اپنے دور کے نمائندے بھی ہیں اور اس سے بلند بھی۔ ان کی غزل حدیث عشق ہی نہیں، صحیفۂ زندگی کا

یہی وجہ ہے کہ غالب کے کلام میں ایک ایسا آئینہ خانہ ملتا ہے جس کے جلوؤں سے ذہنوں میں فکرو
نظر کے چراغ جل اٹھتے ہیں اور دلوں میں انسانیت کی عظمت کا نقش اور گہرا ہو جاتا ہے۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ ہر اعتبار سے ممتاز نقاد ہیں۔ ان کا ایک اپنا زاویۂ نظر ہے، نئے نئے رخ سے انھوں نے
غالب کی عظمت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ انکی نظر غالب کی بلندیوں کو نہیں بھولتی، اس سلسلے کا انکا مضمون
غالب ــــ معتقد پر؟ بڑی خصوصیت رکھتا ہے۔" دو زبانوں کا شاعر" بھی بعض پہلوؤں سے اہمیت رکھتا ہے
"اور مرزا غالب کا حاسہ انتقاد" تو غالب کے فن کے ایک نئے رخ کو اجاگر کرتا ہے۔ اگرچہ یہ رخ کوئی ایسا لاپتہ
نہیں تھا اس کے آثار غالب کے خطوط میں بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک مقالے کے موضوع کی حیثیت
سے غالباً پہلی بار سامنے آیا ہے،

" غالب کوئی بڑے نقاد نہیں تھے، کیوں کہ انھوں نے نقد و نظر کو اپنا فن نہیں بنایا۔ مگر
وہ مسلّم طور پر اُردو اور فارسی کے بڑے شاعر تھے، اِس لحاظ سے ان کے فن میں بھی انتقادی حِس ضرور
موجود ہے جو ہر شاعر کے فن میں بنیاد کا کام کرتی ہے اس کے علاوہ غالب نے تھوڑی بہت عملی
تنقید بھی کی ہے مگر اس میں نظریاتی تنقید سے زیادہ انھوں نے اِسی انتقادی شعور سے کام لیا ہے
جو علم سے زیادہ تاثر سے تعلق رکھتا ہے۔"

غالب نے فارسی میں حزیں اور بیدل اور اُردو میں میر تقی میر کی تحسین میں بھی اِسی دیانتدارانہ تجزیہ
سے کام لیا ہے اس میں ان کی عام شہرت اور قبول عام کا رعب نہیں کھایا بلکہ سوچ سمجھ کر اچھا کہا ہے یہی سمجھنے کی کوشش
ہر تنقیدی عمل کی بنیاد ہے، اس کے لئے کسی اصطلاحی علم کی کوئی خاص ضرورت نہیں وجدان صحیح کی ضرورت ہوتی ہے
یہ غالب کو قدرت کی طرف سے ودیعت تھا۔ غالب کوئی پیشہ ور نقاد نہ تھے مگر ان کے ذہن کی انتقادی افتاد
ٹھیک اور ادبی رخ بالکل درست تھا وہ معیار شناس اور معیار کے پرستار تھے۔ اور اِس معاملے میں وہ مصلحت
ناشناس تھے۔"

اِس خصوصیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے، کہ وہ ایرانی فارسی شعراء
سے سرتابی نہیں کرتے، چاہے یہ ان سے رعب کھانے کا سبب ہو، چاہے کسی اور وجہ سے۔ اگرچہ کبھی کبھی ان
سے برائے نام سرکشی کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہی رہتی ہے، میرزا در حقیقت
حد سے بڑھی ہوئی انا کے شکار تھے وہ صرف اپنے اوصاف اور اپنی خصوصیات ہی کو مانتے تھے اور جن لوگوں میں
یہ اوصاف یا یہ خصوصیات دیکھتے تھے، ان کے پرستار رہتے تھے، خواہ یہ مجموعی طور پر کسی ایک شخص میں ملتی ہوں،
خواہ نمیں کم کسی شخص میں موجود پائی جاتی ہو۔

آخر اس کا سبب کیا ہے؟ ظہوری سے یہ دلچسپی جذباتی قسم کی تو ہے نہیں، اور اگر جذباتی ہو بھی تو بھی اس کے پس منظر میں کوئی ادبی محرکات ہی ہوں گے۔ جس کی بنا پر غالب ظہوری کے اس درجہ دلدادہ ہو رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ غالب کو ظہوری کی ذات میں اپنا عکس نظر آرہا ہے۔ غالب کو ظہوری کی ہر ادا پسند ہے، اس کی معنی آفرینی، اس کی جارحانہ ذہنیت، اس کا تخیل، اس کی شعری عمارتوں کا حسن اس کی نثری تعبیرات کی زیبائی۔ یہ سب وہ ادائیں ہیں جن پر غالب مرتے تھے چنانچہ ان میں سے جو ادا الگ الگ بھی ان کو کسی میں نظر آگئی تو اس پر دل نثار کر بیٹھتے تھے چنانچہ بیدل کی دقت پسندی اور معنی آفرینی یا اردو میں ناسخ کی مضمون آفرینی میں آخر کیا پڑا تھا؟ اس میں قصہ یہی تھا۔

(ڈاکٹر سید عبداللہ۔ غالب کا حاسۂ انتقاد)

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے پایے کے نفیس ذوق عالم بہت کم ہیں، ان کی نظر کوئی نہ کوئی خصوصیت ایسی ڈھونڈھ لاتی ہے، جو دوسروں کی نظر سے اوجھل رہتی ہے، دنیائے ادب میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے، این خانہ تمام آفتاب است انکے کنبے پر صادق آتا ہے، ڈاکٹر عابد حسین، اور ڈاکٹر یوسف حسین صاحب کے فکر و نظر کے بھی سب ہی قائل ہیں، اور یہ بھی اصحاب نظر کی صف اول میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان دونوں حضرات کی بلندیٔ مرتبہ کے لئے ان کی کئی تخلیقات ہیں، کتابی صورت میں بھی اور مقالات کے جامے میں بھی۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے ان سے بڑھے ہوئے ہیں، کیا تقریر کیا تحریر، کیا فکر کیا نظر۔ آپ کا خطبۂ افتتاحیہ غالب صدی کئی ایک توجہ طلب امور رکھتا ہے۔

اس سے پہلے ایوان غالب، کے سنگ بنیاد کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے بھی انھوں نے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی۔ اور کئی ایک مفید اشارے ارشاد فرمائے تھے۔ ان اشاریوں سے کئی موضوع ہاتھ آتے ہیں۔ جو اس سے پہلے اختیار نہیں کئے گئے تھے، کیونکہ ان کا اندازِ فکر تہ تک پہنچ جانے والا ہے اس لئے وہ گوہر نایاب نکال ہی لیتے ہیں۔ اس لئے ان کی رسمی تقریر بھی محض رسمی نہیں رہتی، اس میں بھی بہت سے نکات آجاتے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد غالباً وہ پہلے شخص ہیں، جن کی ہر بات میں ایک بات ہوتی ہے۔

غالب کو ایک تہذیب ورثے میں ملی تھی جسے انھوں نے اس طرح اپنایا کہ اس کا ایک کامل نہیں، تو مثالی نمونہ بن گئے۔ ہمیں اب یہ تہذیب ہندوستان کی سماجی تاریخ کا دور معلوم ہونے لگی ہے، اور ہم بھول جاتے ہیں کہ اس کی بنیاد کیسے اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر تھی۔ ایک اصول تھا انسان سے محبت کرنا۔ غالب، نے اس اصول کو دل سے مانا اور اس پر عمل کیا۔

"اسی محبت نے انہیں اپنی تہذیب کے دوسرے اصول پر عمل کرنا سکھایا۔ ان کے دل میں فیاضی اور خیر خواہی کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ جو کچھ اپنے پاس ہوتا بے سوچے بلکہ بے اختیار ضرورت مند کو دینے کے لئے تیار ہو جاتے۔"

"فیاضی اور خلوص کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ غالب کا خلوص ایک طرف اس سادہ محبت میں نظر آتا ہے، جس سے انھوں نے اپنی کمزوریوں کا اعتراف کیا۔ دوسری طرف ان کی دوستداری میں اور اس اعلیٰ مرتبے میں جو انھوں نے وفاداری کو دیا۔"

خلوص اور دوستی کا ایک سماجی اور تہذیبی پہلو تھا جسے حق محبت کہتے تھے۔ اس کا رس نکال دیا جائے تو وہ چیز باقی رہ جاتی ہے جسے ہم رواداری کہتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے کافی ہو سکتی ہے غالب کی نظر میں کچھ اور تھا۔

اس میں شک نہیں کہ غالب کے دل میں کمال حاصل کرنے کا حوصلہ ان کے زمانے کی تہذیب نے پیدا کیا۔ اسی وجہ سے انھوں نے شروع ہی سے اپنے لئے ایک الگ راہ نکالی عام راستے سے ہٹ کر اردو اور فارسی کو اپنے خاص طرز پر ملا کر ایک انوکھی زبان بنائی، جب اس زبان سے بھی طبیعت مطمئن نہ ہو سکی تو فارسی میں لکھنا شروع کیا اور پھر اسے بھی چھوڑ کر اس زبان میں شعر کہنے لگے جسے اب سنتے ہی ہم کہہ دیتے ہیں۔ کہ یہ غالب کی زبان ہے۔

اور یہ (غالب کی زبان) حق محبت بھی، غالب کی طرح ادا کر سکتی ہے۔

"ان کا نغمہ انھیں کے جوش نے پیدا کیا تھا۔ اور کوئی بلبل اس طرح نغمہ سرا ہو تو کوئی موجود باغ اس کے شایان شان نہیں ہوتا مگر غالب اپنی دنیا سے الگ نہیں تھے بلکہ اس میں ایک نشے کی طرح سرایت کر گئے تھے۔"

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

آج کوئی کچھ کہے لیکن واقعی غالب کی زبان (اردو) حق محبت ادا کرتی ہے، اور اس کے بغیر ہر محبت نامکمل ہوتی ہے۔ شاید ہی کسی محبت کی گفتگو میں اس کے بغیر چارہ ہو، بالکل اسی طرح غالب کے کلام کو بھی یہ خصوصیت حاصل ہے، پچھلے دنوں تک انگریزی زبان کے مقولے، خوش آہنگ مجموعہ الفاظ نوک زبان رہے ہیں، لیکن اب غالب کی زبان اور غالب کے کلام کے ٹکڑے ہر صحبت میں اور ہر گفتگو میں سننے جاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے غالب بھی شریک صحبت ہو اور اس میں حصہ لے رہا ہو، کیونکہ ارکانِ صحبت کی بات بات پر کوئی حلہ، کوئی شعر غالب کا آہی جاتا ہے یہ کیفیت تحریر میں بھی پائی جاتی ہے، اور مفہوم کی موثر ادائگی میں غالب دستگیر ہوتا ہے،

غالب نے ایک تہذیب کی ترجمانی کی یا نہیں کی اگر کی تو کس حد تک کی، وہ مثالی نمونہ بھی بنے یا نہیں اس سے قطع نظر انھوں نے حق صحبت ادا کیا، اپنے زمانے میں بہت کم اور اس زمانے میں بہت زیادہ۔ اُمید کی جاتی ہے کہ یہ سلسلہ زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

یہ درست ہے کہ بعض پہلوؤں سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان نکات کے نکات ہونے میں شبہ نہیں، اور ان سے شخصیت اور فن کے اہم رخوں پر روشنی پڑتی ہے، اس میں "دل را دلی می شناسد" کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

رالف رسل کو مشرقی شعر و ادب میں بڑی دلچسپی ہے، ان کی یہ دلچسپی خصوصاً مرزا غالب کے سلسلے میں بڑھی ہوئی ہے انھوں نے پروفیسر خورشید الاسلام کی ہمراہی میں ایک کام بھی شروع کر رکھا ہے، ان کی تنقیدی نظر قابل ستائش ہے، ظاہر ہے کہ ان کے پیش نظر انگریزی تنقید کے جدید اصول رہے ہوں گے، اس بنیاد پر مرزا غالب کا مطالعہ واقعی نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہونا چاہیئے، کیونکہ پروفیسر خورشید الاسلام بھی صالح تنقیدی نظریہ رکھتے ہیں، اور تیزی ان کی ایک خصوصیت ہے۔ رسل صاحب اپنے ایک مضمون POET HUMANITY (شاعر انسانیت) میں جو السٹریٹیڈ ویکلی کے ۲۳۔ فروری ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تحریر کرتے ہیں،

> غالب متحدہ ہندوستان کا فارسی اور اردو دونوں میں کلاسکی روایت کا واقعی آخری بڑا شاعر ہے اور اور پہلا شاعر ہے جو اپنی آواز میں جدید زمانے کی گونج لیئے ہوئے ہے، وہ ایسے زمانے میں تھا جب ایک نظام مر رہا تھا اور ایک نیا نظام پیدا ہو رہا تھا، اس نے ان دونوں نظاموں کو ایک ایسی ناوابستہ تنقیدی نظر سے دیکھا جو اس کے زمانے میں استثنار کی حیثیت رکھتی تھی کہ دونوں میں جسے مفید اور اور حسین دیکھا اُسے لے لیا اور جسے غیر مفید اور برا پایا اُسے چھوڑ دیا یوں اس کے خیال اور احساس کا دائرہ انتہائی حیثیت سے وسیع ہے اتنا زیادہ وسیع کہ ایک مختصر مقالے میں مناسب انداز سے واضح نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیئے میں ایک بڑے موضوع کو لوں گا اور غالب کی انسان دوستی کے بارے میں کچھ کہوں گا۔

"غالب کی شاعری کا ہیرو، اگر میں ایسا کہہ سکتا ہوں، ایک ایسا آدمی ہے، جو خیال اور احساس سے متعلق اپنی صلاحیت کی تکمیل تک نشوونما پاتا ہے، جو اپنے آپ سے ناقابل بیان حد تک ایماندار ہونے کی جرأت رکھتا ہے، اور یوں زندگی کے رہنمائی کرنے والے اصول بناتا ہے، جن پر وہ پورا اترتا ہے اور مضبوطی سے قائم رہتا ہے اس وقت بھی جب ایسا کرنے میں اُسے تنہا ہی رہنا پڑتا ہے۔"

"ان موضوعات پر غالب کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے، وہ قدرتی طور پر مسلم فرقہ کی جس میں وہ پیدا ہوا تھا، روایات کی اصطلاح میں کہتا ہے۔"

"اسی شوخ ظرافت سے جو اس کے اشعار میں جہاں تہاں پائی جاتی ہے، اور جس نے اُسے اس کے پڑھنے والوں کی آنے والی نسلوں کیلئے عزیز بنا دیا ہے، وہ اس موضوع کو دوسرے مقامات پر بھی برتتا ہے۔"

"غالب کے معاصرین کے لئے اس میں سے کچھ ان کی فہم سے زیادہ جدید تھا اور اپنے سے پہلے کے بہت سے بڑے آدمیوں کی مانند وہ آنے والی نسلوں سے اس قدر دانی کی نہایت اعتماد سے توقع کرتا ہے، جو اس کے زمانے کے لوگ اُسے دینے کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔"

فراق گورکھپوری اس دور میں جتنے اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں اتنے ہی اعلیٰ پایے کے نقاد بھی ہیں، ان کی شاعری اور ان کی "تنقید" کے سب ہی اہل فن قائل ہیں ان کے یہاں وجدان کی کیفیت پائی جاتی ہے، کیا شاعری کیا تنقید پرکھیں ان کی APPROACH (رسائی) وجدانی ہوتی ہے، غالب کی شخصیت اور فن کے عرفان کے لئے ان جیسا صاحب نظر ہی چاہیے۔ بشرطیکہ وہ سنجیدگی سے اس جانب متوجہ ہوں۔ ورنہ وہ کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں، جو فقرے بازی کے ذیل میں آتی ہیں، یہ درست ہے کہ وہ کچھ ایسے انداز سے فقرے بازی کرتے ہیں کہ ان کا رد دشوار ہی ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ فقرے بازی تنقید نہیں ہوتی، یہ اور بات ہے کہ ایک بہت بڑے حلقے کو اپنا قائل کرے جو منطق کا زور بھی رکھتا ہو اور علم و مطالعہ کے پیروں پر بھی اترتا ہو، یوں فراق صاحب کی قریب قریب ہر بات بڑے پتے کی بات ہوتی ہے، اودھ فکر کے لئے میدان مہیا کر لیتے ہیں۔

وہ واقعی ایک آفاقی شاعر تھے ان کی شاعری کی یہ کیفیت ہے کہ آپ ابھرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں مگر اس پر بھی دھنستے ہی چلے جاتے ہیں (یعنی ہر تہہ کے بعد ایک نئی تہہ موجود ہوتی ہے) تن آسان اور سہل پسند قارئین

انہیں مبہم اور مہمل کہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بیشتر ان کے مزاج کی مطلق العنانی اکثر انہیں بیان کو متنوع اور عمیق بنا دینے پر آمادہ کرتی ہے، مزید ان کی شاعری ہیگل کی اقسام بندی کی رو سے وہ چیز ہے جس میں فن کی فلسفیانہ سطح سے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ وہ جس پر خیال ہئیت کیلئے حد سے زیادہ قوی ہو جاتا ہے، اور جس پر بیان قیاس و شبہ کی صورت میں ہموار کیا جاتا ہے، ان کی قوی ذہانت اور ادراک کی تیز روی اور ہستی کے مکڑی کے جالے کا تنوع اور مستحکم سے اس حد تک سیاحت کی کہ وہ اشیا کی زندگی کے اندر جھانک سکے تھے۔ وہ اس پُر اسرار تجربہ کو اجزائی مطالعہ اعتماد کے انوکھے پن سے بیان کرتے ہیں، اس انداز کے لئے موزوں لفظ مبہم سے زیادہ لطیف ہے ان کا دل بھرا ہوا ہے اور ان کی آواز وہی کچھ بیان کرتی ہے، جو وہ جانتے ہیں، جو یہ بات نہیں جانتے وہ انہیں مبہم کہتے ہیں وہ کلیدی سر بجاتے ہیں اور قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ نغمہ ترتیب دے لیں وہ مجہول قارئین کے لئے نغمے نہیں چھیڑتے۔ غالب اول ایک فلسفی شاعر ہیں، ایک طور سے ہم ان کا براؤننگ کی ذہانت پر وفیسر سینٹس بری کے الفاظ میں روح کے تجزیے اور روح کی تشریح میں ہے، ان کی ذہانت اتنی تشریح و تجزیہ میں نہیں ہے جتنی زیادہ زندگی کے اسرار کی جانچ میں ہے، وہ جھلک میں صداقت دیکھتے ہیں۔ وہ فلسفی کی تیز ذہانت و فہم اور صوفی کے صاف مشاہدے، آرٹسٹ کے دقیقہ رس اظہار میں شریک تھے ان کی شاعری میں دروں بینی کی گہرائی اور اظہار کی جادوگری ہے، جو اسے کہیں زیادہ بلند کر دیتی ہیں خشک تحقیق یا بے رنگ بول چال (روزمرہ و محاورہ) سے غالب ایک بچے کی انا پسندی اور اپنے معاصر شیلی کی حساسیت رکھتے تھے یہ بات نہ سمجھنے کے قابل ہونے پر وہ پکار اٹھتے ہیں کہ انھیں تنہا کیوں نہیں رہنے دیا جاتا اور اپنا راستہ کیوں نہیں اختیار کرنے دیا جاتا۔

ان اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ فراق کس حد تک سنجیدہ اور متوازن رہے ہیں۔ ان کی تنقید میں یہ بات خاص طور سے پائی جاتی ہے، کہ وہ بلندیوں کو چھوتے چلے جاتے ہیں بلکہ بلندیوں سے زیادہ بلند ہو کر چھوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، چونکہ مطالعہ اور مشاہدہ نہایت وسیع ہے اس لئے اپنی بات کے لئے مضبوط بنیادیں فراہم کر لیتے ہیں۔ اور جس طرف جانا چاہتے ہیں راستہ بناتے چلے جاتے ہیں۔

عرشی صاحب غالب کے طرفدار بھی رہتے ہیں اور سخن فہم بھی ہوتے ہیں۔ انھوں نے دیوان غالب ترتیب دیکر بہت بڑا کام کیا ہے، اور غالب کی ایک مکمل تصویر سامنے رکھ دی ہے، انھوں نے اس کام کو نہایت کاوش اور جانفشانی سے کیا ہے، اس میں حواشی کا قصہ "جو شرح غالب" کے عنوان سے شامل ہے نہایت اہم ہے اس حصے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ انھوں نے کتنا بڑا کام کیا ہے "اختلاف نسخ" والا حصہ بھی غالب کو سمجھنے والوں اور غالب کے ارتقائے فن کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے، خامیاں کہاں نہیں ہوتیں، صرف خدا کا کلام ہر عیب اور ہر خامی سے پاک ہوتا ہے، انسان کی کاوش تو کوئی نہ کوئی پہلو خام رہنے

ہی دیتی ہے، یا وہ پہلو اپنے آپ کو چھپائے رکھتا ہے،

ابتدا کا طویل مقالہ وافر معلومات کا حامل ہے، اور لکھنے والے کی بصیرت کو ثابت کرتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کے بعض پہلوؤں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے یا بعض پہلو عرشی صاحب کی گرفت میں ایسے نہیں آسکے، جیسے کہ آنے چاہئیں تھے لیکن اس کے باوجود بڑے کام کی چیز ہے، اور یقیناً یہ کام مجموعی حیثیت سے غالب پر مستند کارنامہ ANTHOLOGY کا مرتبہ رکھتا ہے،

قاضی عبدالودود صاحب اپنی قسم کے واحد انسان ہیں، اس دور میں ۔ انھوں نے عمر تحقیق میں گزار دی، اور ہر بات کو اس کے اصل تک پہنچا دیا۔ ان کی تحقیق ٹھوس بنیادوں پر ہوتی ہے وہ مفروضات اور قیاسات کی بنا پر کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے، حقائق کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر ان کی تحقیق کسی ایک مقام پر آکر رک نہیں جاتی۔ اس کے مقامات آگے بڑھتے رہتے ہیں جب جب انہیں کوئی نکتہ ہاتھ آتا ہے اور کسی بات کا نیا نشان ملتا ہے تب تب ان کی تحقیق کا قدم اٹھتا ہے، اور اگلی منزلوں کی خبر لاتا ہے،

انھوں نے کوشش کی ہے کہ غالب کو غالب کے قول کے مطابق نہیں بلکہ ان کے فن اور سخن کے مطابق جانا پہچانا جائے۔ انھوں نے بہت سے مسلمات کو چیلنج کیا ہے اور ان کا بھرا اٹھا دیا ہے، اس کے باوجود کچھ لوگ ہیں کہ اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔ اگر قاضی صاحب کو معقول وجوہ کی بنا پر یہ پتہ دیا جانا ممکن ہو، کہ وہ کسی معاملے میں صحیح نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں، تو وہ اُسے تسلیم کر لینے کے لئے فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں لچک ہے، لیکن یہ لچک اسی وقت واقع ہوتی ہے، جب ان کے سامنے نئے حقائق آتے ہیں۔ ورنہ وہ اپنی بات پر مضبوط چٹان کی طرح اٹل رہتے ہیں۔ چاہے دنیا انہیں اور ان کی تحقیق کو کچھ کہتی رہے، وہ نہایت صاف گو ہیں۔ اور کبھی مصلحت سے صاف گوئی کو دست کش نہیں ہوتے، ان کی سب سے بڑی رعایت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی چیز کے بارے میں کچھ نہ کہیں اور خاموش رہیں۔ اگر کچھ کہتے ہیں تو پھر رو رعایت نہیں کرتے، کیونکہ انہیں نہ کسی کی خوشنودی چاہیئے نہ وہ کسی سے دبتے ہیں۔ جو لوگ ان کی رہنمائی اور نشاندہی کے باوجود اپنی ہی دھرپت الاپے جاتے ہیں، تو وہ صرف مسکرا دیتے ہیں۔ اور انہیں ان کی مفروضہ معلومات کے سپرد کر دیتے ہیں۔

ابھی انھوں نے جو پیام غالب صدی کے یادگاری جریدے (Souvenir) کے لئے دیا ہے، اس میں بھی بہت رو رعایت کرتے ہوئے کہا ہے،

"غالب اپنے کسی ہمعصر اُردو شاعر سے زیادہ تخئیل کو متحرک و متاثر کرتے ہیں انھوں نے اپنے دور کے سب ہی دوسرے شاعروں کے مجموعی سوالات سے زیادہ سوالات اٹھائے ہیں، وہ ایک غلط صدی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنے عناصر کے ساتھ آج ہو سکتے تھے۔

انھوں نے نہ صرف آنکھوں اور کانوں کے لئے ضیافتیں مہیا کی ہیں بلکہ ان کے اپنے الفاظ میں جبکہ ان کی شاعری ایک طرف جنت نگاہ ہے تو دوسری طرف یہ فردوس گوش ہے۔"

ایک مزاح نگار اور طنز نگار کی حیثیت سے وہ اردو میں اپنے چند ہی ہمسر رکھتے ہیں وہ اردو کے عظیم ترین نثر نگاروں میں سے ہیں اور ایک فارسی شاعر کی حیثیت سے وہ ہندوستان میں چند ہی ہمسر رکھتے ہیں۔

ان کا عمل گاہ گاہ ان کے قول و دعویٰ کے مطابق نہیں ہوتا وہ ایک فارسی عالم کی حیثیت سے اتنے عظیم نہیں ہیں جتنا عظیم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ایک ادبی فنکار کی حیثیت سے ان کی عظمت میں کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔"

یہ بات ان کے مضامین میں کھل کر آتی ہے اور اس میں کسی قسم کا ابہام نہیں رہتا' یہ درست ہے کہ وہ غالب کو اس دور کا سب سے اچھا اردو کا شاعر کہتے ہیں اور غالب کے لئے اس میں کسی قسم کا ابہام نہیں رہتا بھی درست ہے کہ وہ غالب کو اس دور کا سب سے اچھا اردو کا شاعر کہتے ہیں اور غالب کے لئے اس زمانے کو زیادہ موزوں بتاتے ہیں انہیں غالب کی شاعری کی کائناتی وسعت کا بھی اعتراف ہے مگر یہ سب واجب انداز میں ہے کہیں غلو سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

غالب کے مہربان اور بھی بہت سے ہیں۔ اور بعض مہربانوں کے انداز میں انفرادیت بھی ہے، لیکن اتنے کچھ سے بھی اجتماعی نمائندگی کا اچھا خاصا اظہار ہو جاتا ہے، اگر ان اصحاب کا بھی مفصل مطالعہ پیش کیا جاتا تو سلسلہ بہت طول کھینچ جاتا اسی لئے یہ تفصیل صرف چند صورتوں میں اختیار کی گئی ہے جہاں ناگزیر سمجھی گئی یا جہاں موضوع کی وضاحت کے لئے ضروری سمجھی گئی۔ اس کے باوجود طوالت بار ہوئی جاتی ہے، لیکن میرے لئے اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس کے بغیر موضوع سے انصاف نہ کر سکتا۔ ممکن ہے کہ بعض اصحاب بعض پہلوؤں سے اس طوالت پر بھی اسے تشنہ ہی پائیں۔

مصرعِ طرح - ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے۔

غزل

ناصر سرسوی

افسانۂ محبّت کا رقم کرتے رہیں گے
ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

یہ سلسلۂ دار و رسن چلتا رہے گا
عُشّاق تیرے کارِ اہم کرتے رہیں گے

نومیدیٔ و بیداریٔ احساس غضب ہے
نومیدیٔ احساس کا غم کرتے رہیں گے

کم ہوگی نہ دریا دلیٔ زمرۂ عُشّاق
دنیائے محبت پہ کرم کرتے رہیں گے

اعمالِ نیک اپنے چھپایا کریں گے ہم
اعمالِ زشت اپنے رقم کرتے رہیں گے

یہ اپنی مروت ہے کہ اے شیخ و برہمن
ہم تذکرۂ دیر و حرم کرتے رہیں گے

فردوس بداماں ہیں تصور میں تیرے ہم
ویرانۂ ہستی کو ارم کرتے رہیں گے

مشکل تو ہے ناصر رہِ الفت سے گذرنا
کوشش مگر ارباب ہمم کرتے رہیں گے

مشیر جھنجھانوی

•

اے سخن گوئے مشرق اے غالبؔ
کیوں نہ ہو ہر زبان پہ تیرا نام
تیری فطرت ہے رازدارِ سخن
تو ہے لاریب شاعروں کا امام

عرفانِ حیات کیوں نہ ہوتا
پائی تھی نکتہ رس طبیعت
غالبؔ تھا رہنمائے ہستی
غالبؔ تھا رازدارِ فطرت

•

عتیق صدیقی

مرزا غالب ـــــ انداز گفتگو

مرزا غالب ایک بلند پایہ شاعر اور شوخ مزاج اور جدت پسند نثر نگار ہی نہ تھے بلکہ وہ تقریر کے معاملے میں بھی بعض غیر معمولی خصوصیات کے حامل تھے۔ وہ بہت زیادہ نہیں بولتے تھے مگر جو کچھ بھی اِن کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی حسن بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی ایسی خصوصیات تھیں جن کے سبب لوگ ان سے ... اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے اور دور دور سے ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ ذیل میں اُن کے انداز گفتگو کے چند نمونے درج ہیں جن کے پڑھنے سے ظرافت، حسن بیان اور خوش طبعی سے بھرپور غالب کی شخصیت ہماری آنکھوں کے سامنے جلوہ فگن ہو جاتی ہے اور ہم سوچنے لگتے ہیں کہ سرزمین ہند نے ایسی شخصیت کو جنم دے کر ہمارے اوپر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اور پھر بہ حیثیت ایک ہندوستانی کے ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے مگر افسوس کہ دوسرے ہی لمحے جب ہماری نظر اردو کی موجودہ حالت پر پڑتی ہے تو ہماری آنکھیں خون کے آنسو بہانے لگتی ہیں ـــــــــــ ..

- لکھنؤ کی ایک محفل میں ایک روز لکھنؤ اور دِلّی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی۔ غالب بھی وہاں موجود تھے۔ ایک صاحب نے غالب سے پوچھا "جس موقعے پر دِلّی والے اپنے تئیں" بولتے ہیں وہاں اہل لکھنؤ "آپ کو" بولتے ہیں آپ کی رائے میں ان دونوں میں سے کون سا فصیح ہے؟ غالب نے جواب دیا فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں مگر اس میں ایک دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میرے بارے میں یہ فرمائیں کہ "میں آپ کو فرشتہ خصائل سمجھتا ہوں" اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں، "میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں" تو مشکل واقع ہوگی میں تو اپنی نسبت کہوں گا اور ممکن ہے آپ اپنی بابت سمجھ جائیں۔

- زبان کے متعلق مرزا کا اسی طرح کا ایک اور لطیفہ مشہور ہے۔ دِلّی میں رتھ کو کچھ لوگ مذکر اور کچھ مؤنث بولتے تھے۔ کسی نے مرزا غالب سے پوچھا کہ حضرت رتھ مؤنث ہے یا مذکر؟ آپ نے جواب دیا بھیا جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔

- پھلوں میں مرزا غالب کو آم نہایت مرغوب تھا۔ آموں کے موسم میں ان کے دوست دور دور سے ان کو آم

بھیجتے تھے اور خود بھی اپنے بعض احباب سے تقاضہ کر کے منگایا کرتے تھے۔ ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ہمراہ جن میں مرزا بھی تھے باغِ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آموں کے درخت انواع و اقسام کے آموں سے لدے ہوئے تھے۔ یہاں کے آم بادشاہ و سلاطین اور بیگمات کے علاوہ کسی اور کو میسر نہ آسکتے تھے۔ مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا اسقدر غور سے کیا دیکھتے ہو۔" مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا پیر و مرشد یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے ؎ بر سر ہر دانہ بنوشتہ عیاں : کایں فلاں ابن فلاں ابن فلاں ۔ اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں ۔ بادشاہ مسکرائے اور اسی روز عمدہ عمدہ آموں کا ایک ٹوکرا مرزا کو بھیجدیا۔

● حکیم رضی الدین خاں مرزا کے نہایت قریبی دوست تھے ان کو آم نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لئے ہوئے گلی سے گذرا آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیا حکیم صاحب نے کہا دیکھئے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے فوراً کہا " جی ہاں گدھا آم نہیں کھاتا "۔

● ایک محفل میں مرزا میر تقی میر کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے۔ انھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی، مرزا نے کہا میں تو آپ کو "میری" سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا آپ "سودائی" ہیں۔

● مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر اُٹھتے بیٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب تنگ و تاریک کوٹھری تھی جس کا دروازہ اس قدر چھوٹا تھا کہ جھک کر جانا پڑتا تھا۔ مرزا اکثر گرمی اور لُو کے موسم میں دس سے چار بجے تک وہیں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جبکہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کو مرزا سے ملنے آئے۔ اس وقت مرزا اسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے اور مرزا کو رمضان میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا ہے۔ مرزا نے کہا قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان بند ہوتا ہے یہی کوٹھری تو ہے۔

● رمضان کا مہینہ تھا ایک سنّی مولوی مرزا سے ملنے آئے۔ عصر کا وقت تھا۔ مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا مولوی صاحب نے تعجب سے کہا کیا جناب کا روزہ نہیں ہے؟ مرزا نے جواب دیا سنّی مسلمان ہوں چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں۔

● رمضان کے مہینے میں مرزا اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں۔

ہیں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ......

• ایک دفعہ جب رمضان گذر گئے تو قلعے میں گئے بادشاہ نے پوچھا "مرزا تم نے کتنے روزے رکھے"۔ مرزا نے عرض کیا "پیرو مرشد ایک نہیں رکھا"۔

• ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا۔ برتن تو بہت تھے مگر کھانا نہایت کم تھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھئے تو بایزید کا۔

• مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مؤلف پر جو "قاطع برہان" کے جواب میں لکھا تھا اور جو فحش اور دشنام سے بھرا تھا۔ ازالہ حیثیت عرفی کی نالش کی مگر جب کامیابی کی امید نہ رہی تو آخر انہوں نے راضی نامہ داخل کر دیا۔ تحقیقات کے دوران دلی کے بعض اہل قلم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لئے بلائے گئے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے ہیں آیا ان سے فحش اور دشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں؟ انہوں نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لئے ان فقروں کے ایسے معنی بتائے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔

ان لوگوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا کسی نے پوچھا حضرت انھوں نے آپ کے خلاف شہادت کیوں دی جواب میں مرزا نے فارسی کا ایک یہ شعر پڑھا ؎ ہر چہ در نگری جز بجنس مائل نیست ؛ عیار بےکسی من شرافت نسبی است (میری بےکسی کی وجہ شرافت نسبی ہے کیونکہ ہر شخص اپنی جنس کی طرف مائل ہوتا ہے اور چونکہ شرافت نسبی میں میرا کوئی ہم جنس نہیں ہے اس لئے کوئی میرا ساتھ نہیں دیتا۔)

• جب مذکورہ بالا مقدمہ داخل دفتر ہو گیا تو ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کو گمنام خط بھیجنا شروع کئے جن میں شراب نوشی اور بد مذہبی وغیرہ پر سخت نفریں اور ملامت لکھی ہوتی تھی۔ ان دنوں مرزا کی عجیب حالت تھی نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ مرزا ایک روز کھانا کھا رہے تھے ڈاکیہ نے ایک لفافہ لا کر دیا۔ لفافے کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے ان کو یقین ہو گیا کہ یہ کسی مخالف کا گمنام خط ہے۔ لفافہ پاس ہی بیٹھے مولانا حالی کو دیا۔ مولانا حالی نے لفافہ کھول کر پڑھا تو اس کو ویسا ہی ایک خط پایا جو فحش اور لغو سے بھرے ہوتے تھے۔ مرزا نے پوچھا کس کا خط ہے اور کیا لکھا ہے؟ مولانا حالی نے اظہار میں تامل کیا تو مرزا نے خود چھین کر پڑھا۔ اس میں ایک جگہ ماں کی گالی لکھی تھی مسکرا کر کہنے لگے کہ اس الو کو گالی دینی بھی نہیں آتی ـــ بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو بیوی کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اس کو بیوی سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرم ساق جو بہتر سال کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے بڑا بے وقوف کون ہوگا۔

• مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست جن سے نہایت بے تکلفی تھی اکثر شام کو ان کے پاس آکر بیٹھتے تھے اور مرزا صاحب سرور کے عالم میں نہایت پرلطف باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا بھئی تو سیدزادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے۔ وہ نہ مانے بلکہ کہنے لگے آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو اجرت دے دیجئے گا۔ مرزا نے کہا ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔ جب وہ پیر داب چکے تو پھر انھوں نے اجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا "بھیا کیسی اجرت — تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمہارے پیسے دابے حساب برابر ہوا۔"

• ایک دن سید سردار مرزا مرحوم شام کو مرزا کے پاس چلے آئے۔ جب تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمع دان لے کر کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ انہوں نے کہا قبلہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی میں اپنا جوتا خود پہن لیتا۔ مرزا نے کہا میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمع دان نہیں لایا بلکہ اس لئے لایا ہوں کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔

• کسی نے امراؤ سنگھ نام کے ایک شاگرد کی دوسری بیوی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ اس کے ننھے ننھے بچے ہیں اب اگر وہ تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو۔ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں، امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے اور نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔

• جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا۔ طوطا سردی کے سبب پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھ کر کہا "میاں مٹھو! نہ تمہارے جورو نہ بچے تم کس فکر میں سر چھپائے بیٹھے ہو۔"

• ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھ آئے اس کا دیوان خانہ تو پسند آگیا مگر محل سرا خود نہ دیکھ سکے۔ گھر پر آکر اس کے دیکھنے کے لئے بیگم صاحبہ کو بھیجا۔ وہ دیکھ کر آئیں ان سے پسند ناپسند کا سوال پوچھا انھوں نے کہا لوگ اس میں بلا بتاتے ہیں۔ مرزا نے کہا کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے۔

• ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پڑی۔ میر مہدی حسین مجروح نے دریافت کیا کہ حضرت! وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے۔ اس کے جواب میں مرزا فرماتے ہیں، بھئی کیسی وبا۔ جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی تو تف برین وبا —!

غلام مہدی راز

غالب ہمیں نہ چھیڑ

(تضمین بر غزلِ مرزا غالب)

(۱)

نظارۂ بہارِ گلستاں کئے ہوئے
خود کو رہینِ منتِ جاناں کئے ہوئے
دل کے نشاط و عیش کا ساماں کئے ہوئے
"مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے"

(۲)

خاطر میں لا سکا نہ کبھی تاج و تخت کو
طے کر لیا ہے میں نے ہر اک راہِ سخت کو
روتا ہوں پھر بھی تیرہ و تاریک بخت کو
"کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے"

(۳)

پھر یاد آگیا ہے کوئی خوبرو صنم
پھر خود بخود یہ آنکھ ہوئی جا رہی ہے نم
ضبطِ جنوں کی، نخوت و پندار کی قسم
"پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے"

(۴)

حالات و واقعات پہ کس کا چلا ہے بس
اک آہِ ناتواں سے بھی ٹوٹا کہیں قفس
اے ابرِ شعلہ ریز ذرا تو بھی کچھ برس
"پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے"

(۵)

دنیا کی قید و بند سے کچھ ماورا ہے عشق
سرگشتۂ خمارِ رسوم و وفا ہے عشق
شائستۂ مذاقِ ستم ہو گیا ہے عشق
"پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے"

(۶)

خود کو سمجھ رہا ہوں بہت آج خوش نصیب
آنے لگا ہے وہ بت کافر مرے قریب
دنیائے حسن و عشق کی باتیں بھی ہیں عجیب
"باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے"

(۷)

اُس چشمِ سرمگیں کی بہت یاد آئے ہے
جذبات میں وہ آج بھی طوفاں اٹھائے ہے
کس کس جتن سے محفلِ جاناں بلائے ہے
"دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے"

(۸)

"کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
خط پا کے اور وحشتِ دل بڑھ گئی سوا
اے کاش کوئی مجھ کو سنبھالے کہ میں چلا
"پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے"

(۹)

"بے پردہ حسنِ یار خوش آہنگ خوش نفس
نظریں ہوں بہرہ یاب کھلے سامعہ میں رس
ہے اس قدر ہجوم تمناؤں کا کہ بس
"مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے"

(۱۰)

بکھرے کبھی تو دوش پہ وہ زلفِ مشکبو
بیٹھے کبھی وہ آ کے بصد ناز روبرو
کرنا پڑے نگاہِ گنہگار کو وضو
"چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے"

(۱۱)

خوشبوئے مے سے مہکی ہوئی ہے ہر ایک راہ
جلووں سے کر رہا ہے وہ تزئینِ مہر و ماہ
کرتا ہوں میں بھی آج یہ معصوم سا گناہ
"اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے"

(۱۲)

اب کس سے داستانِ غمِ زندگی کہیں
کب تک کسی کے ہجر میں یوں اشکِ خوں بہیں
اس طرح سے فراق کے صدمات کیوں سہیں
"پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے"

(۱۳)

آتے ہیں یاد عیش و مسرّت کے رات دن
پیہم سرورِ بادۂ الفت کے رات دن
نغمے کتنے دلنواز محبت کے رات دن
"جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے"

(۱۴)

کیا کیا ستم زمانہ کے ہم پر ہوا کئے
اُف بھی جو کی تو موردِ الزام ہو گئے
بدلی روش زمانہ کی احباب مر چکے
"غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے"

حامد ربانی

ہز مجسٹی دبیر الملک نظام جنگ مرزا اسد اللہ خاں غالب

بھارت کے سرکاری دورے پر

ہماری بھارت سرکار نے اردو زبان کی اکسویں برسی پر عالم بالا کے شہنشاہِ سخن ہز مجسٹی مرزا اسد اللہ خاں غالب کو شرکت کے لئے مدعو کیا ہے چنانچہ ہز مجسٹی سات روزہ سرکاری دورے پر پدھار چکے ہیں ذیل میں ان کے دورے کا آنکھوں دیکھا حال درج کیا جارہا ہے۔ یہ آنکھوں دیکھا حال ہیں نے تخیل کی دوربین کے ذریعہ قلم بند کیا ہے لہٰذا خیال رہے۔

ہز مجسٹی میرزا غالب کا پالم ایرپورٹ پر شاندار سواگت ۳۱ توپوں کی سلامی

۷ افروری ٹھیک صبح ۱۰ بجکر ۲ منٹ پر پالم پر ہز مجسٹی کا انتظار کیا جارہا ہے لوگوں کی نگاہیں برابر فضا میں کچھ تلاش کررہی ہیں مگر ابھی دور دور تک ہوائی جہاز کا کہیں پتہ نہیں استقبال کرنے والوں میں راشٹر پتی، وزیر اعظم، ڈپٹی پرائم منسٹر بنفس نفیس موجود ہیں ان کے علاوہ مرکزی کابینہ کے تمام ارکان، ممبران پارلیمنٹ، بیرونی ممالک کے تمام سفراء اور سرکردہ شہری بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں ہوائی اڈے کو دلہن کی طرح سجایا گیا ہے۔ ہندی اور انگریزی زبانوں میں استقبالیہ نعرے خوبصورت کپڑوں پر لکھکر لگائے گئے ہیں۔ اردو زبان میں کوئی چیز ادھر سے ادھر تک لکھی ہوئی نظر نہیں آتی نیز استقبال کرنے والوں میں اردو زبان کا کوئی نمائندہ شاعر یا ادیب بھی موجود نہیں ہے ابھی لوگ منتظر ہی تھے کہ عین وقت پر ایرلیس کے ذریعہ اطلاع ملی کہ پاکستانی حکومت نے ہز مجسٹی کے خصوصی طیارے کو اپنی سرحد سے گذرنے کی اجازت نہیں دی اور ان کے جہاز کو وہیں روک لیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اب سے دس سال پہلے جب بھارت سرکار نے ہز مجسٹی کو دعوت نامہ بھیجا تھا تو عالم بالا کے پاکستانی سفارتخانہ نے حکومتِ ہند کے خلاف سخت پروپیگنڈہ کیا تھا اس نے وہاں یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ خدانخواستہ بھارت سرکار کا ہز مجسٹی کو مدعو کرنا محض ایک ڈھونگ ہے اور محض سیاسی پروپیگنڈہ ہے جس سے پاکستان کو نیچا دکھانا مقصود ہے اس سے پاکستانی مفادات کو زبردست نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اگرچہ بھارتی

سفیر مقیم عالم بالا نے اس بے بنیاد پروپیگنڈے کی پرزور الفاظ میں تردید کی تھی مگر پھر بھی اس کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہو سکا چنانچہ ملیشیا کے سفارتی نمائندے نے پاکستانی پروپیگنڈے کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا تب کہیں جاکر ہز مجسٹی نے بھارت کے دورے کی دعوت کو منظور فرمایا لیکن اب عین وقت پر حکومت پاکستان کی یہ حرکت سب کے لئے باعث حیرت تھی کیونکہ بھارت کے عوام یہ سمجھ رہے تھے کہ چونکہ اردو پاکستان کی بھی زبان ہے اس لئے پاکستان بغیر درخواست کے لئے ہی اپنے علاقے پر سے پرواز کی اجازت دیدے گا لیکن ایسا نہیں ہوا بہرحال حکومت نے پاکستان سے فوراً درخواست کی کہ جس طرح ہم تمہارے جہازوں کو اپنے علاقے سے گذرنے کی اجازت دیدیتے ہیں ہمیں بھی اجازت ملنی چاہیے ورنہ ہم علامہ اقبال کے ہوائی جہاز کو اپنے علاقے سے گذرنے نہیں دیں گے۔ ادھر بین الاقوامی عدالت نے بھی پاکستان پر زور دیا۔ بالآخر اسے اجازت دیتے ہی بن پڑی تب کہیں جاکر ہز مجسٹی کا پلین شام کو چار بجکر ۴۵ منٹ پر پالم ایرپورٹ پہنچا طیارہ کی آواز زبردست بھیانک اور ہیبت ناک تھی کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے جیسے ہی ہز مجسٹی اپنے پلین سے باہر نکلے پہلے کتنیس ناریل پھوڑے گئے اور بھجن گائے گئے اس کے بعد اکتیس توپوں کی سلامی دی گئی، پھر آگے بڑھکر راشٹرپتی اور وزیر اعظم نے پرجوش استقبال کیا ہز مجسٹی نے کچھ بڑے لیڈروں سے ملنے سے انکار کر دیا۔ پھر عالم بالا اور بھارت کے قومی ترانوں کی دھن بجائی گئی۔ عالم بالا کے قومی ترانے کے بول اس طرح تھے۔

ع رہیے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

اس کے بعد ہز مجسٹی نے گارڈ آف آنر سے سلامی لی تو فوٹو گرافروں کی ٹولی نے سب سے پہلے ہز مجسٹی کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ہز مجسٹی اس زبردست مجمع کو ہاتھ کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے آپ کا لباس بہت بیش قیمت تھا جو ایک عبا کی شکل میں تھا سر پر قطب مینار کٹ ٹوپی تھی اور ہاتھ میں ایک خوبصورت چھڑی پیچھے پیچھے ایک ملازم پیچوان ہاتھ میں لیے چل رہا تھا۔

(ہوائی اڈے کی سواگتی تقریب میں وزیر اعظم ہند کی تقریر اور ہز مجسٹی کی جوابی تقریر)

وزیر اعظم نے آپ کا استقبال اس شعر سے فرمایا

ع وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اور کہا "ہم آج ہز مجسٹی کو اپنے بیچ پاکر بہت خوشی محسوس کرتے ہیں اور آپ کے بہت آبھاری ہیں کہ آپ نے ہمارے نمنترن کو سویکار کر کے ہمارے دیش کی شوبھا بڑھائی ہم اس بات کے حق میں ہیں کہ آپ کی بھاشا اردو زندہ رہے اس کو بھارت

ہیں اس کا حق ملے اور وہ پھولے پھلے آپ کی بھاشا بڑی سندر ہے بڑی میٹھی ہے ہمارے اور آپ کے دیش عالم بالا کے آپس ہیں۔ پرانے کلچرل تعلقات ہیں ہماری اور آپ کے دیش کی سبھیتا ملتی جلتی ہے۔ ہمارے دیش کے بڑے بڑے لیڈر آپ کے دیش کی یاترا کر چکے ہیں، ہمیں آشا ہے کہ آپ کی اس یاترا سے دونوں دیشوں کے بیچ سمبندھ اور مضبوط ہوگا اور سنسار کی شانتی میں سہائتا ملے گی۔

ہز مجسٹی کی جوابی تقریر

ہز مجسٹی نے اپنے جوابی بھاشن میں یہ شعر پڑھا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

اور فرمایا: "صدر مملکت وزیر اعظم اور معزز حاضرین مجھے آپ کے ملک میں آکر خوشی بھی ہوئی (تقریر ہندی میں ہوگی ہندی میں ہوگی۔ نہیں نہیں انگریزی میں ہا ہا ہا۔۔ ہو ہو ہو) درمیان میں کچھ ہندی اور انگریزی کے حامیوں نے گڑبڑ کی مگر پولیس نے کنٹرول رکھا ہز مجسٹی کی تقریر جاری رہی، انہوں نے کہا خوشی تو اس لئے کہ ایک صدی کے بعد میں آپ کے ملک اور مرحوم دلی میں قدم رکھ رہا ہوں آپ نے مجھے وہ عزت بخشی ہے جس کا میں مستحق نہیں تھا اور رنج اس بات کا ہے کہ آپ لوگ آج میرے نام پر جو اتنا کچھ کر رہے ہیں۔ میرے ملک کے سفارتخانہ نے مجھے جو رپورٹ دی ہے مجھے اس پر یقین کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس تقریب میں آپ نے جہاں ہندی اور انگریزی کو عزت بخشی ہے۔ وہاں کہیں اردو دکھائی نہیں پڑتی مجھے یہاں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو مجھے پہچانتا ہو میں اپنے کو اجنبی محسوس کرتا ہوں۔ میرے سفارتخانے نے مجھے بتایا ہے کہ آپ لوگ لاکھوں روپیہ میرے دورے کے سلسلے میں برباد کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اگر آپ اس روپے سے کوئی اردو یونیورسٹی قائم کرتے، اور اسکالروں کو وظیفے جاری کرتے ہزاروں لاکھوں اردو داں حضرات کو روزگار مہیا کرتے جو اردو پڑھنے یا جاننے کے جرم میں اپنی زندگی برباد کر رہے ہیں اور اردو زبان کو اس کے علاقوں میں سرکاری زبان تسلیم کرتے تو میرے لئے یہ بات باعث مسرت ہوتی پھر بھی میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اسی بہانے مجھے یہ تجربہ تو ہوا۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

کالی جھنڈیاں اور غالب واپس جاؤ کے نعرے

سنا ہے کہ جب ہز مجسٹی اپنے خصوصی ہوائی جہاز سے اترے تو کچھ خاص لوگوں نے کالی جھنڈیوں سے ان کے خلاف

مظاہرہ کیا اور غالب واپس جاؤ کے نعرے لگائے اور قریب تھا کہ مظاہرین انہیں اپنے گھیرے میں لے لیتے کہ فوراً پولس نے مداخلت کر کے مظاہرین کو منتشر کر دیا نیز بتایا گیا ہے کہ پاکستانی سفیر مقیم برائے ہند نے ان تمام تقریبات کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے

(ہز مجسٹی کا پروگرام)" سرکاری پریس نوٹ"

(۱) راشٹرپتا کی سمادھی پر پھول چڑھائیں گے۔
(۲) راشٹرپتی کے ہمراہ راشٹرپتی بھون میں لنچ کھائیں گے۔
(۳) لال قلعہ کے استقبالیہ میں جو دلی کے شہریوں کی طرف سے دیا جائے گا شریک ہوں گے۔
(۴) پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کو خطاب کریں گے۔
(۵) وگیان بھون میں ایک سمپوزیم میں شریک ہوں گے یہ سمپوزیم بین الاقوامی ہوگا۔
(۶) ایک پریس کانفرنس کو خطاب کریں گے۔
(۷) ٹیلی ویژن انٹرویو دیں گے۔
(۸) ایک آل انڈیا مشاعرہ کی صدارت کریں گے۔
(۹) فلم ایکٹروں کے استقبالیہ جلسہ میں شریک ہوں گے۔
(۱۰) اجنتا، ایلورا دیکھیں گے۔
(۱۱) بنارس یونیورسٹی کے کانوکیشن میں ایڈریس پڑھیں گے۔
(۱۲) پرسدھ مہاتماؤں سے بھینٹ کریں گے۔
(۱۳) ناگپور میں اکثریت کے مشہور لیڈر کے ساتھ ڈنر کھائیں گے پھر ان کی نیم فوجی تنظیم کی پریڈ دیکھیں گے۔
(۱۴) ہندوستان کے تجدید پسند لیڈروں سے بھینٹ کریں گے اور اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں تبادلۂ خیالات کریں گے اور
(۱۵) راشٹریہ کرن کے فلسفہ پر بات چیت ہوگی۔
(۱۶) ترقی یافتہ مسلم نیشلسٹ لیڈروں سے قومی دھارے، مسلم پرسنل لا اور سول کوڈ جیسے اہم مسائل پر بات چیت کی جائے گی۔
(۱۷) وزیر اعظم سے بین العالماتی امور پر مذاکرات ہوں گے اور مشترکہ کمیونکے جاری ہوگا۔
(۱۸) ۲۳ر فروری کو ہز مجسٹی اپنے ملک عالم بالا روانہ ہو جائیں گے۔

ہز مجسٹی راشٹرپتی بھون میں

ہز مجسٹی پالم ایرپورٹ سے سیدھے چار میل لمبے جلوس کی شکل میں پالکی میں سوار ہو کر راشٹرپتی بھون پہنچے راستے میں جگہ جگہ محراب، دوار گیٹ بنائے گئے تھے اور جگہ جگہ ہندی، انگریزی میں سواگتم لکھا ہوا تھا آپ نے رات کو راشٹرپتی کے ساتھ ڈنر تناول فرمایا جس میں استقبالیہ تقریر کا جواب ہز مجسٹی نے کھڑے ہو کر اس طرح دیا۔" صدر محترم اور معزز بن شہر اس کے بعد یہ شعر پڑھا

ع رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج پھر میرے دل میں کچھ درد سوا ہوتا ہے

مجھے افسوس ہے کہ میں کچھ ایسی باتیں کہنے پر مجبور ہوں جن سے شاید ہمارے معزز میزبان کو تکلیف پہنچے لیکن مجھے اس کے لئے معاف کیا جائے۔ محترم میزبان میں یہ کہہ رہا تھا کہ آخر آپ لوگ اردو زبان سے سوتیلی ماں کا سا سلوک کیوں کرتے ہیں کیا دنیا کو معلوم نہیں کہ ہندوستان سے اردو کو کس کس طرح دیس نکالا دیا جا رہا ہے، آپ لوگوں کو مجھ سے محبت ہے لیکن میری زبان سے نفرت یعنی گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز، میری سمجھ میں یہ فلسفہ نہیں آتا کہ آپ اردو کو مٹا رہے ہیں اور میرا استقبال کر رہے ہیں۔ کیا میں صدر محترم سے معلوم کر سکتا ہوں کہ وہ ۲۲ لاکھ دستخط کہاں ہیں جن کو آپ خود لے کر اسوقت کے صدر جمہوریہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے ان کا کیا ہوا؛ کیا آج آپ اسی منصب پر نہیں ہیں کیا آپ کے ہاتھ میں تمام اختیارات نہیں ہیں؟ پھر کیا وجہ ہے اس خاموشی کی۔ میں سمجھتا ہوں اب وقت کافی ہو گیا میں ایک بار پھر اپنے محترم میزبان سے اس تلخ نوائی کی معافی چاہوں گا مجھے امید ہے کہ آپ ضرور ان باتوں کی طرف توجہ دیں گے اور غور کریں گے۔"

ہز مجسٹی راشٹرپتا کی سمادھی پر

اگلے دن ہز مجسٹی راشٹرپتا کی سمادھی پر پھول چڑھانے آئے آپ نے گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی سمادھی پر پھول چڑھائے اور یہ شعر پڑھا۔

ع مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

ہز مجسٹی کی پریس کانفرنس

یہ کانفرنس ایسی تھی کہ اس سے قبل کسی سربراہ مملکت کے آنے پر اتنی بڑی کانفرنس نہیں بلائی گئی اس میں تقریباً تمام ممالک کے اخباری نمائندے ٹیلی ویژن اور ریڈیو نمائندے موجود تھے پریس کانفرنس میں آپ سے جو سوالات

کئے گئے مع جوابات کے ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔ بنر مجتبیٰ نے اپنی پریس کانفرنس کا آغاز اپنے اس مصرع سے کیا

ع صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

س : ہندوستان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

ج : ع ہندوستاں کی بھی عجب سرزمیں ہے۔

س : آپ عالم بالا سے کیسے تشریف لے آئے جبکہ آپ کو گئے ہوئے ایک صدی گذر چکی ہے۔

ج : ؎ مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہے جس وقت

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

س : بھارت کی راجدھانی دلّی جو کبھی آپ کی بھی ہوا کرتی تھی اب اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

ج : اس کے بارے میں مجھ سے کیا پوچھتے ہو میری مملکت کے ایک وزیر نے اس سلسلے میں یہ بیان دیا تھا اس کو میں کافی سمجھتا ہوں وہ بیان یہ ہے۔

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ

نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

س : پاکستان آپ کے اس دورے سے خوش نہیں ہے اور اس کے سفیر نے آپ کے دورے کی تمام تقریبات کا بائیکاٹ کیا ہے اور اب بھی خلاف پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

ج : اس کے بارے میں میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں ۔۔

؎ غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

س : روس کی جو پالیسی ہندوستان کے بارے میں ہے کیا ہم ہندوستانی اس پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

ج : اس کا حال تو کچھ ایسا ہی ہے۔

؎ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

س : کیا واقعی پاکستان کے تعلقات امریکہ اور روس سے خلوص اور حقیقی دوستی پر مبنی ہیں؟

ج : ؎ میرا اپنا جدا معاملہ ہے

اور کے لین دین سے کیا کام

س : کیا ہندوستان کو پاکستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہئے؟

ج : ؎ ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

س : کشمیر کے بارے میں آپ کا موقف کیا ہے اور کیا یہ مسئلہ کبھی ختم ہو سکتا ہے۔

ج : ؎ کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

س : کیا اقوام متحدہ اس دور کے تقاضوں کو پورا کر رہی ہے اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہے کیا اس سے انصاف کی توقع کی جا سکتی ہے۔

ج : ؎ اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور اپنی تقدیر کو رو آئے

س : اس وقت سائنس نے کتنی ترقی کر لی ہے لوگ چاند پر جا رہے ہیں آپ نے بھی اس سے کوئی تاثر قبول کیا ہے۔

ج : ؎ بازیچۂ اطفال ہے یہ دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

س : آج کل دنیا کے سیاسی حالات بہت خراب ہیں کیا آپ بھی یہی خیال کرتے ہیں کہ تیسری عالم گیر جنگ چھڑ جائے گی آپ کی حکومت اس سلسلے میں کیا کر رہی ہے۔

ج : ؎ رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ہز مجسٹی پارلیمنٹ سیشن میں

دوسرے دن ہز مجسٹی پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس کو خطاب کرنے کے لیے تشریف لائے آپ نے ممبران پارلیمنٹ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایوان آپ کے ملک کا وقار ہے۔ آپ لوگ یہاں اپنی قوم کی قسمت کے فیصلے کرتے ہیں، لہٰذا اس ایوان میں ایسی باتیں ہرگز نہ ہونی چاہئیں جس سے آپ کے ملک کا وقار مجروح ہو آپ کو ملک کے سامنے بہتر نمونہ پیش کرنا چاہئے یہ کبڈی کھیلنے اور کشتی لڑنے کی جگہ نہیں ہے حزب مخالف کو بھی چاہئے کہ حکومت کے ساتھ تعاون کرے اس کی مخالفت تعمیری ہو یہ نہیں کہ ہر ماہ تحریک عدم اعتماد اُٹھا کر پیش کر دی حکومت کو بھی چاہیئے کہ حزب مخالف کی تنقید کا احترام کرے۔

اس کے بعد ممبران نے ہز مجسٹی کی تقریر پر بحث کی بحث میں حصہ لیتے ہوئے کمیونسٹ ممبر نے کہا کہ حکومت کو چاہیئے کہ ہز مجسٹی کی آمد پر اردو کو اس کا حق دیا جائے اور دلّی اور یوپی وغیرہ میں اس کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دی جائے

ورنہ آپ کے دورے کا مقصد فوت ہو جائے گا اور حکومت اقلیتوں میں اعتماد بحال کرے ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری پوری کرے۔ کمیونسٹ ممبر کی اس تقریر پر ماضی بعید پرستوں نے شیم شیم کے نعرے بلند کئے زبردست شور مچایا اور واک آؤٹ کیا اور پاکستانی ایجنٹ کہا جس کے جواب میں کمیونسٹ بنچوں نے بھی زبردست احتجاج کیا اور سب کے سب واک آؤٹ کر گئے ممبران نے ایک دوسرے کی طرف مائیکروفون اٹھا کر دے مارے جس پر اسپیکر کو دس منٹ کے لئے کارروائی ملتوی کرنی پڑی جب دوبارہ اجلاس شروع ہوا تو کچھ ممبران نے اسپیکر سے اس بات کی اجازت چاہی کہ ایک گائے جو ان کے علاقے میں مری ہوئی پائی گئی ہے اس پر بحث کی اجازت دی جائے ورنہ ہم حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کریں گے اسپیکر نے اجازت دینے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے پھر ہنگامہ بپا ہو گیا۔ آخر کار اسپیکر کو غیر معینہ مدت کے لئے اجلاس ملتوی کرنا پڑا۔

ہز مجسٹی سے ٹیلی ویژن انٹرویو

ذیل میں ایک انٹرویو دیا جا رہا ہے یہ انٹرویو لے۔ آئی۔ ٹی۔ سی کے نمائندے نے لیا تھا۔

س : آپ براہِ کرم اپنا شبھ نام بتلایئے۔

ج : ؎ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

س : کیا آپ اپنے اس دورے سے مطمئن ہیں۔

ج : کیا؟ ہوں! لمبی سی آہ بھر کر ...

؎ بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

س : کیا آپ اس کو کافی نہیں سمجھتے کہ اردو زبان کے ایک بڑے اسکالر ہماری بھارت سرکار کے راشٹر پتی ہیں۔

ج : ؎ ابنِ مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

؎ ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

س : ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ہماری سرکار سے کچھ شکایات ہیں اور شاید آپ کی شان میں کوئی گستاخی ہو گئی ہے۔

ج : ؎ پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
ایک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

س : آپ کے بارے میں لوگوں میں بحث رہتی ہے کوئی کہتا ہے آپ مسلمان تھے کوئی آپ کو دہریہ کہتا ہے کیا آپ

اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں گے۔

ج : ے جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری

کہتے ہیں وہ مجھے رافضی اور دھری

دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی

شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

س : بس میں آپ سے آخری سوال کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ کیا آپ اب بھی شراب پیتے ہیں ؟

ج : ے غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

س : یقیناً گستاخی ہے مگر یہ واقعی آخری سوال ہے اس کے بعد میں اجازت چاہوں گا۔ ذرا اتنا بتلا دیجئے کہ آپ کمیونزم کے حامی ہیں یا سرمایہ دارانہ نظام کے، جیسا کہ لوگ آپ کو کہتے ہیں۔

ج : ے لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ہز مجسٹی لال قلعہ کے شہری سواگت میں

پروگرام کے مطابق آج دتی کے شہریوں کی طرف سے ہز مجسٹی کا سواگت تھا۔ ٹھیک پانچ بجے آپ قلعہ میں پہنچے تو دتی کے میئر نے آپ کا پرجوش سواگت کیا پھر سنسکرت میں خطبۂ استقبالیہ پڑھا گیا جس میں میئر صاحب نے ہز مجسٹی کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا " مہاماج گالب آپ آج جس اتہاسک ستھان میں پدھارے ہیں اس کو پراچین کال میں بھارت ماتا کے سپوت ایک سمراٹ نے بنایا تھا۔ جہاں انہوں نے اتنا بڑا لال کلا بنایا وہیں انہوں نے تاج محل اور کتب مینار بنا کر پورے سنسار میں بھارت ورش کا نام روشن کیا اور پورے سنسار کو گیان کا سبق پڑھایا لیکن ہمیں دکھ ہے کہ انگریز سامراج نے گلت اتہاس لکھکر ان میں عمارتوں کو مغل سامراج کی بنائی ہوئی عمارتیں بتلایا ہے، ورنہ ایسا ہر گز نہیں آج راکٹ کیا اور ایٹم بم کیا یہ سب کچھ انگریزوں نے ہم سے ہی لیا ہے ہمارے بھارد والے چرا کر لے گئے ہیں۔ اس کے بعد ڈپٹی میئر نے ہز مجسٹی کو گئو ماتا کی چاندی کی بنی ہوئی ایک مورتی پیش کی اس کے بعد بھنگڑہ ناچ اور لوک ناچ کا پروگرام پیش کیا گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ ہز مجسٹی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خون ٹپک رہا ہو۔ ہز مجسٹی نے دیکھا کہ جس قلعۂ معلّٰی میں کبھی وہ بہادر شاہ ظفر کے استاد کی حیثیت سے آیا کرتے تھے جہاں کبھی مینا بازار لگتا تھا اور شہزادیاں خرید و فروخت کرنے کے لئے آیا کرتی تھیں وہاں آج مونگ پھلیاں

سکو، سموسے اور چھوٹے گرم کی صدائیں سننے کو ملتی ہیں جہاں اردو زبان کا طوطی بولتا تھا وہاں خدا جانے کون کون بولیاں سنائی دیتی ہیں۔ ہز مجسٹی تاریخ کے اس بھیانک مذاق پر دل مسوس کر رہ گئے۔

ہز مجسٹی مشاعرے میں

دلی کے مایۂ ناز اور جلیل القدر شاعروں اور ادیبوں کی جانب سے ہز مجسٹی کے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ منعقد کی گئی، یہ تمام شعراء ایسے تھے جن کو پدم بھوشن، پدم شری کے قومی اعزاز سے نوازا گیا تھا اس مشاعرے میں شریک ہونے والے تقریباً تمام ہی شاعر نہایت اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے مشاعرے کے پنڈال کو خوب اچھی طرح سجایا گیا تھا۔ ہز مجسٹی کے بالکل پیچھے گاندھی جی، رام چندر جی اور کرشن جی کی مورتیاں پنڈال کے تقدس میں اضافہ کر رہی تھیں اور ہز مجسٹی کے سامنے ہارمونیم طبلہ اور ڈھولک رکھا ہوا تھا۔ سب سے پہلے ہز مجسٹی نے اپنے ہی ایک شعر سے اس عظیم الشان مشاعرے کا افتتاح فرمایا:

> ؎ حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
> مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

سامعین نے زبردست تالیاں بجائیں اور وہ داد دی کہ خدا کی پناہ اس کے بعد شاعر انقلاب بکھرشے ہوتے اور فیملی پلاننگ پر اپنی طویل غزل عطا کی جس پر پورا حال واہ واہ سے گونج اٹھا اس کے بعد ایک شاعر جو اپنا تخلص بھونچال کرتے تھے اسٹیج پر تالیوں کی گونج میں تشریف لائے اور الیکشن پر اپنا ایک بہت ہی خطرناک قسم کا قطعہ پڑھا اس کے بعد ایک صاحب اور تشریف لائے جو اپنا تخلص ہیجان کرتے تھے انہوں نے اپنی ایک غزل پنج سالہ پلان پر عطا فرمائی جس کی طوالت طول شب فراق سے ذرا زیادہ ہی تھی وہ تو بھلا ہو اسٹیج سیکریٹری کا کہ انھوں نے لوٹ مائک سامنے سے ہٹا لیا۔ اس کے بعد ایک شاعر گرتے پڑتے اسٹیج پر پہنچے اور اپنا کلام بلاغت نظام جو کہ شراب مغربی سے متعلق تھا عطا فرمایا، یہ آخری آئٹم تھا۔ کہتے ہیں کہ ہز مجسٹی نے کسی شاعر کو داد نہیں دی، جب شعراء نے احتجاج کیا تو ہز مجسٹی یہ شعر پڑھتے ہوئے اٹھ گئے۔

> ؎ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
> کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہز مجسٹی فلمی ستاروں کے جھرمٹ میں

شام غالب کے نام سے ہز مجسٹی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک عظیم ٹولی بمبئی سے دہلی آئی ہوئی

تھی جس کو دہلی کی پوری آبادی نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا حکومت نے اس جگہ تک بسوں کا خصوصی انتظام کیا تھا۔ پروگرام پانچ بجے شروع ہونے والا تھا، ہر فلمی ایکٹر اپنی جگہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میرا ہز مجسٹی سے ملاقات کرنا یا ان کو شرف ملاقات بخشنا ان کی سات پشتوں پر احسان کرنے سے کسی طرح کم نہ ہوگا پورا مجمع بڑی شدت سے انتظار کر رہا تھا کہ کب ہز مجسٹی تشریف لائیں لیکن عین موقع پر معلوم ہوا کہ ہز مجسٹی نے فلمی ستاروں سے ملنے سے صاف انکار کر دیا ہے اور اس بات پر سخت ناراض ہیں کہ حکومت نے ان کے پروگرام میں یہ آئٹم کیوں رکھا معلوم ہوا کہ عالم بالا کے سفیر تسعینہ برائے ہند نے حکومت ہند سے سخت احتجاج کیا ہے اور کہا ہے کہ حکومت ہند نے ہز مجسٹی کو ایسے لوگوں سے ملانا چاہا جن کے ساتھ بات کرنا بھی کوئی شریف آدمی پسند نہیں کرے گا چہ جائیکہ باقاعدہ ان سے معانقہ کیا جائے کیونکہ یہ لوگ پرانے زمانے کے میراثی، ڈھیاچی، بھانڈ، اور نقال ہی تو ہیں یا زیادہ سے زیادہ ان کی ترقی یافتہ شکل ہیں انہی لوگوں نے اب سے کافی دنوں پہلے ہز مجسٹی پر فلم بنا کر ان کی سخت توہین کی تھی۔ لہذا حکومت ہند نے اس احتجاج کی بناء پر یہ پروگرام واپس لے لیا جس پر تمام فلمی ستارے چراغ پا ہوگئے اور انہوں نے سخت مظاہرہ کیا اور ہز مجسٹی کا گھیراؤ کرنا چاہا بلکہ عدالت میں ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کرنے کی بھی کوشش کی لیکن حکومت نے فوراً دفعہ ۱۴۴ لگا کر حالات کو بگڑنے سے بچا لیا۔

ہز مجسٹی وگیان بھون میں

دوسرے دن آپ کے اعزاز میں ایک انٹرنیشنل عصرانہ دیا گیا جس میں ہر مکتبۂ فکر کے لوگ تھے میرا مطلب یہ کہ تقریباً ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں اور اداروں کے نمائندے تھے اگر نہیں تھے تو وہ لوگ نہیں تھے جو ہز مجسٹی سے خصوصی تعلق نہ رکھتے تھے اگر تھے بھی تو صرف دو یا تین جن کے منہ پر مصلحت نے علی گڈھ کے بھاری بھاری تالے ڈال دیئے تھے اس عصرانے میں لوگوں نے اپنے مقالوں میں ہز مجسٹی کی بین الاقوامی خدمات کو سراہا تھا کسی نے فرمایا کہ آپ خالص کمیونزم کے حامی ہیں کوئی بول گویا ہوا کہ کٹر سرمایہ دار ہیں اور امریکہ کے زبردست حامی، کسی نے انکشاف کیا کہ خالص سیکولر ہیں اور کسی کا ارشاد تھا کہ ہز رائل سوشلسٹ ہیں اس کے بعد ہز مجسٹی کی آنکھوں ہی کے سامنے آپ کے کلام کا بڑے اطمینان سے پوسٹ مارٹم کیا گیا اور ہز مجسٹی اُف تک نہ کر سکے۔ اس کے بعد ہز مجسٹی کھڑے ہوئے اور حاضرین کی ان نوازشات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بس اتنا ہی فرمایا۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

ہز مجسٹی کو بنارس یونیورسٹی کی طرف سے شاستری کی ڈگری۔

ہمارے نامہ نگار نے بتایا کہ آپ کو بنارس یونیورسٹی کی طرف سے کانووکیشن کے موقع پر جس میں آپ نے ایڈریس پڑھا تھا ایک شاستری کی ڈگری بھینٹ کی گئی۔

ہز مجسٹی "دِلّی کالج" میں

؎ سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

جس کالج کے پرنسپل نے کبھی ہز مجسٹی سے ملنا تک گوارا نہیں کیا تھا اسی کالج کے جملہ افراد آج ہز مجسٹی کے انتظار میں اپنی آنکھیں فرش راہ کئے ہوئے تھے۔ جی ہاں یہ کالج وہی ہے جہاں ۱۸۴۲ء میں ہز مجسٹی بحیثیت اردو لکچرر کے مقرر ہو کر آئے تھے مگر اس زمانے کے پرنسپل جب استقبال کے لئے باہر نہیں آئے تو ہز مجسٹی اپنی پالکی واپس اٹھوا کر الٹے پھر آتے تھے لیکن آج کالج کا ہر شخص آپ اُن کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ آج ہز مجسٹی کے اعزاز میں کالج ہال کے اندر تمام طلباء کی جانب سے ایک شاندار استقبالیہ دیا جانے والا تھا۔ جب ہز مجسٹی کالج میں تشریف لائے تو کالج کے طلباء اور طالبات نے پرجوش استقبال کیا۔ ہز مجسٹی نے حسن و عشق کو اس طرح ایک ساتھ دیکھا تو بے ساختہ کہہ اُٹھے ؎

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

بعد میں آپ کو بتایا گیا کہ یہ کو ایجوکیشن کی برکتیں ہیں کبھی آپ کچھ اور سمجھیں۔ اب ہم لوگ کافی مہذب ہو گئے ہیں وہ دور گیا جب ہم پردہ جیسی دقیانوسیت کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ ہز مجسٹی دل ہی دل میں ان طلباء اور طالبات پر رشک کرنے لگے کاش میں بھی حسن سے آشنا ہی قریب ہوتا اور میں بھی اس دور میں پیدا ہوتا مگر ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہز مجسٹی نے پورے کالج کو گھوم پھر کر اچھی طرح دیکھا اس کی ترقیات پر ایک نظر ڈالی دوران گفتگو طلباء کے کارناموں کا بھی ذکر آیا کہ ہمارے یہ ہونہار طلباء سال میں چھ مہینے اسٹرائک پر رہتے ہیں اس پر ہز مجسٹی زیر لب مسکرا کر رہ گئے اور فرمانے لگے یہ بھی تو تہذیب نو کی برکتیں ہیں۔ اس کے بعد ہال میں پروگرام شروع ہوا اور طالبات نے خود ہز مجسٹی کی غزلیں ساز و آہنگ کے ساتھ پیش کیں تو ہز مجسٹی کی زبان پر آہی گیا۔ ؎

ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

پروگرام ختم ہوا تو ہز مجسٹی کو تمام طلباء اور طالبات نے چاروں طرف سے گگھیر لیا اور آٹوگراف کا مطالبہ کیا۔ ہز مجسٹی کو مجبور ہو کر آٹوگراف دینا پڑا۔

؎ لکھتا ہوں اسدؔ سوزش دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

اس کے بعد ہز مجسٹی کے ساتھ کالج کے لان میں ایک گروپ فوٹو لیا گیا۔

سنتے ہیں کہ ہز مجسٹی کو ان کے دِلّی کے پورے پروگرام میں کہیں بھی بادۂ ناب یا بنت عنب پیش نہیں کی گئی جب کالج کے پروگرام میں کوکا کولا اور چائے پر ٹرخا دیا گیا تو ہز مجسٹی سے برداشت نہ ہو سکا اور آخر کو جاتے جاتے شکایت کر ہی بیٹھے۔

؎ میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا۔

راشٹرپتی کی طرف سے ہز مجسٹی کو پدم بھوشن کا اعزاز

سنا ہے کہ بھارت سرکار نے راشٹرپتی کے ہاتھوں ہز مجسٹی کو پدم بھوشن کا اعزاز دینا چاہا تو ہز مجسٹی نے یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ مجھے پدم بھوشن دینے سے بہتر یہ ہے کہ اردو کو اس کا حق دیدو۔

ہز مجسٹی اور پردھان منتری کے درمیان تبادلۂ خیال

ہز مجسٹی نے پردھان منتری سے بین الاقوامی مسائل پر گفتگو فرمائی آپ نے اپنے موقف اور ملکی پالیسی کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے اس طرح فرمایا۔ ؎

ہر گز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
آزردہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل

مشترکہ کمیونکے

ہز مجسٹی کے دورے کے اختتام پر جو مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا وہ ذیل میں دیا جا رہا ہے جو دونوں ملکوں کی پالیسی کا علم بردار ہے۔

ڈسنو گر بُرا کہے کوئی — نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

ہز مجسٹی کی اپنے وطن کو واپسی

ہز مجسٹی اپنا سات روزہ دورہ مکمل کرنے کے بعد اپنے وطن عالم بالا روانہ ہو گئے آپ کو رخصت کرنے کیلئے پالم پر راشٹرپتی وزیر اعظم اور تمام اراکین کابینہ اور معززین شہر موجود تھے آپ کو پورے سرکاری اعزازات کے ساتھ رخصت کیا گیا

بھارت سرکار کی طرف سے سرکاری شاعروں کا شکریہ

حکومت ہند نے ان تمام سرکاری اور نیم سرکاری شاعروں اور راہبوں کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے اردو کی اس برسی کو کامیاب بنانے میں اپنے ضمیر اور ایمان کو قربان کر کے پکی قوم پرستی اور قومی یکجہتی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ حکومت کے نمائندے نے کہا کہ حکومت امید کرتی ہے کہ آئندہ بھی آپ لوگ ایسے کار خیر میں حصہ لینے کے لیے حکومت کی ہر آواز پر لبیک کہیں گے۔

شمس الحق عثمانی

فروری، ۱۲ ـ (۱۸۶۹)

ادہ ! کاغذ اڑ گئے ! ــــــــ وہ آجائے تو

یکجا کر دے ــــــ کاش ہیں ہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاغذ !

میں !

کاغذ ! میں !

ہیں ... ادہ ... کاغذ

کاغذ اور میں

{ ان سے میرا رشتہ ؟

رشتے ؟؟

کیا کاغذ میرے منتظر تھے ــــــــ کیا میں اسی لئے ہوں ۔ ۔ ۔ ۔/ (تھا) ؟

(یا رہوں گا ؟)

تو پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں کیا ہوں

میں کیا ہوں

میں کیا ہوں

میں کیا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کیا میں ہی منتظر ہوں .... ؟ ـــــــــ تو میرا منتظر کون تھا ؟

سفیدی ؟

سیاہی ؟

اوراق ؟

؟ ؟ ؟

؟

(میرے پردے)

(نقاب)

ہاں ......

..... ہاں .....

اِک گونہ بے خودی

نقاب

کوئی چہرہ نہ دیکھ سکا

اور

پھیلتی ہوئی آنکھیں ۔ پھٹے ہوئے منہ ـــ کھنچے ہوئے لب

چہرہ ! ـــ چہرہ ! ـــ چہرہ !

چہرہ چہرہ پردے

پردے پردے چہرے

اُف ! ....

احتیاط کی گھٹن ..... اُف !.!.!.

..... جوں کی توں رہی !

باگیں کھنچ رہی ہیں !

میں کیوں ہوں / تھا ؟

رعشہ

تھرتھراہٹ

؟؟ ——— روانگی !

نہیں

شاید

حق اور ادائیگی

حق کس کا ہے ؟

(کس پر !) (حق ناکردگی !)

رنگ پورے ہو چکے ہیں

صبح ہونے والی ہے

...... علاج !

عرصۂ آفاق تنگ !

دریا پکار رہا ہے

در و دیوار موجود رہے

(..... ہوتی ہے رواں اور ——)

آج پھر میری رونکاری ہے

مگر میرا تو ہر لباس ....

پیراہن

فــریاد

تصویر

!!!

پیراہن اور میں

میں اور پیراہن :

میں اور پیراہن :

پیراہن اور میں :

میں اور پیراہن : ......

اُف یہ دھمک !

کوئی نہیں

(کوئی نہ ہو!)

کیا ہے یہ

میں! یہ، وہ!

سفر، راہ، منزل (؟)

جانا نہیں کیا ہے

اگر ہوتا ہی نہ تو ......

تو کیا تھا؟

نہ ہوتا تو ....

لہریں!

آوازیں!!

دھماکے!!!

سب ڈوب رہا ہے، دھنس رہا ہے

ٹوٹ ٹوٹ کر گرتا ہوا سب کچھ برف کی مانند گھلتا جا رہا ہے۔

مُعَیَّنہ دن

سفیدی جو سیاہ ہوئی

سیاہی حفاظت ہے

...... رُک گئے . . . . . .

. . . جو . . . جو . . . . . جو . . . . . جو . . . . .

فروری ۱۳، ۱۸۶۹ء

• • • • سیلابِ گریہ، درپئے دیوار و در ہے، آج

فروری

۱۴

(۱۸۶۹)

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم ——— ••••••

اس کے بعد ———

اِک لمبی چپ ....

اور تیز ہوا کا شور

قاضی اظہار احمد صدیقی

"مرزا غالب کی خطوط نگاری"
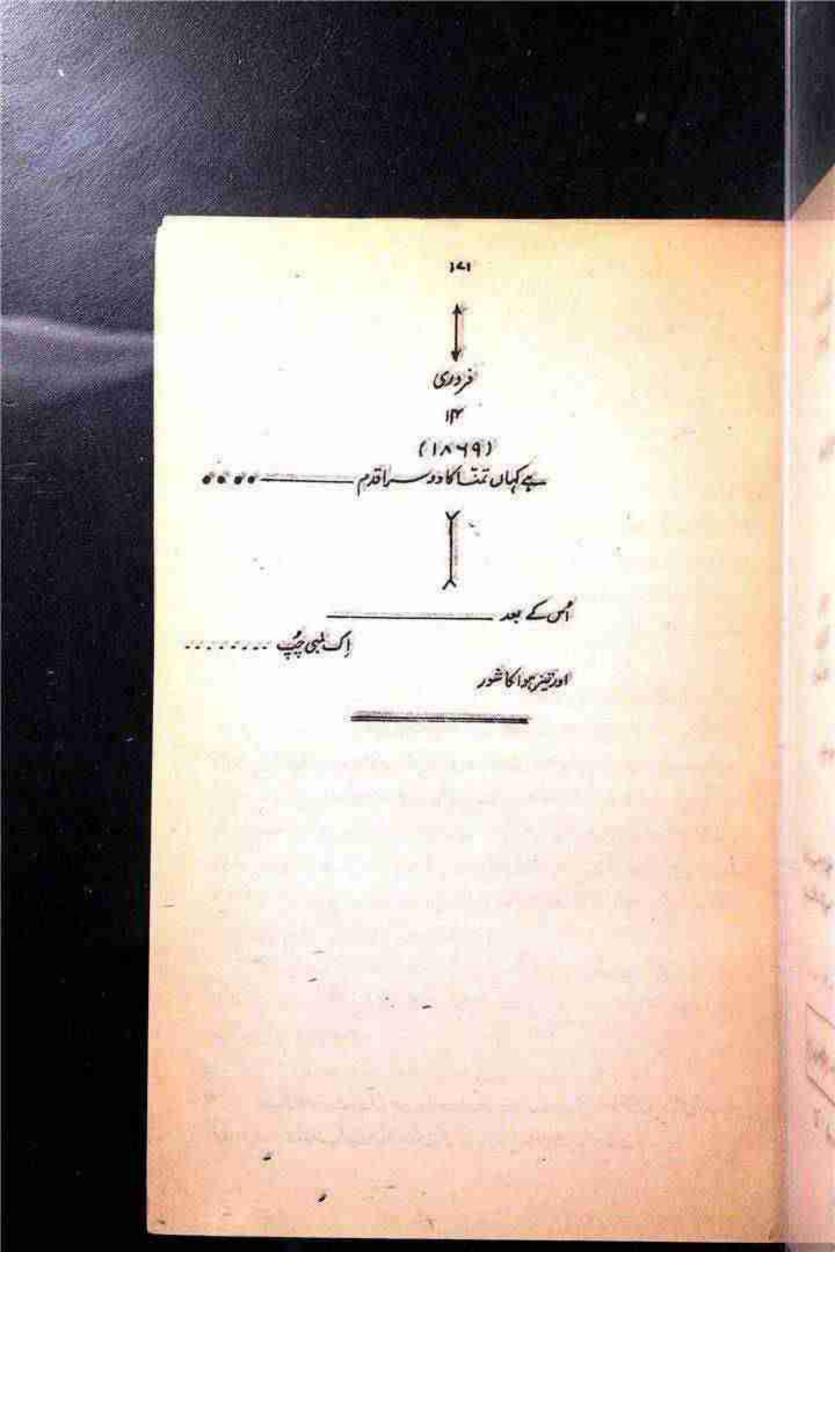
خط لکھنا سوسائٹی کی عام ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت ہے۔ ہر شخص کو خط لکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ سلاطین۔ وزرا۔ اراکین سلطنت۔ مذہبی پیشوا غرض سب نے خطوط لکھے اور لکھائے ہیں۔ اور ان میں بہت سے لٹریچر کی جان اور ادب العالیہ مانے جاتے ہیں۔ یہی حال اردو زبان میں غالب کے خطوط کا ہے۔ انہیں کی بدولت غالب اردو نثر نگاروں میں بھی امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خطوط نگاری میں غالب کا منفرد مقام ہے وہ اپنے انداز کے موجد اور خاتم ہیں۔

غالب سے پہلے اور ان کے زمانہ میں بھی خطوط لکھنے میں بڑے تکلفات برتے جاتے تھے۔ کئی کئی لائنوں میں بڑے بڑے القاب و آداب لکھنے کے بعد کہیں مطلب بیان کیا جاتا تھا۔ جیسے "جناب والا۔ صاحب قبلہ کونین وکعبہ دارین۔ معظم ومحترم فرزندانِ مخدوم وستارِ مکرمتیان دام ظلکم العالی۔ بعد تعظیم وتکریم آداب غلامانہ بجا کر یہ عبد عاجز و ناچار خدمت بابرکت باپ عالی میں بصد عجز ونیاز عرض پیرا ہے کہ یہاں بفضلہٖ تعالیٰ خیریت ہے۔ اور خیر و عافیت جناب واجب الاعظام کی بدرگاہ رب العزت نیک خواہاں ہے۔۔۔۔ !" غرض اس قسم کی طومار بندی کے بعد نفسِ مضمون آتا تھا۔ اور یہی طریقہ رائج تھا۔ ہر طبقہ کے لوگ اس قسم کے خطوط لکھتے تھے اور ان کو پسند کرتے تھے۔ لیکن جب غالب نے اردو زبان میں خط لکھنا شروع کئے تو انہوں نے اپنا انداز یکسر و بیک قلم بدل ڈالا۔ ان کے یہاں تعزیت ہو تہنیت۔ معمولی مزاج پرسی ہو یا اہم ادبی مسئلہ، ہر جگہ مرزا کی شوخی وظرافت موجود ہے۔

القاب وآداب نہایت مختصر بلکہ بعض جگہ بالکل ہی ندارد۔ طرز تحریر ایسا سادہ کہ جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے بات چیت کر رہے ہیں۔ چنانچہ غالب خود ایک جگہ خط میں لکھتے ہیں کہ میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ جیسے وہ کہتے ہیں۔

• "ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

غالب کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اپنے اور مکتوب الیہ کے درمیان فاصلہ ختم کر دیا خط میں مکتوب الیہ کو کچھ اس انداز سے مخاطب کرتے ہیں گویا وہ ان کے پہلو بہ پہلو یا مقابل تشریف فرما ہے۔

اُن کی اسی سادگی اور برجستگی نے انھیں سب سے منفرد کیا اور اس میں شوخی اور ظرافت نے ایک نئی کیفیت پیدا کردی جو ان سے پہلے کسی کے یہاں نہیں ملتی۔ القاب و آداب کے علاوہ اصل مضمون میں بھی سادگی اور بے تکلفی موجود ہے۔

میر مہدی کے نام خط لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "بھائی تم نے بخار کو کہیں آنے دیا۔ گیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا۔ جو تم مانع نہ آئے۔" لیکن اس خط میں مکالمہ کی مثال یہ ہے کہ "حکیم اشرف علی بھی آگئے تھے۔" کہتے تھے کہ "میں نے نسخہ لکھ کر آج ڈاک سے بھیج دیا ہے۔" کیونکہ یہ خط بھی آج ہی روانہ ہو رہا ہے کیا عجب ہے کہ دونوں خط ایک دن بلکہ ایک وقت پہونچیں۔ دل تمھارے واسطے بہت کڑھتا ہے۔ حق تعالیٰ تم کو جلد شفا دے۔ اور تمھاری تندرستی کی خبر مجھ کو سنادے۔"

اس کے علاوہ ایک دوسرا خط اپنے ایک دوست کے نام تحریر کیا ہے جو برجستگی، عبادت آرائی اور ظرافت کی مثال ہے ایک جملہ دوسرے میں کس خوبصورتی سے پیوست ہوتا چلا گیا ہے ساتھ ساتھ حسین طنز بھی ہے۔

"او میاں سید زادہ۔ دلی کے عاشق دلدادہ۔ ڈھتے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے۔ نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں۔ ذوق کہاں۔ مومن کہاں۔ ایک آزردہ سو وہ خاموش۔ دوسرا غالب وہ خود مدہوش۔ نہ سخن وری نہ سخن دانی کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی۔ وائے دلی بھاڑ میں جائے دلی۔

سنو صاحب پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خاں ولد سردار خاں۔ ولد دلاور خاں اور نانا اس احمد حسین خاں کے غلام حسین خاں ولد مصاحب خاں۔ اس شخص کا حال از روئے تحقیق شرح اور مفصل لکھو تو کیا ہے معاش کیا ہے۔ طریق کیا ہے۔ احمد حسین خاں کی عمر کیا ہے۔ لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے۔ جمعیت کا کیا ڈھنگ ہے۔ بھائی لکھو اور جلد لکھو۔"

اس خط کا انھوں نے صرف ایک شخص کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے اس کو کتنے اچھے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ کہ پڑھنے والے کا دل خوش ہو جائے۔ اس کے بعد اس خط میں دوسرا انداز بیان ہے۔

"کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی۔ اور اگر کسی طرح نہیں مانتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہ آتے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ کیا سبب دس بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا۔ یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو یا نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔"

اس خط میں بھی انھوں نے اپنے دوست کو کتنے بے تکلف انداز میں مخاطب کیا ہے۔ ہر لفظ سے خلوص مترشح ہے اور پیار کے پھول بکھرے پڑے ہیں۔

ایک خط میں مرزا قربان علی بیگ خاں صاحب سالک کو اپنی پریشانی اور کرب کا حال لکھتے ہیں، لیکن اس دور میں بھی مزاح کا دامن پکڑے ہوئے ہیں انداز تحریر نرالا گویا غالب کوئی تیسرا شخص ہے۔

میری جان!

کن اوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو بیٹ چکا ہے اب چچا کو بھی رو۔ تجھ کو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشائی ہو گیا ہوں رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے جو دکھ مجھے پہونچتا ہے تو کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں آج دور دور تک میرا جواب نہیں لے اب قرض داروں کو جواب دے سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے از راہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے "جنت آرام گاہ" و عرش نشیں خطاب دیتے ہیں کیونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں" اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے او غلاں صاحب، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لئے جاتا تھا یہ بھی سوچا ہوتا کہ کہاں سے دوں گا۔

اس خط میں مرزا کی مالی پریشانی اور لاچاری ظاہر ہوتی ہے لیکن غالب نے اندانا شگفتہ سوتی اختیار کرکے تحریر کو زعفران زار بنا دیا ہے اور ساتھ ہی زمانہ کے ہاتھوں فنکاروں کی ناقدری اور شرفاء کی بے حرمتی پر بھی بھرپور طنز ہے اور ساتھ ہی خود پر بھی۔

غالب کا رنگ نثر و نظم سب سے جدا ہے۔ خیال کی بلند پروازی، معنی کی ندرت، شوکت الفاظ غالب نے نثر کو جو تحریر کا نرالا انداز دیا اس راہ پر چلنے کی غالب کے زمانہ میں اور غالب کے بعد بہتوں نے کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے کچھ تو منزل کے تصور سے دو چار گام چل کر بیٹھ گئے کچھ گم کردہ راہ ہو کر رہ گئے لیکن کامیابی کے ساتھ منزل تک کوئی نہ پہونچ سکا۔

غالب کی عظمت مسلمہ ہے جس کو نہ صرف ہندوستان نے بلکہ تمام عالم نے تسلیم کیا ہے اور آج یہ مرد مجاہد دنیا سے خراج تحسین و عقیدت وصول کر رہا ہے یہ اس کی عظمت کا واضح ثبوت ہے۔ گو آج ہم غالب کو ایک عظیم اردو شاعر کے نام سے خراج دے رہے ہیں لیکن اگر غالب کو صرف ان کے خطوط کے آئینہ میں دیکھا جائے تب بھی غالب جاوید ہے۔

ایس۔ ایم۔ ظفر
(بی۔ اے ،سال اول)

غالب اور ان کی اِنفرادیت

غالب جس دور کی پیداوار ہیں۔ وہ دور زبان کی ثقیل بندش مفہوم کی پیچیدہ ادائیگی اور قواعد ردیف قوافی کی پابندی کا دور تھا۔ آج کی طرح عام فہم زبان میں کسی مسئلہ کو کہدینا یا سادگی کے ساتھ مطلب کی ادائیگی کو اساتذۂ فن حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس دور کا اچھا شعر وہی ہوتا تھا جس میں معنی کی پیچیدگی الفاظ کی خوبصورت بندش بڑی ردیف اور مشکل قافیہ کے ساتھ نبرد آزمائی کی گئی ہو۔ غالب کے دور میں شاعری کی معراج بہادر شاہ ظفر کا دربار تھا۔ اور حضرت ذوق بہادر شاہ کے استاد تھے۔ بالفاظِ دیگر وہ دور ذوق کی شاعری کا دور تھا جہاں شعر سے زیادہ استادی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اس دور میں ذوق کو چھیڑنا دراصل زبان اور فن کو چھیڑنا تھا۔ ذوق کے فن اور ان کی استادی سے بہرحال انکار ناممکن ہے لیکن یہ غالب ہی تھا جس نے ذوق جیسے استاد کو بھی جھنجوڑ کر رکھدیا جس نے ؎ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

کہہ کر للکارا بھی اور ؎

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیا

کہکر اپنے آپ کو خوبصورتی سے بچایا بھی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان حالات میں بہادر شاہ کے استاد کا مقابلہ آسان نہیں تھا۔ یہاں ضرورت تھی فن اور فنکارانہ صلاحیتوں کی اور اسی پیچیدہ رنگ میں بڑھنے کی جو اس دور کی کسوٹی تھا۔ مگر غالب نے یہاں اپنی شاعری کو ایک علیحدہ مقام پر لانے کی کوشش کی اپنی شاعری میں انفرادیت لانے کے لئے انہوں نے فارسی کے شاعر بیدل کے رنگ کو اپنایا اور بسا اوقات یہاں تک تقلید پر اترے کہ نہ صرف خیال بلکہ اپنی فارسی دانی کے زعم میں ایسے شعر بھی کہدے جو صرف رسماً ہی اردو کے کہے جاسکتے تھے۔ اس بارے میں انہیں کے ایک شاگرد نواب مصطفٰے خاں شیفتہ ایک جگہ رقمطراز ہیں۔

"دراوائل حال بتقاضائی طبع دشوار پسند بطرز مرزا عبدالقادر بیدل سخن میگفت و وقت آخر سیتہا میکرد آخرالامر ازاں طریقہ اعراض کردہ اندازے بطرح ابداع نمودہ۔"

مگر جب اس طرز پر کہے گئے اشعار ان کی ہنسی اڑائے جانے کا باعث بننے لگے تو انہوں نے اپنے انداز کلام کو بدلا۔ فارسی کے نزول کے ساتھ ساتھ غالب بھی گیسوئے اردو کی طرف مائل ہوئے۔ اپنے کو دوسرے شعراء سے الگ رکھنے کی خواہش نے زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے ملکر ان کی انفرادیت کو جنم دیا۔ اس بارے میں ایک جگہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ان الفاظ میں رقمطراز ہیں۔

"مرزا غالب کے کلام کی اصل خوبی ان کے طرز ادا کی جدت اور انوکھا پن ہے انہیں معمولی بات بھی اگر کہنا ہے تو اپنے خاص رنگ میں کہتے ہیں۔ جو جذبہ کی تاثیر اور خیال کی دلکشی میں رچا ہوتا ہے۔ الفاظ کی بندش اور تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی علیحدہ راہ اختیار کی ہے۔ وہ اپنے اسلوب بیان کے خود موجد ہیں۔"

غالب کی نظروں نے زندگی کے ہر پہلو کا مطالعہ کیا۔ جا بجا ان کے اشعار میں ایسے فکری عناصر ملتے ہیں جو تصوف کے مروجہ خیالات سے مختلف ہیں۔ انہیں مختلف خیالات کی بنا پر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو غزل میں تفکر غالب کا مرہونِ منت ہے۔ اور اس تفکر میں استعارے یا تشبیہہ کی لطافت شعر کی دلکشی کو بڑھا دیتی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔ جیسے شعر نہ گل ہوں نہ پردہ ساز ؛ میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ایک مغربی نقاد کے قول کے مطابق فن میں انفرادیت بغیر شخصی انفرادیت کے ممکن نہیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ فن میں شخصیت کا نمایاں کردار پایا جاتا ہے۔ لیکن شخصیت کا مسئلہ بھی بڑا عجیب و غریب ہے۔ شخصیت کا دار و مدار فنکار کے احساسات پر ہوتا ہے۔ بعض جگہ فنکار کے احساسات اتنے جاگ جاتے ہیں کہ وہ سماج کو دیکھتے دیکھتے اپنی شخصیت کی تعمیر یا تخریب سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ لیکن غالب کے یہاں اس سے بالکل مختلف شکل ہے۔ وہ اپنی شخصیت کی ترتیب میں بہت ہی حساس تھے انہوں نے اپنی شخصیت کو ایک منفرد رنگ دیا۔ شخصیت کی تخلیق میں سہاروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب نے نسلی شجاعت، خاندانی نجابت اور موروثی فضیلت پر فخر کیا ہے۔ ان کو اپنی فنکارانہ بصیرتوں اور اختراعی صلاحیتوں پر بھی ناز تھا۔ اسی احساس نے ان کی شخصیت کو اہمیت بخشی اور اسی احساس نے انہیں زندگی، علم اور فن کی حقیقتوں سے روشناس کرایا۔ یہی طرزِ احساس انہیں ہر جگہ دوسروں سے منفرد کرتا ہے۔ اپنا یہ امتیاز غالب کو بہت پسند تھا۔ اسی امتیاز نے غالب کی شاعری میں انفرادیت کو جنم دیا۔ یہی وہ طرزِ فکر تھا۔ جس نے دنیا کو بازیچۂ اطفال بنا دیا اور غالب نے فخر سے سرشار ہو کر خود ستائی کے انداز میں کہا۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے ؛ ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے
ایک کھیل ہے اورنگِ سلیماں میرے نزدیک ؛ ایک بات ہے اعجاز مسیحا میرے آگے

ان کا یہی احساس ان سے کہلواتا ہے۔

؎ یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے ؛ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

غالب کی انفرادیت اس میں ہے کہ اس نے شاعری میں سماجی شعور کو پہچانا۔ مادی تصور کو پیش کیا اور فکر کو شاعری کا عنصر اور مواد بنایا۔ ؎ نغمہ ہائے گل ہی کو اے دل غنیمت جانیئے — بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

لہٰذا غالب نے اس صدی کی اردو غزل کو حیات و کائنات کی حقیقتوں کی طرف موڑا ہے۔ دراصل فانی، ثاقب اور فراق کو غالب ہی کی شاعری سے راستہ ملا ہے۔ حالانکہ اقبال کے یہاں بھی فکر اور خیالات کے گوشے ہیں۔ مگر وہ غالب کا براہِ راست اثر نہیں۔ غالب کے معاصرین میں تقریباً سبھی حالات کو دیکھ کر شاعری میں پناہ لیتے تھے۔ نئے قافیہ باندھ کر یا محاوروں سے کسی مضمون کو نظم کر کے خوش ہوتے۔ نیرنگ روزگار یا فلک کج رفتار کا ذکر بھی کرتے تو یہ ظاہر ہو جاتا تھا کہ اپنے موجودہ حالات سے پریشان ہیں۔ لیکن وہ سب قسمت کا لکھا کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ فکر کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ مثلاً رند کی مشہور غزل کا شعر ہے۔

پھولا ہی پھلا چھوڑ کے اٹھ جاؤں چمن میں — اللہ دکھائے مجھے عالم نہ خزاں کا

یا

فلک کے ہاتھ سے میں سرزمیں پہ بھاگ کے پہونچا — یہی واں بھی زمیں پائی یہی واں آسماں پایا

غالب اپنے ماحول سے پریشان ہے۔ لیکن اس کے یہاں دوسروں کی نسبت ایک نمایاں فرق پایا جاتا۔ وہ اپنے غم کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

؎ ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا — کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

یا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا — نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانوں پر دھرا ہوتا

کبھی کبھی وہ اپنی طبیعت کے زور میں غم سے تسلی حاصل کرنے اور فتح پانے کی کوشش کرتے ہیں تو سیاہ بادلوں میں نور کی ایک کرن نمایاں ہو جاتی ہے۔ ؎

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مالک رام کے الفاظ میں

"غالب کی عظمت اس امر میں نہاں ہے کہ انہوں نے مسلمہ ادبی روایتوں سے اپنا دامن چھڑایا"۔

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کا میلانِ طبع انفرادیت کی طرف تھا جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ انکی اس انفرادیت کا اعتراف اقبال نے اس طرح کیا ہے۔ ؎ —

شاہدِ مضمون تصدق ہے تیرے انداز پر — خندہ زن ہے دلّی گلِ شیراز پر

غالب کی شاعری کے موضوعات کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ حسن و عشق کے ساتھ ان کے یہاں تصوف کا رجحان بھی موجود ہے۔ لیکن جس چیز نے غالب کو اردو شاعری میں یہ مقام بخشا۔ وہ صرف ان کی انفرادیت ہے۔ اگر غالب کے کلام میں یہ انفرادیت نہیں پائی جاتی تو آج ان کا مقام بھی مومن۔ ذوق اور ناسخ کے برابر ہوتا وہ سو سال بعد کی بات کہنے والا شاعر تصور نہیں کیا جاتا۔

اکبر علی ہاشمی

موازنہ غالبؔ و مومنؔ

اُردو ادب میں غالبؔ کی عظیم شخصیت نے جو مقبولیت حاصل کی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر میرؔ نے غزل کو سوز اور درد دیا تو غالبؔ نے اسے فکر اور ہمہ گیری سے آشنا کیا۔ کسی انگریز ادیب کا کہنا ہے کہ وہ بات کبھی عظیم نہیں ہو سکتی جس میں فلسفہ نہ ہو۔ غالبؔ نے غزل کو محض حدیث دلبری تک محدود نہیں کیا بلکہ اسے حدیثِ زندگی اور حدیثِ کائنات بنا دیا۔ انھوں نے غزل کو بے پناہ موضوعات دیئے ان کی غزل ایران کے متوسطین شعراء کی غزل کی طرح جامع اور مکمل نظر آتی ہے۔ غالبؔ نے موت، زندگی، محبت، دوستی، عشق، غم جاناں اور غم دوراں سب پر اتنے بلیغ اشعار کہے کہ ان کے اکثر اشعار ضرب المثل بنے ہوئے ہیں۔ وہ ایک ہمہ گیر شاعر ہیں عشق اور محبت کی وادیوں سے نکل کر وہ کائنات کے بکھرے ہوئے عناصر کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کے متعلق اپنا مخصوص نظریہ رکھتے ہیں۔ بس یہی غالب کا فلسفہ ہے۔ زندگی کو وہ ایک فریب اور وہم سمجھتے ہیں۔ اور اس میں نہ الجھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ہستی کے فریب میں نہ جا ئیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

ان کی باریک بین نظر عشق کے مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں پر پڑتی ہے اور وہ بڑے حسن اور خوبی کے ساتھ ان دونوں کے فرق کو نمایاں کرتے ہیں۔ مادی طور پر عشق محض ایک پاگل پن ہے لیکن روحانی طور پر ایک ایسا چراغ ہے جو ہماری روح کو جگمگا دیتا ہے۔ اور جس کے بغیر انسانی زندگی بے مزہ اور ناکام ہے

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
(مادی تصور عشق)

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز ہے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
(عشق کا تصور روحانی)

زندگی اور غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ غم کے بغیر زندگی میں پھیکاپن اور بے رنگی پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے جگر مراد آبادی کا کہنا ہے ؎

دل گیا رونق حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی

اسی غم کو غالب بھی زندگی کے میراث سمجھتے ہیں ان کا نظریہ بھی یہی ہے کہ زندگی اور غم دونوں لازم ملزوم ہیں۔ غم کو زندگی سے الگ نہیں کیا جاسکتا ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس لئے وہ غم سے گھبراتے نہیں بلکہ غم کی اس منزل پر پہنچ جانا چاہتے ہیں جہاں درد کا احساس فنا ہو جاتا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

وہ مشکلوں سے گھبرانے کے بجائے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ان مشکلوں میں بھی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے ذریعہ ایک ایسا پہلو نکال لیتے ہیں کہ غم اور رنج بھی خوشی کا باعث بن جاتا ہے ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

گھر کے لٹ جانے پر رہزن کو دعائیں دیتے ہیں ؎

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

غرض غالب کی شخصیت ایک ہمہ گیر شخصیت ہے ان کی غزل میں رنگا رنگی اور بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ وہ کائنات کے رموز و اسرار، گل و ساغر کے پردے میں بیان کرتے ہیں ان کے بیان میں فکر کی پرواز اور خیال کی نزاکت دونوں موجود ہیں غالب نے اردو شاعری میں ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی اور وہ اسکول ہے فکر و فلسفہ کا جس کی وجہ سے غزل صحیفۂ زندگی بن گئی۔

مومن

مومن غالب کے ہم عصر شاعر ہیں انھیں خود بھی اپنی عظمت کا پورا پورا احساس ہے ؎

مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اس شعراء کے امام کو

مومن اسی نے مجھ پہ دی برتری کسی کو　　　جو پست فہم تیرے اشعار تک نہ پہنچا

مومن کا یہ خیال محض شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ حقیقت ہے اسی بات کی توضیح کرتے ہوئے مولانا حالی لکھتے ہیں " اردو ادب میں مومن کی شخصیت ایک منفرد مقام کی حامل ہے نازک خیالی اور بلند پروازی میں وہ غالب سے کسی طرح کم نہیں بلکہ کہیں کہیں غالب سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں۔

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی لکھتے ہیں کہ غزل کو عشق و محبت کے موضوع سے باہر لے جانا کمال سخن نہیں بلکہ یہ صرف وہی شاعر کرتے ہیں جو محض عشق اور محبت کے موضوع نئے نئے انداز سے بار بار پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ غزل کا اصل موضوع عشق ہے اور اس میں نئے نئے خیالات پیدا کرنا غزل گو کا کمال ہے۔" اس اعتبار سے مومن کی غزل اردو کے تمام شاعروں سے بڑھ جاتی ہے۔ ان کی غزل کا موضوع عشق ہے۔ اور یہ عشق بھی خالص مجازی لیکن اس ایک موضوع میں مومن کی بے پناہ صلاحیت نے ایسی رنگارنگی پیدا کی ہے کہ ان کا کوئی شعر گذشتہ مضمون کا اعادہ نہیں معلوم ہوتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں۔

" اگر مجھ سے کہا جائے کہ تم کسی ایک شاعر کا دیوان اٹھاؤ تو میں مومن کا دیوان اٹھاؤں گا۔ مومن کے یہاں ہمیں عشق و محبت کے بے شمار پہلو نظر آتے ہیں۔ اور مومن کی رنگینی اور شوخ طبیعت نے ان کے اشعار میں سحر اور طلسمی کیفیت بھر دی ہے ان کا بلند پرواز تخیل عام حدود سے بہت آگے نکل جاتا ہے اور وہ ہمیں تحیر کی منزل پر لے جا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ مومن کی یہ بلند پروازی تخیل پر ناسخ کی خیال آفرینی نہیں جس میں عقل حیران ضرور ہوتی ہے لیکن جذبات میں تحریک پیدا نہیں ہوتی اور شعر اثر و تاثیر سے خالی رہ جاتا ہے مومن کی خیال آفرینی میں بے پناہ سوز، جاذبیت اور کشش ہے جس کی وجہ سے ان کا شعر نہ صرف عقلی طور پر ہمیں حیران کر دیتا ہے بلکہ نشتر کی طرح ہمارے قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے مومن کی نازک خیالی کو واضح کرنے کیلئے مومن اور غالب کے چند ہم معنی اشعار نیچے دیئے جاتے ہیں جن سے یہ واضح ہو جائیگا کہ جس گہرائی تک مومن کی نظر جا پہنچی ہے اور جس جدتِ ادا سے مومن نے یہ شعر کہے ہیں غالب بھی اس طرح نہ کہہ سکے۔

غم اور زندگی

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں　　(غالب)

غالب کہتے ہیں کہ زندگی اور غم دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔ مومن اس بات کو ایک نئے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ غم کے بغیر زندگی مشکل ہے ہے

جیپ ٹھ کر کہاں اس پر محبت کی زندگی　　ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے۔　(مومن)

گالیاں

غالب محبوب کی گالیوں کو محض شیریں کہتے ہیں۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا (غالب)

مغموم اور افسردہ انسان کو نکہتِ گل بھی بری معلوم ہوتی ہے۔

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں (انشا)

لیکن جب مومن کا محبوب گالیاں دیتا ہے تو ان کی مغموم اور افسردہ طبیعت بھی بہل جاتی ہے اور اس مزاج میں بھی بری نہیں معلوم ہوتیں۔ یہ خیال غالب کے شعر میں بہت بلند ہو جاتا ہے جہاں صرف یہ کہا گیا ہے کہ شیریں لب سے گالیاں بھی شیریں نکلتی ہیں۔

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا (مومن)

دعا کا اثر الٹا ہونے پر غالب پچھتاتے ہیں کہ کاش ہم برائی مانگتے تو بھلائی ملتی ؎

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے (غالب)

مومن اس خیال میں جدتِ ادا سے حسنِ کمال پیدا کر دیتے ہیں۔

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ (مومن)

مومن غزل کی رنگینی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جبکہ غالب کے کچھ اشعار محض فکر و فلسفہ تک ہی محدود ہیں۔ ان میں غزل کی چاشنی اور رنگینی نہیں پائی جاتی۔ مومن کی غزل کی سب سے بڑی خوبی نزاکتِ خیال اور جدتِ ادا ہے اس کی بنیاد پر وہ فکرِ شاعرانہ میں اپنی مثال آپ ہیں وہ اپنے مطلب کی بات اس انداز سے کہہ جاتے ہیں کہ سننے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی دوسرے کو ہمدردی میں مشورہ دے رہے ہیں۔ مومن اپنے محبوب کو رقیب کی جانب دیکھنے سے روکنا چاہتے ہیں ؎

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں (مومن)

دعوتِ وصل یوں دیتے ہیں ؎

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں ۔۔۔ اتنا رہا ہوں دور کہ ہجران کا غم نہیں

محبوب کو ستانے سے باز رکھنا چاہتے ہیں ؎

خواہش مرگ ہو تو اتنا نہ ستانا ورنہ ۔۔۔ دل میں پھر تیرے سوا اور بھی انسان ہوگا

غرض مومنؔ نازک خیالی مضمون آفرینی اور جدت طرازی میں غالبؔ سے کسی طرح کم نہیں۔ بلکہ غالبؔ سے آگے نکل جاتے ہیں لیکن ان کا موضوع شاعری محض عشق تک محدود رہتا ہے اور صرف اسی وجہ سے وہ غالبؔ کے مقام کو نہیں پہنچتے۔ ضیا احمد بدایونی کی رائے میں غزل کو عشق تک محدود رکھنا کمالِ غزل ہے لیکن فارسی اور اردو میں شاعروں کو بلند مراتب حاصل ہوئے انھوں نے غزل کو وسیع موضوعات کے لئے اپنایا ہے۔ حافظؔ، سعدیؔ وغیرہ شعرائے ایران اور میرؔ جو خدائے سخن کہلاتے ہیں انھوں نے بھی غزل کو تصوف، عشق، غم روزگار اور دوسری بے شمار چیزوں سے وسیع کیا۔ اور جب ہم میرؔ کو خدائے سخن کہتے ہیں تو ہمیں دیگر شاعروں کو انھیں کے پیمانے پر پرکھنا چاہیے۔ یہاں بھی مومنؔ سے زیادہ غالبؔ میرؔ کے قریب نظر آتے ہیں۔ بلکہ وہ میرؔ کی تقلید کرتے ہوئے میرؔ کے رنگ میں فکر کی آمیزش کرتے ہیں۔ اور ایک نئی راہ نکال لیتے ہیں۔ میرؔ کی غزل صحیفۂ زندگی ہے اور غالبؔ کی غزل بھی صحیفۂ زندگی اور حدیثِ کائنات ہے مومنؔ اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس مقام کو نہیں پہنچ سکتے۔ مومنؔ عظیم شاعر ہیں، اس میں شک نہیں لیکن غالبؔ عظیم تر ہیں۔ مومنؔ کے یہاں غزل کے تمام فنی پہلو مسکراتے نظر آتے ہیں لیکن انکی مسکراہٹیں حسن و عشق کی بندشیں نہیں توڑتیں۔ وہ غزل کا کام صرف اظہار عشق سمجھتے ہیں اور وہ اس فن میں نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ غالبؔ سے آگے نظر آتے ہیں لیکن غالبؔ کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے غزل کو ہمہ گیری دے کر ایک آفاقی صنفِ سخن بنادیا انھوں نے غزل سے جو کام چاہا لے لیا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر مومنؔ غزل کو صرف حسن و عشق اور عشق مجازی کی بندش تک محدود نہ رکھتے تو وہ یقیناً عظیم ترین شاعر ہوتے غالبؔ کا یہی وصف انھیں تمام شعراء سے ممتاز بناتا ہے۔

شمس الدین صدیقی
(بی۔ اے۔ فاضل)

غالب خطوط کے آئینے میں

ماہ فروری میں ہندو بیرونِ ہند میں منائی گئی غالب صدی کی تقریبات کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ غالب ایک عظیم فلسفی شاعر تھے۔ غالب کے شہنشاہ تغزل ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ غالب کی تصویر کا صرف ایک رخ ہے، جس پر اتنا زیادہ زور دیا گیا ہے کہ ان کے دوسرے رخ یعنی نثر نگاری کو تقریباً نظر انداز کر دیا گیا۔ غالب صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اردو نثر میں ایک نئے طرز اور نئے اسلوب کے موجد بھی تھے۔ اردو ادب کی صنف شاعری میں جو مقام غالب کو حاصل ہے، ان کے خطوط صنف نثر میں وہی مقام رکھتے ہیں۔

اردو نثر غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے بعد جن مراحل سے گذر رہی تھی، اس میں فارسی اور عربی کا اثر بہت نمایاں تھا۔ عام طور پر فارسی زبان میں لکھنا پڑھنا ایک معیار تصور کیا جاتا تھا۔ چونکہ فارسی سرکاری زبان تھی اس لئے تبادلۂ خیالات اور باہمی معاملات کا اظہار یا تو فارسی میں کیا جاتا تھا یا فارسی آمیز زبان استعمال کی جاتی تھی۔ غالب بھی اس عام روش اور حاکمین کے تئیں خوشامدانہ ذہنیت سے خالی نہیں تھے۔ ابتداً وہ بھی فارسی ہی میں خط و کتابت کرتے تھے۔

غالب کی فطرت میں ذہنی اختراع اور جدت طرازی کا عنصر اس قدر غالب تھا کہ جس نے نہ صرف شاعری میں نئی روایات اور خیال آفرینی کی داغ بیل ڈالی بلکہ اردو نثر کو بھی مقفّی اور مُسجّع عبارت آرائی سے نکال کر ایک سادہ اور عام فہم انداز بیان بخشا۔ غالب، کا اگر شاعری میں کوئی مقام نہ بھی ہوتا تو بھی ان کے خطوط اردو نثر میں انھیں زندہ رکھنے کے لئے کافی تھے اور حقیقت یہ ہے کہ غالب نے جس طرح شاعری کو خون جگر سے سینچا ہے اسی طرح اردو نثر کی بھی اسی خونِ جگر سے آبیاری کی ہے۔

غزلیہ شاعری میں یکسانیت، محاورہ بندی، سہل ممتنع، بندش، الفاظ کی چستی اور زمین کی سنگلاخی پر اتنا زور صرف کیا گیا ہے کہ اس سے سماج کے بدلتے ہوئے حالات اور رجحانات کا پتہ لگانا ناممکن ہے، برخلاف اس کے خطوط نہ صرف اپنے کاتب کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتے ہیں بلکہ سوسائٹی کی تصویر اور معاشرت و تہذیب کے خدوخال کا عکس بھی ہوتے ہیں، اس لئے نثر نگاری میں خطوط کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ خط و کتابت کا مقصد مکتوب الیہ کو اپنے

خیالات، جذبات، نظریات اور حالات و واقعات سے آگاہ کرنا ہوتا ہے، اس لئے بعض لوگ خطوط میں ایسی سنجیدہ تحریریں کے قائل ہیں جو صرف ذہن کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں۔ لیکن خط اس ردِ عمل کا اظہار بھی چاہتا ہے جو لکھنے والے کے جذبات سے رونما ہوتا ہے، اس لئے خط کی زبان اتنی پُر اثر اور عام فہم ہونی ضروری ہے کہ جس میں تکلم کی چاشنی پائی جائے۔

غالبؔ نے اپنے تبحرِ علمی اور ذہنی اختراع سے خطوط میں ایسا ہی انداز تحریر ایجاد کیا ہے جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو۔ غالبؔ کہتے ہیں،

"میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔۔۔۔۔"

غالبؔ کے زمانے میں مقفّیٰ اور مسجّع طرزِ تحریر کا رواج تھا اور غالبؔ فطرتاً تقلید کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا ذہن فرمایش اور تبلیغ سے بغاوت کرتا تھا۔ ان کے ہاں فن کی اپنی اہمیت تھی اس لئے انھوں نے عام روش سے ہٹ کر ایک آسان اور عام فہم نثر نگاری کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے بندھے ٹکے آداب اور روایتوں کو ترک کر دیا اور اپنے خطوط کو خیالات کے بے تکلف اظہار کا ذریعہ بنایا۔ نئے اسالیب، نئے القاب اور ادائے خیال کے نئے انداز اختیار کئے۔ اپنے خطوط کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

"خطوط نویسی میں میرا طریق یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لئے قلم کاغذ اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے پکارتا ہوں اور اس کے بعد خود ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں۔ آداب و القاب کا پُرانا طرز نیز اور شکر و شکوہ، شادی و غم کا قدیم رویہ میں نے بالکل اُٹھا دیا ہے۔"

غالبؔ کے خطوط میں صرف زندگی کے حالات ہی نہیں ہیں بلکہ خود زندگی جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اردو نثر میں سلاست اور سادگی کے اس موجد نے لطافت و ظرافت کی ایک نئی راہ بھی دکھائی ہے۔ میر مہدی مجروحؔ کو ایک خط کے جواب میں وبائے عام میں اپنے محفوظ رہنے کا حال یوں بیان کرتے ہیں۔

"وبا کو کیا پوچھتے ہو۔ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا پڑا۔ وبا کیوں نہ ہو۔ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے قابل نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔"

ترقی و عروج کے دور کی مکتوب نگاری میں مولانا ابو الکلام آزاد کے خطوط کو اردو نثر کا گرانقدر سرمایہ تسلیم کیا جاتا ہے اور بعض نقادوں کے خیال میں مولانا آزاد کے خطوط میں اگر ظرافت کی چاشنی ہوتی تو وہ غالبؔ سے بڑھ جاتے،

ہو سکتا ہے یہ رائے درست ہو لیکن میری نظر میں مولانا آزاد کے خطوط کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ ان میں ایک نظریہ اور ایک طرزِ فکر کی دعوت ملتی ہے۔ مولانا آزاد نے نہایت اطمینان اور غور و فکر کے ساتھ قید و بند کے زمانے میں خطوط لکھے۔ ان کے خطوط کی زبان، ان کے تخیل کی پابندی ہے۔ ان کے بلند خیالات کے ساتھ ساتھ اسی معیار کے الفاظ ان کے ذہن میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس غالبؔ کے ہاں خطوط میں بے ساختگی پائی جاتی ہے، اور اس بے ساختگی کا اظہار غالبؔ نے سادہ اور سلیس زبان میں جس شگفتگی اور شوخی کے ساتھ کیا ہے، اس کی تقلید خواجہ حسن نظامی اور نیاز فتحپوری جیسے صاحب طرز انشا پردازوں نے بھی کرنے کی کوشش کی، لیکن جو بے تکلفی اور روانی غالبؔ کے خطوط کا خاصہ ہے اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

غالبؔ کو تا حیات ستم روزگار اور قلعۂ معلیٰ تک نارسائی کا گلہ رہا جس کا ذکر انھوں نے اپنے اکثر خطوط میں اس انداز سے کیا ہے کہ زندگی بگھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے خطوط میں جس واقعہ اور جس کیفیت کا ذکر ہے اس کی پوری تصویر پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ درج ذیل خط میں مرزا صاحب نے نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی کے جشن کا حال تحریر کیا ہے، ملاحظہ ہو۔

"یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ اگر جمشید دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر آغا پور نام کی ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر مع چند میموں اور صاحبوں کے آئے اور خیموں میں اترے۔ کچھ سو صاحب اور میم جمع ہوئے سب سرکار رام پور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۵ دسمبر حضور پُر نور (نواب کلب علی خاں) بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر واپس آئے۔ وزیر خاں، خانِ ساماں، خواص میں سے روپے پھینکتا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار کیا ہوگا۔ آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔ ٹیپن اور شام کا کھانا وہیں کھائیں گے۔ روشنی اور آتش بازی کی وہ افراط ہے کہ رات دن کا سامنا کرے۔ طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوکی کہنا چاہیے۔"

واقعہ یہ ہے کہ ان کے مزاج کی شگفتگی اور زندہ دلی نے ان کی نثر میں ایسی توانائی پیدا کر دی کہ ان کے مکتوبات پر ان کی شخصیت کا گہرا عکس ہے۔ ان کے خطوط نہ صرف ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے آئینہ دار ہیں۔ بلکہ ان کے عہد کے معاشی، تہذیبی اور سماجی مد و جزر کی جیتی جاگتی تصاویر ہیں۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا بے ساختہ اس کا اظہار خطوط میں کر دیا۔ غدر کے زمانے میں اور اس کے بعد کے لکھے ہوئے غالبؔ کے خطوط سے غدر کے زمانے کی دہلی کا ایک نقش ابھر آتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۹۸ پر)

کنور بھان
(بی۔ اے ڈفرسٹ ایر)

مرزا غالب بحیثیت نثار

عام طور پر لوگ غالب کو ایک شاعر ہی سمجھتے ہیں۔ ان کی نثاری کی حیثیت عام نظروں سے پوشیدہ ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ جیسے اُردو اور فارسی کے بے نظیر و بے عدیل شاعر ہیں۔ اُسی طرح فارسی اور اُردو کے بے مثل نثار بھی ہیں۔ ان کی نثر کے نمونے اکثر خطوط اور رُقعات ہیں۔ علاوہ ازیں چند تقریظیں دیباچے اور تین مختصر رسالے یعنی لطائف غیبی۔ تیغ تیز اور نامۂ غالب ہیں جو برہان قاطع کے حمایتوں کے جواب میں لکھے گئے۔ ان کے علاوہ ایک ناتمام قصہ ہے جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ سب نثر اُردو کا بہترین نمونہ اور اُن کے خاص رنگ کے آئینہ دار ہیں۔ مرزا کا رنگ ان میں بالکل ایسے جھلکتا ہے۔ جیسے آئینہ میں اپنا عکس، عبارت کی روانی اور سلاست معلوم ہوتا ہے۔ کہ قلم برداشتہ لکھتے چلے گئے ہیں۔ دریائے مضامین ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ عبارت میں تکلف کا نام ونشان تک نہیں۔ بلکہ اس میں ایک ادبی شان ہے۔ ان کی تحریر اور انداز بیان سب سے جُدا ہے۔ تحریر کیا ہے۔ گویا دو شخص آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ بعض خطوط اُنہوں نے مکالمہ کی صورت میں لکھے ہیں۔ کسی میں مکتوب الیہ کو غائب فرض کرلیا ہے۔ جس سے مکتوب الیہ کوئی دوسرا شخص معلوم ہونے لگتا ہے۔ ان کی قلم کی جُنبش ایسی سحر آفرینی پیدا کردیتی ہے کہ دل بلیوں اُچھلنے لگتا ہے۔ ان کے خطوط میں ایک یہ بھی جدت ہے۔ کہ القاب و آداب کا پُرانا اور فرسودہ طریقہ اور دیگر بہت سی باتیں جو عام طور پر خطوط میں لکھی جاتی ہیں۔ مگر وہ فضول اور بے کار ہیں۔ سب چھوڑ دیں۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

خط بنام میر مہدی

اے جناب میرن صاحب السلام علیکم

حضرت آداب۔ کہو صاحب۔ آج اجازت ہے۔ کہ خط کا جواب لکھنے کو حضور میں کیا منع کرتا ہوں۔ میں نے تو یہ عرض کیا تھا۔ کہ وہ اب تندرست ہو گئے ہیں ۔ بـ رجا نار ہا ہے۔ صرف پچش باقی ہے۔ وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے لکھ دیتا ہوں پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپ کے

فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہوں گے ۔ میاں آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو سبحان اللہ۔ سبحان اللہ لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے ۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے ۔ مگر یہ تو کہو ۔ کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں ۔ کیا عرض کروں ۔ سچ تو یہ ہے ۔ کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اُٹھاتا ۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جائے ۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں ۔ روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھئے گا ۔

میاں بیٹھو ۔ ہوش کی خبر لو ۔ تمہارے جانے سے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا ۔ اور آج تک اس کو خط نہیں لکھا گیا ۔ لاحول ولا قوۃ سنو میر مہدی صاحب ۔ میرا کچھ گناہ نہیں ۔ میرے پہلے خط کا جواب لکھو ۔ تپ تو رفع ہو گئی ۔ پھنسیں کے رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو ۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو ۔ یہ جدی بات ہے ۔ کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں ۔ پرہیز اگر ہو گا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہو گا ۔ حالات یہاں کے مفصل میرن صاحب کی زبانی ہوں گے ۔ دیکھو بیٹھے ہیں ۔ کیا جانوں حکیم میر اشرف ہیں اور ان میں کچھ کونسل ہو تو رہی ہے ۔ پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے ۔ اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں تو ان سے یہ پوچھیو کہ جناب ملکۂ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمہاری کیا گت ہوئی تھی ۔ اور یہ بھی معلوم کر لیجیو کہ یہ جو فارسی مثل مشہور ہے ۔ کہ دفتر را گاؤ خورد اس کے معنی کیا ہیں ۔ پوچھیو اور نہ چھوڑیو ۔ جب تک نہ بتائیں ۔ اس وقت پہلے تو آندھی چلی پھر مینہ آیا اب مینہ برس رہا ہے ۔ میں خط لکھ چکا ہوں ۔ سرنامہ لکھ کر چھوڑ دوں گا ۔ جب ترشح موقوف ہو جائے گا ۔ تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا ۔ میر سرفراز کو دعا پہنچے ۔ اللہ اللہ تم پانی پت کے سلطان العلماء اور مجتہد العصر بن گئے ۔ کہو وہاں کے لوگ تمہیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہیں ۔ میر نصیر الدین کو دعا ۔

غالب

جناب سید صاحب قبلہ

بعد بندگی کے عرض کرتا ہوں ۔ کہ عنایت نامہ آپ کا پہنچا ۔ آپ جو فرماتے ہیں ۔ کہ تو اپنی خیریت کبھی کبھی لکھا کر ۔ آگے اتنی طاقت باقی تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا ۔ اب وہ طاقت بھی زائل ہو گئی ۔ ہاتھ میں رعشہ پیدا ہو گیا ۔ بینائی ضعیف ہو گئی ۔ متصدی نوکر رکھنے کا مقدور نہیں ۔ عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی صاحب وقت پر آ گئے ۔ تو میں مطلب کہتا گیا ۔ وہ لکھتے گئے ۔ یہ حسن اتفاق ہے ۔ کہ کل آپ کا خط آیا ۔ آج ہی ایک دوست میرا آ گیا ۔ کہ یہ سطریں لکھوا دیں ۔ اور یہ آپ کبھی نہ فرماویں ۔ کہ مجھے منشی میاں داد خاں سے قطع محبت ہو گیا ہے ۔ منشی صاحب کی محبت اور ان کے توسط سے آپ کی محبت دل و جان میں اس قدر سما گئی ہے ۔ جیسا اہل اسلام میں ملکۂ ایمان کا ۔ پس ایسی محبت کا موقوف ہونا کبھی ممکن نہیں ۔ امراض جسمانی کا بیان اور اخلاص ہمدگر کی شرح کے بعد بجرم

غمہائے تنہائی کا ذکر کیا کروں ۔ جیسا ابرِ سیاہ چھا جاتا ہے ۔ یہ ٹڈی دل آتا ہے ۔ بس اللہ ہی اللہ ہے ۔
سیف الحق میاں داد خاں کو سلام کہیئے گا ۔ اور یہ خط پڑھا دیجئے گا ۔

نجات کا طالب

غالبؔ

۱۰۔ مارچ ۱۹۰۹ء

اِن کے رقعات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اُن کے حالاتِ زندگی کے مصفّےٰ اور مجلّیٰ آئینہ ہیں ۔ اِن سے مرزا کی زندگی کے حالات مرتب ہوتے چلے جائیں گے ۔ یہ خطوط اِن کی زندگی اور جزئیاتِ زندگی کی تصویریں ہیں ۔ اِن خطوط سے اِن کے دوستوں کے تعلقات ۔ اِن کے نظریے اور خیالات سب بخوبی اخذ کیے جا سکتے ہیں ۔ بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ مرزا کی غرض مکتوب الیہ کے دِل کو خوش کرنا اور اس کا غم غلط کرنا ہے ۔ اِن کا مذاق ظرافت بھی سب سے نرالا ہے ۔ انہوں نے نثرِ اُردو کو خشکی اور بدمزگی کے الزام سے بچا لیا ۔ اور اسے بامِ عروج پر پہونچایا ۔

مرزا صاحب نے اپنے خطوط میں سادگی اور سلاست کے دریا بہا دیئے ۔ مگر رواجِ زمانہ کے مطابق اپنے احباب کی کتابوں پر تقریظیں اسی پُرانے انداز میں لکھتے تھے ۔ اور مرزا صاحب کے لئے ایک قسم کی مجبوری تھی ۔ تقریظ کا ایک نمونہ دیکھیئے :۔

"سراج المعرفت کی تقریظ ۔ حق یوں ہے ۔ کہ حقیقت ازاولی مثال ایک نامہ درہم پیچیدہ سربستہ ہے ۔ کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ اور خط میں مندرج ہیں ۔ لا موجود الا اللہ اور اس خط کا لانے والا اور اس کا راز بتلانے والا وہ نامہ آور اور نامہ آور ہے ۔ کہ جس پر رسالت ختم ہوئی ..... اب گنجینۂ معرفت خواص امت محمدی کا سینہ ہے ۔ اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ مفتاح بابِ گنجینہ ہے ....."

الغرض مرزا غالبؔ نے نثرِ اُردو میں ایک نئی روح پھونک دی ہے ۔ اس نے خشکی اور بدمزگی کے ریگستان کو نخلستان میں بدل کے رکھ دیا ہے ۔ جب تک زبانِ اُردو زندہ ہے ۔ غالبؔ کا نام آفتاب کی طرح چمکتا رہے گا ۔

ظفر محمود
بی اے فائنل

غالب کا انداز بیان

مرزا کی طبیعت میں شروع سے ہی انفرادیت اور عنانیت تھی۔ وہ ہر جگہ اور ہر میدان میں اپنے لئے ایک نمایاں اور انفرادی راستہ اختیار کرتے تھے۔ اور ان کی یہ انفرادیت پسندی ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری، خطوط نگاری یہاں تک کہ ہے خواری بھی ایک انفرادی شان لئے ہوئے ہے مرزا کی اسی انفرادیت پسندی نے ہی انھیں میدان شاعری میں ایک نیا اور اچھوتا راستہ اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ انھوں نے وقت کے تقاضوں کے خلاف اور زمانہ کی عام ڈگر سے ہٹ کر چلنا شروع کر دیا اور اس روش کے لئے انھوں نے حضرت بیدل کی راہ اختیار کی اور دقیق مضامین ندرت خیالی، مضمون آفرینی، دور از کار تشبیہات اور مشکل استعمالات کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جو کہ دراصل بیدل کا رنگ تھا۔ مرزا غالب بیدل کے عاشق اور پیرو تھے جس کا اعتراف انھوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

ہے خامہ فیض بیعت بیدل بکف اسد
یک نیستاں قلمرو اعجاز ہے مجھے

مرزا کا انداز بیدل کا انداز اختیار کر لینے پر دو آتشہ ہو گیا اور کلام میں دقیق مضامین ندرت خیالی اور معنی آفرینی کے ساتھ ہی ظریفانہ پہلو بھی نمایاں ہو گیا۔ اور اسی چیز نے مرزا کے کلام کو اچھوتا اور جداگانہ بنا دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

ایک بار میر تقی میر نے مرزا کو سنا جبکہ مرزا اپنے ابتدائی زمانہ میں تھے۔ میر صاحب نے فرمایا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی اچھا استاد مل گیا تو یہ بلند پایہ شاعر ہوگا ورنہ لغو کہے گا۔ استاد کامل تو کوئی مل نہ سکا مگر یہ بچہ اپنے اسی انداز میں کہتا رہا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا کا انداز بچپن ہی سے جداگانہ تھا۔ لوگ مرزا کے اس انداز پر معترض ہوتے رہے لیکن مرزا نے کسی کی پرواہ نہ کی اور جو راہ اختیار کی تھی اس پر قدم زن رہے۔ لوگوں نے یہاں

تک کہا کہ ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے۔ مرزا کی مشکل گوئی نے ان کو عوام سے بالکل الگ تھلگ کر دیا تھا۔ لوگ ان کی مشکل پسندی پر معترض رہے اور وہ لوگوں کی کم عقلی کے شاکی رہے۔ لیکن سخت و شدید اعتراضات کے باوجود ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائی اور وہ اپنی اختیار کردہ راہ پر ثابت قدم رہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے شعر میں کہا ہے۔

نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلہ کی پرواہ
نہ سہی مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور مرزا دنیا سے بے نیاز اپنی علیحدہ مسجد بنا کر سجدے کرتے رہے۔ عہد شباب آیا حسن و عشق کی رعنائیاں آئیں، ناز و عشوہ کی داستانیں شروع ہوئیں۔ مہ جبینوں سے ملاقاتیں ہوئیں مہ رخوں کے ظلم و ستم سہے۔ شکوے کئے ناز کئے۔ آہ و بکا کی مگر اپنے انداز میں اپنے رنگ میں، اس رنگ میں جس کو وہ خود سمجھے یا خدا سمجھے وہ معصوم بیدھے سادھے مہ جبیں غالب کی اس زبان کو کیا سمجھتے اس انداز سے کیونکر متاثر ہوئے۔ غالب کو اپنے نالے رائیگاں نظر آئے چنانچہ پریشان ہو گئے اور ان کے ہاتھ بارگاہ ایزدی میں اٹھ گئے۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور

مرزا جو کسی کی ستائش اور صلہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے وہ مہ جبینوں اور لالہ رخوں سے ہار مان چکے تھے۔ ان کو شکست فاش ہوئی مگر حسینوں سے تو شکست میں بھی فتح ہے۔ اللہ تعالے نے ان کی دعا قبول کر لی حسینوں کے دل تو نہ دیے مگر مرزا کو اپنی زبان بدلنی پڑی۔ جو کام بڑوں بڑوں سے نہ ہو سکا لالہ رخوں نے کر دکھایا۔ آج غالب کے قدردان ان حسینوں کے مرہون منت ہیں جنھوں نے مرزا کو سہل گوئی کی جانب مجبور کر کے اردو ادب کو ایک قیمتی سرمایہ بخشا جس پر اردو والے ہمیشہ ناز کریں گے۔ غالب کا وہ زمانہ جس میں وہ سہل گوئی کی جانب متوجہ ہوئے چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
ترے سرو قامت سے اک قد آدم — قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں
تماشہ کہ اے محو آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائی خیال کہاں

یہ تھا وہ انداز جس نے غالب کو محبوب عوامی شاعر بنایا اور پھر ہر شخص یہ کہتا ہوا نظر آیا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مرزا کو اپنے فارسی کلام پر بڑا ناز تھا اور اُردو میں تو وہ صرف منہ کا مزہ بدلنے کے لئے کہا کرتے تھے۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنے خطوط میں سے ایک آدھ میں تذکرہ بھی کیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں انھیں اپنے اُردو کلام پر بھی اسی قدر ناز تھا جس قدر کہ کلام فارسی پر۔ ان کے اُردو وہ اشعار جس پر ان کو ناز تھا ان کے فن کی بلندیوں کو چھوتے ہیں۔ وہ احساسات جن کو نظم کرنے کے لئے فہم و ذکا درکار ہے جن کو اشعار میں پرونے میں دیدہ ریزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب نے اپنے اُردو کلام کو رشک فارسی کہا ہے چنانچہ ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشک فارسی
گفتہ غالب ایکبار پڑھ کر اسے سنا کہ یوں

مرزا کی مشکل گوئی پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ان کے اشعار قلب انسانی پر فوری اثر انداز نہیں ہوتے جیسا کہ میر تقی میر کے اشعار انسانی دل میں گھر کر جاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ عام فہم اور سہل اشعار میں سوز و گداز بھی ہو تو دل پر فوری اثر کرتے ہیں، لیکن دقیق مضامین والے اور مشکل اشعار دعوت فکر دیتے ہیں اور ان کا اثر دل و دماغ پر دیر پا ہوتا ہے یہ مرزا کی مشکل گوئی ہی تو ہے کہ آج سو سال گذر جانے کے بعد بھی ان کے اشعار انسان کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ لوگ آج ان کے دقیق پر از فلسفہ مضامین والے اشعار کی داد و تحسین دے رہے ہیں مرزا کو خود یہ معلوم تھا کہ ایک دن آئے گا جب لوگ مجھے سمجھیں گے مجھے جانیں گے میری قدر کریں گے۔

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

اور جب وہ گلشن پیدا ہوا جس کے لئے وہ نغمہ سنج تھے تو ان کے ایک ایک شعر پہ اتنی داد ملی جو شاید ان کے پورے دیوان پر نہ ملی ہوگی۔

انیس الرحمٰن
بی۔ اے۔ فاضل

غالبؔ کی شاعری میں غم و نشاط کی ہم آہنگی

غالبؔ نشاط کے شاعر تھے لیکن ان کے ماحول نے انھیں درد و غم بھی دیا جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں ایک اضطراب اور زندگی کے مصائب کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ غموں نے انھیں مایوس کر دیا تھا بلکہ ان کے نزدیک زندگی کی نامرادیوں سے ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور تمام مصیبتوں کو نہایت صبر و سکون اور پامردی سے برداشت کرنا ہی زندگی کا اصل مقصد تھا۔ ان کی نگاہ میں زندگی مصائب و آلام کا مرکب ہے وہ اسے حقیقت پسندانہ انداز سے دیکھتے ہیں زندگی کا المیہ غالبؔ کے یہاں کہیں کہیں طربیہ پر غالب ہے۔ کیونکہ جذبات انسان پر حاوی ہیں اور ان جذبات کے دھارے میں انسان بہہ جاتا ہے اسی طرح غالبؔ جب مصائب زندگی سے دوچار ہوتے ہیں تو جذبات کی رو میں ان کا ذکر بھی کرتے ہیں مگر وہ اس غم کی دنیا میں بالکل ہی گم ہو کر نہیں رہ جاتے بلکہ ہمت اور لگاتار کوشش کا دامن تھامے رہتے ہیں۔ اُن کے یہاں زندگی سے فرار اور حالات سے مایوسی کا پہلو نہیں ہے

غالبؔ جانتے تھے کہ دنیا میں غم و نشاط میں چولی دامن کا ساتھ ہے جہاں خوشیاں ہوتی ہیں وہاں رنج بھی ہوتے ہیں۔ شادی و غم کا امتزاج زندگی کا سرمایہ ہے۔ زندگی ایک بہاؤ ہے اور اس بہاؤ میں رکاوٹیں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں اگر زندگی کے بہاؤ میں یکسانیت ہو تو زندگی سے اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ دراصل یہ غم ہی ہیں جو زندگی کے دھارے کو تیز رکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں موت حالانکہ ایک نہایت ہی تلخ حقیقت ہے لیکن زندگی کے لئے موت کا ہونا بھی ضروری ہے موت دراصل زندگی کی روانی کو ٹھیراؤ میں بدل دیتی ہے اسی طرح شادی و غم ایک قسم کا تنوع ہے یعنی شادی کے بعد غم اور غم کے بعد شادی۔ لیکن نہ شادی میں قرار ہے اور نہ غم کو قیام۔ غالبؔ کی نگاہ میں غم زندگی کے لئے ضروری ہیں کیونکہ زندگی غم کے بغیر اپنا بلند مقصد حاصل نہیں کر سکتی ہے۔ غالبؔ کے یہاں زندگی کا بلند مقصد سب کچھ ہے اس کے بغیر زندگی روکھی پھیکی ہے۔ چنانچہ غالبؔ اس غم کو بھی سینے سے لگائے رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ع

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

DELHI COLLEGE (Eve.) STUDENT UNION

Executive Council 1968-69

Sitting L—R, R. P. Dua (Secy. Pol. Sc. society), K. K. Goyanka (Member Advisory Board) R. L. Sharma (Convenor Advisory Board) D. N. Kaul (Vice Principal) V. P. Dhingra (President) Anis-ur-Rehman (Secy. Bazme-Adab) S. R. Sahni (Secy. Debating Society,)
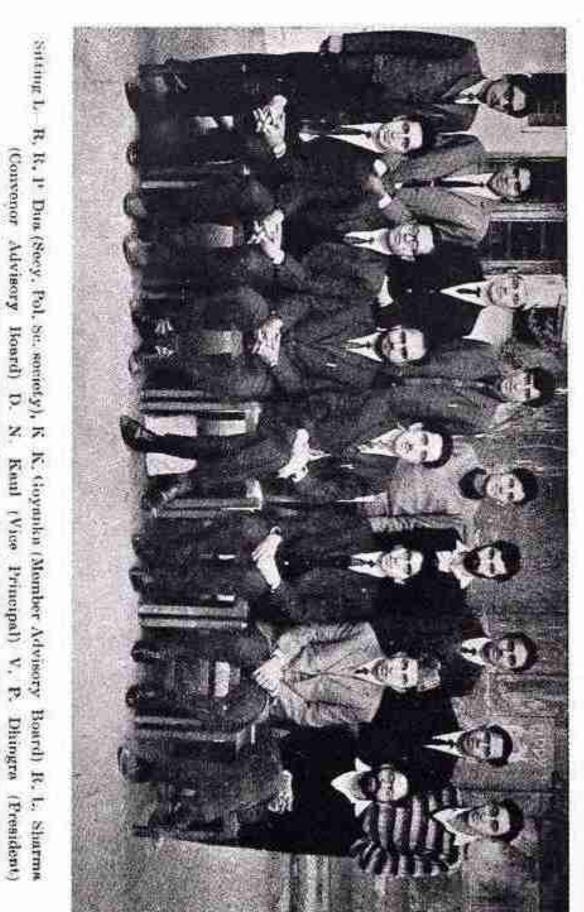
Standing L-R Anand Swarup Gupta, (Member) R. C. Sharma (Secy. English Lit, Society) S. K. Kapur (Secy. Hist. Society) Vijay Mahajan (Secy. Planning Forum) Rajeshwar parshad (Member) P. P. Kalra (Secy. Economics Society) T. R. Tripathi (Secy. Sanskrit Parishad), Ubaid-ur-Rehman (Secy. Persian Society), Pawan Kumar Sareen (Member)

BAZM-E-ADAB

1968-69
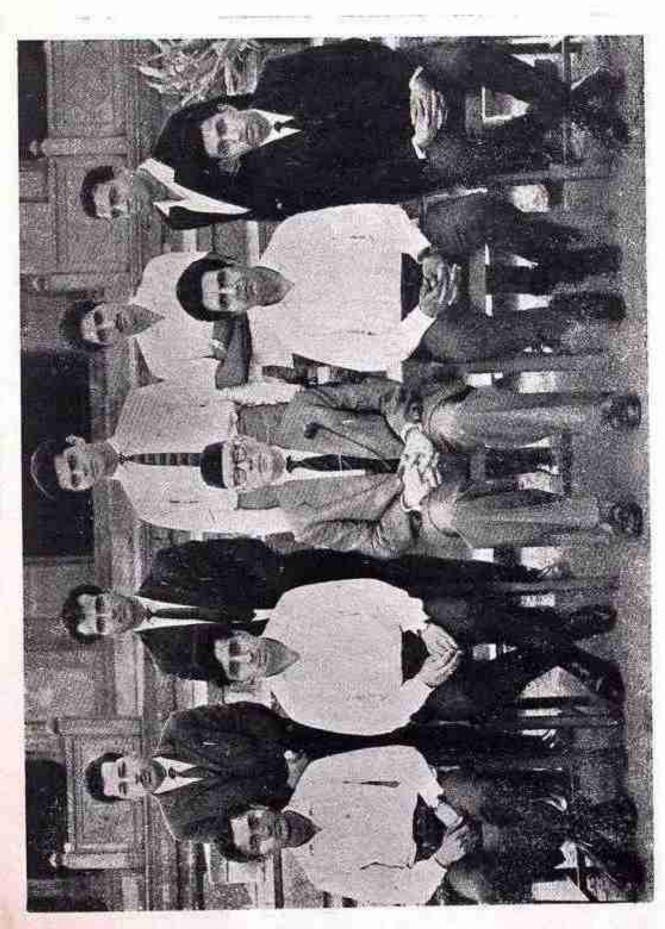
L-R Sitting-Qamar Alam (Jt. Secy.) Dr. Aslam Parvez (President) Mr. M. H. Musavi (Principal)Mr. Azmatullah Khan, Anisur Rehman (Secy.)

Standing — Zafar Mahmood, Viqar Farooqi, Khizar Mir, Mushtaq Ahmed, Mukhtar Ahmed.

غالب کو قنوطی کہنا حقیقت پر مبنی نہ ہوگا کیونکہ ان کا غم عام غم نہیں بلکہ غم عشق ہے جو زندگی کے سفر کو طے کرنے میں پیش آتا ہے اور جس کی وجہ سے یہ سفر رنگینیوں اور دلچسپیوں کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ اس لئے غالب کو قنوطی کہنا بے معنی ہے۔ قنوطیت کی حقیقت زندگی سے فرار حاصل کرنے کی آرزو کرنا ہے اس سے اگر آدمی نفرت کرتا ہے تو دنیا میں مصائب و آلام ہی کا منہہ دیکھتا اور ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتا ہے تو اس کو زندگی سے نفرت ہو جاتی ہے خاص طور پر اس وقت جبکہ کوئی اعلیٰ مقصد اور کوئی غرض بھی پوشیدہ نہ ہو۔ اس وقت زندگی ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بن جاتی ہے اور دل یہ کہتا ہے کہ اس بار کو جلد سے جلد شانوں سے اتار پھینکا جائے۔ مگر غالب اس سے مبرّا ہیں ان کے غم کی وہ نوعیت نہیں جو انسان کی زندگی پر ایک بار ہو جس کے نیچے انسان دبا جا رہا ہو۔ غالب پر زندگی کا بار ایک ایسے مزدور کی مانند ہے جو بوجھ سے دبا ہوا تو ہو لیکن اجرت ملنے کی امید پر اس کو بار ہلکا معلوم ہو اور وہ خوشی خوشی منزل کی طرف بڑھتا جائے اور اس بوجھ کو اٹھائے ہوئے گاتا گنگناتا ہوا راستہ طے کرتا جائے۔ غالب کے غم کی کیفیت زندگی کی اُن مصیبتوں کو ہلکا کر دیتی ہے جو زندگی کے سفر کو طے کرنے کے لئے انسان کو پیش آتی ہیں اور جن سے فرار ممکن نہیں۔

غالب کے نزدیک غمِ روزگار ان مصائب کا نام ہے جن کی تکالیف اور تلخیاں غمِ عشق اختیار کرنے سے دور کی جا سکتی ہیں۔ زندگی کے لئے ضروری ہے کہ غم روزگار ہو لیکن غم ہائے روزگار زندگی کو تلخ بنا دیتے ہیں، غم عشق حالانکہ ایک درد ہے لیکن اس میں ایک چاشنی ہے جو غم روزگار کی تکالیف سے بہتر ہے۔ عشق ایک ایسا درد ہے جو لا دوا ہے مگر غم روزگار کے لئے مرہم کا کام کرتا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ غالب کے یہاں غمِ روزگار تو ہے لیکن وہ ان مصائب سے بچنے کے لئے اور ان کی تکلیف کم کرنے کیلئے ایک لطیف درد کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

ان کے یہاں غم روزگار اور غم عشق کے علاوہ ایک اور بھی غم بھی ہے جسے انہوں نے غم ہستی کا نام دیا ہے اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے زندگی ایک ایسا سفر ہے جس میں رکاوٹیں بھی ہیں۔ زندگی کے اسی ارتقائی سفر کو غالب غم ہستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب تک ہستی ہے غم ہستی بھی اس کے ساتھ لازم و وابستہ ہیں اگر ہستی مٹ جائے تو غم کا بھی خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالب غموں سے نفرت نہیں کرتے بلکہ ان کو کامیاب زندگی کے لئے ایک ضروری شئے سمجھ کر ان سے محبت کرتے ہیں وہ مصائب کو سہنے کے لئے خوشی سے تیار رہتے ہیں۔ غم ہستی سے دوچار زخم کھا کر بھاگ نہیں کھڑے ہوتے بلکہ ان سے ہم آہنگی اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ اس زندگی کو زندگی خیال ہی نہیں کرتے جس میں ہنگامہ آرائیاں نہ ہوں ان کی نگاہ میں

زندگی کروٹیں لینے کا نام ہے فتنے پیدا ہونے کا نام ہے وہ شمع کشتہ بن کر موت کی آغوش میں جانا نہیں چاہتے بلکہ درخور محفل بننا چاہتے ہیں۔ زندگی کی بزم کی رونق وہی ہستی بن سکتی ہے جو عشق کی آگ کو شمع کی طرح اپنے سینے میں جگہ دے غالب شمع بن کر جل جانا چاہتے ہیں۔ مگر فرار یا راہ قنوطیت اختیار کر کے زندگی کے ولولے سرد کرنا نہیں چاہتے۔

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لئے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

ان کی نگاہ میں نوحہ غم اور نغمہ شادی دونوں کی قیمت ایک ہے دونوں حالتوں میں وہ گھر کی رونق سمجھتے ہیں اور ہنگامہ قائم رکھنا چاہتے ہیں نوحۂ غم کو وہ رونق خانہ سے بدل دیتے ہیں اور غم سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

وہ مقتل کی طرف جاتے ہوئے بھی اس خیال سے خوش ہوتے ہیں کہ ان کا دامن زخم گل سے بھر جائے گا۔ غم کو نشاط کی کیفیتوں سے بدل دینے کی یہ حالت غالب کے یہاں ہی ملتی ہے۔ کس خوبی سے فرماتے ہیں ؎

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پرگل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

اس سے انکار نہیں کہ غالب کی زندگی کامیاب نہ تھی۔ ان کو ہر وقت پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اس سے گھبرائے نہیں بلکہ یہ ان کی عادت میں شامل ہو گئے۔ غم ان پر وہ اثر نہیں کرتے جو ایک عام آدمی پر کرتے ہیں وہ غم کی کیفیت کو بھی زندگی کی ایک راہ سمجھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ بات صرف غالب ہی کہہ سکتے ہیں۔ ان کے یہاں مصیبت کے وقت بھی آنے والی کل پر امید ہے جس سے اُن کی اس وقت کی تکلیفیں کم ہو جاتی ہیں۔ وہ مستقبل کی خوشیوں کے لئے سامان تیار کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں ؎

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مُرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

غالب کی شخصیت اور ان کی عظمت اسی میں پوشیدہ ہے کہ ہر چند ان کی زندگی مصائب و آلام کا مجموعہ رہی ہے مگر ان آلام کے سامنے ان کی ذہنی قوتیں اور تخیلی صلاحیتیں بیکار نہیں ہو جاتیں بلکہ وہ ان سے کام لے کر نئی راہیں نکالتے ہیں زندگی کی ناخوشگوار ساماتیوں کو کائنات کی ستم ظریفیوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور یہی ان کی زندگی کا حاصل ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہونا

عبیدالرحمٰن خاں
بی۔اے (فائنل ائیر)

"پوچھتے ہیں وہ کہ غالؔب کون ہے"

سو برس سے ارباب علم کو غالؔب کی شخصیت اور ان کا فن غور و فکر اور تنقید کی دعوت دیتا رہا ہے مدّعین ان کی شخصیت اور کمالِ فن پر اپنی جولانیٔ طبع کے اعتبار سے اپنی آراء کا اظہار کرتے رہے ہیں اور زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ جاری رہے گا مستقبل کے عظیم نقاد پتہ نہیں کن کن نظریات کے تحت اس مصرع کی روشنی میں غالؔب اور اس کی شخصیت و فن پیش کرتے رہیں گے اور ان کی زندگی اور فن کے نئے نئے پہلو ہمارے سامنے آتے رہیں گے۔ اصل میں فنکار کا کمالِ فن یہی ہے کہ اس کے فن پر جسقدر غور و فکر کیا جائے وہ غور و فکر زندگی کو سر سبز و شاداب کرتا چلا جائے۔

فن کار اپنی ذات میں اپنے عہد کی زندگی کو جذب کر لیتا ہے اور عہد اسے اپنے رنگ سے مزین کر کے دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اس صورت میں فنکار کی شخصیت ذاتی نہیں رہتی بلکہ دنیا کی مشترکہ میراث بن جاتی ہے اور آج غالب اسی اعلیٰ اور ارفع منزل پر کھڑے نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے بین الاقوامی فنکار کا سہرا ان کے سر پر باندھا گیا ہے۔

غالؔب دسمبر ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے اور فروری ۱۸۶۹ء کو تقریباً پون صدی اس ناپائدار دنیا میں رہ کر چلے گئے۔ اور تقریباً ۶۰ سال تک اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے اردو زبان و ادب کو جو ندرتِ فکر اور تخیل کی رفعت عطا کی اس کی کوئی دوسری مثال اردو زبان میں نہیں ملتی سو برس گذر جانے کے بعد بھی آجتک کوئی ان کا ثانی پیدا نہ ہو سکا۔ اس میں شک نہیں غالؔب شعر و ادب کے پہلو سے اپنے وقت کے امام نظر آتے ہیں۔ ان کی جدّتِ طرزِ ادا، جدّتِ تخیل۔ استعارات و تشبیہات کی ندرت، جدّتِ محاکات اور جدّتِ الفاظ سے قاری اور سامع کے ذہن میں ایک طلسماتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لفظی صنعت گری کی حیثیت سے ان کی شخصیت تمام اردو شاعری پر حاوی نظر آتی ہے۔ غالؔب نے وارداتِ قلبی کو نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ پیش کیا ہے ایک بہترین فنکار اپنے وجدان اور ریاضت سے اپنی ذات کے تنگ دائروں کو توڑ کر اپنا تعلق سماج کے افراد سے قائم کر لیتا ہے اور پھر فنکار کی ذات سے جو فن تخلیق ہوتا ہے وہ فن عوام کا بن جاتا ہے۔ اور یہ محسوس ہونے لگتا ہے جیسے

وہ ہمارے دل کی بات کہہ رہا ہو۔ غالب کو خود بھی اپنی خصوصیت کا احساس ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب نے اپنی شاعرانہ عظمت کا جو قصر تعمیر کیا ہے اس کی عظمت و جلال کا احساس ان کو ہمیشہ رہا ہے۔ اپنے مخصوص لب ولہجہ اور انداز بیان کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

آیئے ہم دیکھیں کہ اس انداز بیان اور ادائے خاص سے غالب کی کیا مراد ہے۔ دیوان غالب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے انسانی زندگی کا گہرا اور بسیط مشاہدہ کیا ہے۔ ادب کے فنی نقطۂ نگاہ سے اس سے زیادہ بہتر انداز بیان اختیار کرنا شاید ممکن نہیں ہے۔ غم عشق ہو یا غم روزگار، عشق و محبت کے معاملات ہوں یا حکمت و فلسفہ کے مسائل یا عام زندگی میں پیش آنے والے واقعات، ان سب کو غالب نے اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ یہ اشعار عوامی زندگی میں داخل ہو کر زبان کا حصہ بن گئے اور زبان زد خاص و عام ہو گئے۔

تھی خبر گرم کے غالب کے اڑیں گے پرزے — دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

اس اعتبار سے زبان و ادب کو تعمیری موڑ دینے کا سہرا غالب کے سر ہے اس سو برس کے عرصہ میں ہماری زبان کے جس قدر بھی جلیل القدر شعرا اور نثار گذرے ہیں ان سب نے غالب سے کسی نہ کسی حیثیت میں استفادہ کیا ہے۔ اس لئے غالب کی لفظی صنعت گری کی حیثیت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنی جدت طرازی کے لئے

ماضی میں بھی منفرد تھے اور مستقبل میں بھی رہیں گے۔ حال کی مناسبت سے مستقبل میں وقت کا فاصلہ جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی غالب کی قدر و منزلت بڑھتی جائے گی۔

لیکن آج ہم اور آپ عہدِ نو میں سانس لے رہے ہیں زندگی کی قدریں بدل چکی ہیں تصورات اور خیالات میں تبدیلی آچکی ہے کسی فنکار کے منصب کا تعین کرنے کے لئے آج نگاہ زیادہ بلند رکھی جاتی ہے اس کے قیام و منصب کا تعین کرنے کے لئے اسے اس کے زمانے میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے اور اس زمانے کے تقاضوں سے پرکھا جاتا ہے۔

ادیب اپنے زمانے کا نباض ہوتا ہے اس کی نگاہ بصیرت حال کے ساتھ مستقبل پر بھی رہتی ہے اس کا کام صرف قوس و قزح کے رنگ سے تخیل میں رنگینی پیدا کرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے افکار سے اپنے معاشرہ کو زندہ رہنے کی صلاحیت بھی عطا کرتا ہے وہ انقلاب کا داعی اور نقیب ہونے کے فرائض انجام دیتا ہے صرف الفاظ کی بازی گری ہی کو وہ اپنی منزل نہیں بناتا۔

وہ وقت جبکہ غالب اپنے دیوان کی تخلیق میں مصروف تھے۔ ملک کی تاریخ کا تاریک ترین دور تھا۔ عظیم مغلیہ سلطنت اپنی آخری عمر کو پہنچ چکی تھی۔ یورپ کی ابھرتی ہوئی قومیں تسخیر کائنات کے عمل میں مصروف تھیں اور ہندوستان پران کا تسلط مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ ہزار سالہ تہذیب کا اقتدار ختم ہو رہا تھا اور ملک کی تاریخ میں پہلی بار وہ دور شروع ہوا تھا جبکہ ہندوستانی قوم محکوم بنتی جا رہی تھی عرصۂ حیات تنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ زندگی کی بساط اُلٹ گئی تھی ایسے وقت میں جبکہ اجنبی قوم بم کے دھماکوں اور تلوار کی جھنکار سے اپنے بخت کو جگا رہی تھی۔ غالب اور ان کے ہم عصر الفاظ کے طلسم میں الجھے ہوئے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کو قدرت نے ذہن رسا عطا کیا تھا اور بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا لیکن ان کی یہ صلاحیتیں ان کی افتادِ طبع کی وجہ سے تعمیری رُخ نہ اختیار کر سکیں۔

اگر غالب اور ان کے ہمعصر اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھ کر عوامی سطح پر حرکتِ عمل پیدا کرتے اور خیالی چیزوں سے ہٹ کر زندگی کے ٹھوس حقائق کے پس منظر میں اپنے فن کی تخلیق سے عوام میں حالات سے مدافعت کی صلاحیت کو مضبوط بناتے تو ممکن تھا آج ملک کی تاریخ مختلف ہوتی۔ برخلاف اس کے فرماتے ہیں۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے کہا ہے کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں وید مقدس اور دیوان غالب۔ لیکن شعر و سخن کی اس شریعت میں آج اگر کوئی سبق تلاش کیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ غیرت، حمیت اور خودداری کو بالائے طاق رکھ کر حالات سے بے نیاز ہو جاؤ اور صرف تخیلات کی زندگی بسر کرو، اور جب حالات تم کو آخری

(باقی صفحہ ۲۴۰ پر)

عظمت اللہ خاں

ایک فنکار کے کینوس کا ایک چھوٹا سا حصہ

معروف صاحب سے میں بہت سے اُلٹے سیدھے بہانے کر چکا ہوں اور انہوں نے اپنی شرافت کی وجہ سے شاید میرا یقین بھی کر لیا ہو۔ مگر اب انہوں نے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ میں نے اگر مضمون نہیں لکھا تو میگزین نہیں چھپے گا۔ اور انہوں نے وہ تمام طریقے اختیار کرنے کی دھمکی بھی دی ہے جو آجکل ہمارے لیڈر استعمال کرتے ہیں۔ گاندھی جی نے تو صرف ستیہ گرہ کو ضروری سمجھا تھا۔ آج دھرنے اور گھراؤ کا زمانہ ہے۔ میں کچھ خوف زدہ ہو گیا ہوں اور اس لئے مضمون لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں — غالب پر مضمون لکھنا ہے؟ غالب ایک بڑے سوالیہ نشان کی طرح — اب کیا کروں؟ لکھنا تو پڑے گا۔ غالب ایک عظیم شاعر۔ ایک عظیم فنکار — مگر یہ کیا؟ پہلے سے طے کر لیا نہیں تو! ہمارے نقاد کہتے ہیں نہ صرف وہ بلکہ دوسرے ممالک کے صاحب نظر بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں — مگر غالب شکن بھی تو ہیں۔ یہ تو عام وطیرہ ہے کوئی خوبیاں تلاش کرے گا تو آسمان پر بٹھا دے گا اور خامیاں ڈھونڈھے گا تو زمین کی سات تہوں میں دفن کرنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ صرف زندہ رہوں — اس کے لئے وقت کہاں؟ شرط یہ ہے کہ ایک ہفتے میں مضمون دیدوں۔ ورنہ!! — اچھا تو پھر غالب کیوں عظیم شاعر ہے؟ ہاں یہ اچھا عنوان ہے۔ مگر وقت کا مسئلہ — غالب کے یہاں فرد کی اہمیت؟ کیوں اب کیا بات ہے۔ کچھ نہیں صرف طوالت کا خوف حائل ہے۔ بلندی اور پستی عشق؟۔ افلاطونی جنسی وغیرہ وغیرہ — ایسا کرو۔ دل و دماغ نے کہا۔ ایک مختصر سا scope رکھو۔ مثلاً کیا؟ غالب آج کے عہد میں۔ ٹھیک ہے غالب آج بہت مقبول ہے شاید اپنے زمانے سے زیادہ۔ لیکن وہ اسوقت بھی پسندیدہ تھا یہ مانا کہ شیدائیوں کا حلقہ محدود تھا۔ آزردہ، مومن، شیفتہ اور حالی ہی نہیں ناسخ بھی اس کی علمیت اور فنکاری کے قائل ہیں۔ غالب نے زمانے کی عام روش کو اختیار نہیں کیا — زبان و بیان کے چٹخاروں اور معاملات حسن و عشق سے پورے طور پر گریز تو نہیں کیا۔ مگر ان میں الجھ کر جزو کو کل نہیں سمجھا — آج کے دور میں جبکہ جذبات و محسوسات کو Rational ہو کر پرکھا جاتا ہے اور یہاں Practical اور Realistic ہونے کی دعوت دی جاتی ہے۔ غالب جو جاگیردارانہ نظام کا پروردہ تھا صنعتی تہذیب کے تقاضوں کو کیونکر پورا کر سکے گا؟ زندگی روز بروز زیادہ تیز رفتار ہوتی جا رہی ہے۔ خلا کا سفر۔ چاند پر اترنے کی تیاری اور ہر چیز خود کار — اور غالب کہتا ہے ؎

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اور تو اور دل تک بدلے جانے لگے ہیں۔ غالب کی یہ آرزو تھی۔

؎ لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

اسپٹنک عہد میں زندگی نے جو چولا بدلا ہے شاید وہ شاعر کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا ــ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس شاعر کی غزلوں کا دل و دماغ پر آج بھی بھرپور اثر ہوتا ہے۔ جب ہکل، بیگم اختر، نور جہاں، ثریا، محمد رفیع، لتا، طلعت محمود، مہدی حسن اور مجدد نیازی وغیرہ اس کی غزلیں گاتے ہیں سننے والے مست و بےخود ہو جاتے ہیں ــ بات کہاں تک پہنچی ــ میں مضمون لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں ــ بہت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ غالب کے اردو دیوان کے ایک حصے کے متعلق کچھ لکھا جائے ــ یہ تو معلوم ہے کہ اس فنکار کا کینوس بہت بڑا ہے اور جب تک پوری پینٹنگ سامنے نہ آئے بات نہیں بنے گی مگر حال ہی میں حسین صاحب کے کچھ شاہکار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے ایک میں اجزا کی علیحدہ اہمیت بھی سمجھ میں آئی۔ اسی لئے میں یہ جسارت کر رہا ہوں کہ غالب کے اردو کلام کی ردیف الف کا تجزیہ پیش کروں۔ میرے سامنے سردار جعفری کا مرتبہ دیوان ہے۔ اس میں نمبر ۵۰ سے ردیف ب شروع ہوتی ہے گویا ۴۹ ــ لیکن ان میں سے کچھ غزلیں کہنا غلط ہوگا کہ نامکمل ہیں۔ بعض تو صرف دو دو اور تین تین اشعار ہی ہیں۔ بہر حال یہ مطالعہ حاضر خدمت ہے۔ پہلی غزل کا مطلع ہے۔

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　　کاغذی ہے پیراہن ہر پیکرِ تصویر کا

اسے پڑھ کر یقیناً سوچنا پڑتا ہے ــ اور پھر دل گھبرانے لگتا ہے۔ رحمتی موہوم کی فریاد ہماری شاعری پر یہ ایک بہت بڑا الزام ہے۔ کسی حد تک یہ ٹھیک بھی ہے۔ دوسری طرف صرف دماغ کی شاعری بھی ہے۔ جہاں تیکنیک ہی سب کچھ ہے۔ مگر اس مطلع کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ دل و دماغ دونوں کے امتزاج کی دین ہے۔ کیا یہ Moving اور Thought Provoking نہیں ہے؟ ــ شاعری میں فکر و شعور کی کاوشوں کا ذکر آیا ہے تو پہلے یہی پہلو پیش کرتا ہوں۔ ہاں اتنا ضرور مدنظر رکھئے کہ غالب شاعر پہلے ہے ــ

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا　　　ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی　　　دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　　ہیولا برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

نظر میں ہے ہماری جادہ راہ فنا غالب　　　کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اک سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کو پھر نہ تھمتا　　　جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا　　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا　　　بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

تنگی دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے　　　کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

باغ شگفتہ ترا بساط نشاط دل　　　ابر بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے　　　چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار گر ہے یہی — دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا

قطرہ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا — خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا — اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے — عرش کے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ — سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے — تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ — چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

اِن اشعار کو پڑھنے کے بعد سب سے پہلے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے خیالات اور جذبات کی ترجمانی میں تخلص اور ضمائر کا استعمال کم سے کم کیا ہے۔ زیادہ تر وہ generalize ہی کرتا ہے۔ حالانکہ اس کے تجربے، مشاہدے اور تجزئے کے عکس میں اس کا وجود رہتا ہے۔ مگر یہ خوبی ہے کہ وہ مسلط نہیں ہوتا۔ دوسرے اس کی وسعتِ نظر کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے۔ تحطاء وفا، کشمکش اندوہِ عشق، تعمیرِ انساں، حیات و موت، غرورِ عشق، مرنا جینا، زندگی و جودِ گیتی اور مادّی حقیقت، بے قراری دل، کائنات۔ عظمتِ دل خزاں و بہار، تغیر، کرشمۂ حیرت و حجات، دل ۔ غمِ عشق ۔ غمِ روزگار، بلند پروازی۔ آرزومندی، قضا و قدر، تقابل اشیائے کائنات، مناسبت، آہ و اشک۔ مادّی حقیقت، آدمی اور انسان، دردمندی و ہوشمندی، عشق۔ پریشانی ۔ بزمِ محبوب، چشمِ بیدار اور روشن دماغ۔ اس مختصر انتخاب میں ہمیں کائنات اور مرکزِ کائنات کے مختلف پہلوؤں سے متعلق آگہی ہو جاتی ہے۔ اردو شاعری کا مغربی زبانوں کی شاعری سے موازنہ کرنے والے مغربیت کے دلدادہ اہلِ نظر حضرات کا خیال ہے کہ ہماری شاعری میں Continuous Thinking Process کی بے انتہا کمی ہے، اس لئے کائنات آدمی۔ انسان کی مکمل تصویر سامنے نہیں آتی۔ غزل ہی آبرو سمجھی جاتی ہے اور غزل کی صنف میں یہ خرابی ہے کہ اشعار میں تسلسل اور ربط نہیں ہوتا۔ لیکن کیا مختلف غزلوں کے اشعار کا مطالعہ کسی نتیجے پر پہنچاتا ہے؟ میں کہوں گا۔ جی ہاں یہ ممکن ہے۔ بالخصوص غالب کے یہاں اس مطالعے کے لئے بہت گنجائش ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار میں تصوف کے مضامین باندھے گئے ہیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اسکے ہیں ہمارا پوچھنا کیا ہے

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا

اور حضرت خود ہی یہ بھی فرما دیتے ہیں کہ

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اس قول یا دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے صرف مندرجہ بالا اشعار ہی کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے تو کیسے سچا تسلیم کیا جاسکتا، عاشق - پردہ - محبوب، قطرہ - دریا - سپردگی، دیدۂ بینا - جزو و کل، محبوب حقیقی - یکتا و یگانہ، مقام سپردگی، وصل قطرہ - دریا - ان اشعار میں جدت و ندرت ہے۔ غالب کو تصوف سے دلچسپی تو ضرور ہے مگر اس کی زندگی کا جزوِ اعظم نہیں ہے وہ سماوی عشق سے زیادہ ارضی عشق کی طرف توجہ کرتا ہے — یہ تجزیہ نامکمل ہے اس لئے کہ رنگِ تصوف کے بس یہی نمونے میرے پیشِ نظر ہیں۔ وحدت الوجود کے نظریئے کو ہمارے دوسرے شعراء کی طرح غالب نے بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اس کی جھلک ان میں سے کچھ اشعار میں موجود ہے اس کے بالکل برخلاف دوئی کی بو کا نہ ہونا کہ کہیں دوچار ہوسکتا یا روبرو کوئی بت سیما نہ ہوا کے خیالات کا اظہار بھی ہے۔ یہ تضاد غالب کے کلام کا جزو ہے۔

تنقید کا ایک نظریہ کہ Sensibility اور Personality کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کہیں اسے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہیں بے انتہا دشواری۔ کہیں حالات سازگار ہوتے ہیں اور مواد بھی موجود اور کہیں سب کچھ پردۂ اخفا میں۔ اردو کے نہایت مشہور شعراء اور ادباء کے متعلق پڑھتے وقت دشواریوں کا شدید احساس ہوتا ہے — شخصیت اور شعور کے رشتے کو قائم کرنے کے لئے ہمارے یہاں سب سے پہلے تو خود فنکار کی رائے اس کی تخلیقات کے بارے میں جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر بیرونی شواہد کی تلاش ہوتی ہے — اور تحقیق کے اس جوش میں تخلیق کی اہمیت کم ہونے لگتی ہے۔ اگر سن اور تاریخ کا مسئلہ ہوگا تو ہمارے محقق نقاد جان کی بازی لگا دیں گے — اگر تخلیق کو بنیاد بنا کر جستجو کی جائے تو کیا گناہ ہے۔

غالب کے متعلق یہ اکثر کہا گیا ہے کہ اس کی شخصیت خطوط میں واضح طور پر سامنے آتی ہے ۔ یہ تسلیم ۔ اشعار کے پردے میں دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت ہوتی ہے اور پھر میرے مضمون کا scope تو اور بھی محدود ہے ۔ بہرحال ۔

تھی نو آموز فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

نہ ہوگا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

نالۂ دل نے دیئے اوراق لخت دل بباد
یادگار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا

درخور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

کام کا مرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں مرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسدؔ داغ جگر سے مرے تحصیل
آتش کدہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

میں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

بروئے شش جہت در آئینہ باز ہے
یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا

تاراج کاوش غم ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

گلیوں میں مری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہگذار تھا

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے ‏ ‏ بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں ‏ ‏ آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے ‏ ‏ دیکھنے ہم بھی گئے پہ تماشا نہ ہوا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا ‏ ‏ وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

اس کی امت میں ہوں میں مرے رہیں کیوں کام بند ‏ ‏ واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ‏ ‏ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

بزمِ شہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا ‏ ‏ رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

اِن اشعار سے فکر شعور اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے وہ ملاحظہ ہو۔

ہمت۔ دشوار پسندی۔ آسانی باعث پریشانی، اسیری میں بھی جراٴت، داغِ دل کی بہار، سیلاب کی ماندگی کے باوجود ذوق و شوق۔ تالیفِ نسخہ ہائے وفا۔ بے ربطی۔ انتشار، نالۂ دل اور دیوان بے شیرازہ، درخورِ قہر و غضب۔ یکتا۔ فخر، عزم، قطرہ۔ دریا، و کہ۔ فتنہ۔ انفرادیت، بندگی خدائی، نازِ بندگی، ہونا نہ ہونا۔ خدائی، تنگیٔ دریائے معاصی۔ دامن۔ ناز، داغِ جگر، فخر..... یہاں تک اشعار میں خودداری کے مضامین کے پہلو بیان ہوئے ہیں۔ اب دوسرا رخ دیکھیے

آرزوئے افسردگی اور طرزِ اہلِ دنیا۔ ناقص و کامل کا امتیاز مٹنے کا غم، اب دل تا جگر دریائے آگے جلوۂ گل گرد، خونِ گشتہ آرزوئیں۔ چراغ مراد گورِ غریباں کا دفینہ گہرہائے راز کی تباہی جاں دادہ ہوائے سرِ رہگزار کا نعش کا حشر مردِ آزاد کی لاش بے کفن۔ یہاں ایک ایسی شخصیت سامنے آتی ہے جس کو کیا کچھ میسر نہیں تھا مگر حالات و حادثات نے اس کی تمناؤں کو پیروں تلے بے دردی سے روند ڈالا ہے۔ اس کا کلیجہ چھلنی ہو گیا ہے وہ سوچ رہا ہے کہ کیا تھا اور اب کیا ہے۔ وہ تشنگیٔ ذوق کے مضمون باندھنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر غموں کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہے لیکن وہ جینا چاہتا ہے۔ غالبؔ کی انانیت ملاحظہ ہو۔ یہاں میرؔ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی تعریف بھی کر لی۔ آسمان کی بے رخی بے سبب نہیں ہے عجز و انکسار مگر یہ حرف کہنے کا طریقہ ہے، معقولیت کا احساس، لعن ضمیں پر چوٹ۔ ان کی ناکامی پر خوشی، زاہد سے چھیڑ چھاڑ، جنت۔ بے خودوں کا گلدستہ، اور بچہ نغمہ انداز۔ عقیدت مندی کی انتہا، گردشِ ایام۔ جو کچھ ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ صبر و سکون ...... درباداری۔ مدحیہ انداز۔ خوشامد کی حد تک ــــ ایسا کردار جو فرشتہ نہیں ہے۔ اسی دنیا میں رہتا ہے۔ اس کا ذہن مختلف اوقات میں طرح طرح سے سوچتا ہے کبھی عرش کے ادھر مکان کی آرزو کرتا ہے، کبھی غم میں مرتا ہے کبھی صلہ کی پرواہ بھی کرنے لگتا ہے۔

Francis Bacon کا قول ہے۔

"Reading makes a full man; Conference a ready man

and writing a extra man."

میں کہوں گا۔ *"... Writing (like Ghalib) an extra man"*

ایک نظریہ ہے کہ فنکار کے لئے *Idiological commitment* ضروری ہے

Jean-Paul Sartre کا خیال ہے کہ اپنے خیالات وجذبات کی حدبندی کے بغیر تخلیق مشکل ہے۔ غالب کے اس مختصر جائزے سے یہ رائے قائم ہوتی ہے کہ وہ خیالات و نظریات اور جذبات و محسوسات کے اظہار میں بالکل آزادانہ روش اختیار کرتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں اتنی ہمہ رنگی اور وسعت ہے۔ وہ زندیق بھی ہے مسلمان بھی۔ آزاد بھی ہے اور پابند بھی۔

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

مشرقی شاعری میں ہی نہیں مغربی زبانوں کی شاعری میں بھی عشق عاشق اور محبوب نہایت اہم موضوعات ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے یہاں انکی اہمیت ضرورت سے زیادہ رہی ہے بلکہ آج تک ہے۔

عشق، عاشق، اور محبوب غالب کے موضوعات بھی ہیں پہلے عشق کا *concept* ملاحظہ ہو۔

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

گلا ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

اک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بہ دل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد — دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل — کہتے ہیں جسکو عشق خلل ہے دماغ کا
دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے — غمِ آوارگی ہائے صبا کیا
رشک کہتا ہے کہ اسکا غیر سے اخلاص حیف — عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے — پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

ان اشعار میں عشق کی خصوصیات اس طرح سامنے آتی ہیں۔

ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کہاں، عشق لذتِ زیست، دیوانگی، حسرتِ دید، وحشت۔ زنداں، بیاباں، اضطراب، دریا، گہر دل، کرشمۂ شوق۔ صرف نگاہ حائل، عشق نام ہے محویت و بے قراری کا اور اس لو لگن اور ریاضت کا اثر بھی ہوتا ہے لیکن شیشۂ دل ٹوٹ جانے پر، ماتمِ شہرِ آرزو، ہر خطرۂ خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ ناز ہے، دشت وفا میں ہر ذرہ جوہرِ تیغِ آبدار ہے، بلائے شبِ غم کا ہر لمحہ موت، دشواریِ سفر، ضعف، سایہ شبستاں ہے، حاصلِ الفت شکستِ آرزو ہے، تنہائی، بلائے جان۔ صبح کرنا شام کا جوئے شیر لانا ہے، سرمایۂ خانۂ دل کا جل جانا۔ آہ قیامت ہے .... حرماں نصیبی و ناکامی اور محرومی نے سب کچھ تباہ کر دیا ہے مگر عشق خارزارِ وفا میں سرگرم سفر ہے۔ مگر وہ ایک لمحے کیلئے سوچتا ہے کہ جس پر وہ ہر لحظہ جان سے قربان ہو رہا ہے وہ ناداں ہے اسکی دوستی؟ یہاں تک کہ وہ اسی موڈ میں یہ کہہ اٹھتا ہے کہ عشق خلل ہے دماغ کا۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ آرزومندی دیوانگی، کشمکش اور وفاکیشی یکسر ختم ہو گئی ہے اب اسے دماغِ عطر پیراہن بھی نہیں اس لیے صبا کی آوارگی کا غم تک نہیں۔ مگر پھر رشک، حسد کی آگ میں جلنے لگتا ہے لیکن عقل اس کی مدد کو آجاتی ہے اور محبوب کی فطری بے وفائی کا احساس دلا کر تسلی دیتی ہے۔ ذرا سکون ملا کہ پھر دل بے قرار مچل اٹھا اور کوئے ملامت کو چلا یا —
اس نامکمل خاکے سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عشق شاعر کی زندگی کا اہم جزو ہے وہ کبھی کبھی اس سے بیزار نظر آتا ہے۔ جب غم کی گھٹا چھا جاتی ہے تو بوئے گل سے اسکا ناک میں دم آتا ہے۔ محبوب کی بے التفاتی اور تنہائی کے احساس سے اسکا جینا دوبھر ہے۔ مگر آرزو نے شوق اور بیقراریِ دل اور وہ ہے۔ اور بندِ عشق آزاد نہ ہو پایا — اس لئے کہ عشق کے بغیر زندگی کہاں۔ عاشق کے کردار کے نقوش اس طرح ابھرتے ہیں۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے — عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے — آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا
زکاتِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا — چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا
محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ — شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا
بجلی سی کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا — بات کرتے میں تشنۂ تقریر بھی تھا

ہم نے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی — آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل — جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی — گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم — ترے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید — پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسد — غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار — اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالب — آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی — در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

ہے مجھے ابرِ بہاری میں برس کر کھلنا — روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا — زیارت کدہ ہوں دلِ آزردگاں کا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر — ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے — دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ہے اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد — ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

رہ گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط — تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عاشق کا دل وحشی ایک آفت کا ٹکڑا، عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا ہے، چاہے موجِ خون سر سے گذر جائے آستانِ یار سے نہ اٹھیں گے۔ محویت کا یہ عالم ہے، فرہاد پر طعنہ زن ہے کہ وہ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا، وہ زکاتِ حسن مجبوری کا طلبگار ہے کہ دل میں روشن کرنا چاہتا ہے، وہ جان پر کھیل کر نگاہِ بے حجابا کی خواہش کرتا ہے محبوب کو یہ بھی بتا دیتا ہے کہ میں قصاصِ شہیداں نگہ کا خون بہا کیا، جلوۂ محبوب کی آنکھیں تاب نہ لا سکیں پھر بھی عاشق ان کی دلنشیں آواز سننے کی آرزو کرتا ہے، وہ جان دینے کو کھڑا تھا کاش وہ پاس آ جاتے۔ نہ آئے نہ سہی۔ کوئی تیر ہی چلاتے، اس کا گھر خلد میں یاد آیا تو رشک سے پاس آ جاتے۔ نہ آتے نہ سہی۔ کوئی تیر ہی چلاتے، اس کا گھر خلد میں یاد آیا تو رشک سے رضواں جل مرے گا اور جانے اس لڑائی کا انجام کیا ہو، ساقی کی موجودگی

ہیں کہ ہوشیاری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ وہ اس کے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی ہے کہ کبھی اس کے کانوں نے وہ جاں فزا نغمے نہیں سنے ہیں، وہ محبوب سے رخصتِ نالہ مانگ رہا ہے کہ کہیں اس کے چہرے سے عاشق کا غم پنہاں آشکارا نہ ہو جائے۔ محبوب کا اس قدر خیال ہے۔ وہ اس کی باتیں نہیں سمجھتا اس کا بھید نہیں پاتا مگر یہ کیا کم ہے کہ وہ پری پیکر اس سے کھلا عاشق نے اس کو وفادار جان کے دل دیا۔ یہ کیا کیا کافر کو مسلمان سمجھا۔ شوخی کا پہلو۔ اپنی ہی غلطی کا اعتراف۔ اس پر الزام نہیں۔ دل ہی نہیں ورنہ اپنے داغوں کی بہار دکھاتا۔ دل میں گریے نے پھر شور اٹھایا قطرہ اشک میں طوفاں پنہاں ہے۔ گریے کا اثر در و دیوار سے عیاں ہے، وہ غم فرقت میں روتے روتے فنا ہو جائیگا۔ وہ دلِ آزردگاں کا زیارت کدہ ہے۔ وہ باغ نہیں جانا چاہتا کہ اس کے حال پر ہر گل زر خوں فشاں ہو جائے گا۔ اب وہ دل کہاں کہ جس پر ناز تھا اس لئے عرضِ نیازِ عشق کے قابل کہاں ہے۔ عاشق غم و اندوہ سے تنگ ہے اور اس لئے مرنا چاہتا ہے مگر وہ اسکو مرنے بھی نہیں دیتا، وہ جانتا ہے کہ اس کی قسمت میں وصالِ یار نہیں جب تک جیئے گا اسے یہی انتظار رہے گا۔ دل افسردہ یوسف کے زنداں کا حجرۂ تاریک بن گیا ہے لیکن ہنوز پر تو نقشِ خیالِ یار باقی ہے، وہ رہینِ ستم ہائے روزگار رہا لیکن محبوب کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ وہ دلی میں قحطِ غمِ الفت کی وجہ سے اس شہر میں بھوکا رہا۔ یہاں تک کہ وہ خاک میں داغِ تمنائے نشاط لے جاتا ہے اور آرزو کرتا ہے کہ اس کا محبوب بصد رنگ گلستاں ہو۔

غالب (جو عاشق بھی ہے)، کے دل و دماغ پر مختلف اوقات میں جو کیفیات رہی ہیں ان کی یہ نامکمل تصویر ہے۔ لیکن اس کے تجزیے سے ہمیں اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے اس کے دل و دماغ پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان میں صداقت جذبات کی عکاسی ہے وہ محبوب کی محبت میں مجنوں ہو جاتا ہے۔ اپنے جذبات کا خون ہوتے دیکھتا ہے صبر و ضبط سے کام لیتا ہے مگر شکایت بھی کر دیتا ہے مرنے کا ارادہ کر لیتا ہے لیکن اس کی خاطر (جو دراصل اپنی خاطر ہے)، پھر سے جینے کی کوشش کرتا ہے۔ خود اعتمادی، خلوص، صبر، بے باکی، دیوانگی، نالہ کشی، آرزومندی، وفا کیشی، رشک اور شوخی کے عناصر سے عاشق کا خمیر تیار ہوا۔ وہ خوددار عاشق بھی ہے اور محبوب کے در پر پڑے رہنے کا خواہشمند بھی۔ وہ رقیب سے جلتا بھی ہے اور اس کو اپنا ہم نوا بھی کر لیتا ہے۔ محبوب کا پیکر یوں مصور ہے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے	صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غرور تھا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ ترے جلوہ نے	کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے	خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں	زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم	میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات	عبارت کیا اشارات کیا ادا کیا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس	کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا	ہو گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری — حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

ہیں بسکہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے — ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

یہ قاتل صبر آزما کیوں — یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے — لے کے دل دل ستاں روانہ ہوا

مری چیں جبیں سے غم پنہاں سمجھا — راز مکتوب بہ بے ربطی عنواں سمجھا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک — ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

یاد کر وہ دن کہ ہر حلقہ ترے دام کا — انتظار صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے — کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

فلک کو دیکھ کر کرتا ہوں اس کو یاد اسد — جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا — اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ — اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا — قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

غالب کا محبوب اس قدر حسین ہے کہ خود کو آئینہ میں دیکھ کر دل دے بیٹھتا ہے، اسکے جلووں کی رنگینی آئینہ خانے کی وہ کیفیت کر دیتی ہے جو پرتو خورشید سے شبنمستان میں ہوتی ہے خورشید کی ضیا پاشی اسکے آگے ہیچ ہے، نقاب سے چھن چھن کر حسن کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں وہ اور کہاں، خوبی قد یار کی بدولت عاشق فتنۂ محشر کا مقصد سمجھتا ہے، عبارت، اشارات اور ادا غرضیکہ اسکی ہر بات قیامت ہے، وہ رشک بہجت گل ہے، عاشق اس پری وش کے حسن و جمال کا ذکر کرتا ہے تو راز داں بھی عاشق ہو جاتا ہے، اس کے لب اتنے شیریں ہیں کہ رقیب تک کو اس کی گالیاں بری نہیں لگتیں۔ اس کی اداؤں میں سادگی، پرکاری، بے خودی اور ہشیاری، اس کی بزم ایک طلسم ہے شیشوں پہ بھی نشہ کی کیفیت طاری ہے۔ یہ قاتل صبر آزما، یہ کافر فتنۂ طاقت ربا؛ وہ دلستاں رہزن بھی ہے۔ وہ غم پنہاں سمجھتا ہے راز مکتوب جانتا ہے مگر بے نیاز حد سے زیادہ۔ ظاہر کرتا ہے کہ کچھ نہیں جانتا۔ مگر ایک وہ بھی تھا کہ اس کا حلقہ دام انتظار صید میں دیدۂ بے خواب تھا اس کا دل بھی مہر و وفا کا باب تھا لیکن آج اسکو اپنے اسیروں کی بالکل پرواہ تک نہیں ہے۔ اب عاشق فلک کو دیکھ کر اس کی جفا کو یاد کرتا ہے، عاشق یہ بھی جانتا ہے کہ وہ ستمگر کسی کا دوست نہیں ہو سکتا اس کا ظلم اوروں پہ اس سے بھی زیادہ ہے وہ بے تعلقی کی انتہا کر دیتا ہے کہ اس نے جفا سے بھی ارباب وفا کو محروم کر دیا ہے۔ مگر اس کی مژگاں کا آلودہ ہونا نہ جانے کس کس کا لہو پانی کر دیگا۔

یہ ہے پیکر ناز کا نامکمل سراپا جس پہ مکمل ہونے کا گماں ہوتا ہے وہ اتنا خوب رو ہے کہ روشن ترین ستارہ سورج اس کی اداؤں کا قائل ہیں۔ وہ سمجھتا سب کچھ ہے مگر صبر و قرار پر بجلیاں گرانے کے لئے انجان بنا بیٹھا ہے جب وہ خود بیں و خود آرا نہ تھا تو خود

منتظر تھا اس کے دل میں وفا بھی تھی۔ مگر اب ظلم ہے ہاں اس کی چشمِ نم اب بھی دل عاشق پگھلا دیتی ہے ۔ غالب کے محبوب کے سینے میں دل بھی ہے۔

کلاسیکی اردو شاعری کے متعلق یہ اکثر کہا گیا ہے کہ اس میں عاشق اور محبوب کے کردار غیر فطری ہیں اور ان کی صرف خارجی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ عاشق گریباں چاک ہے اور محبوب رشکِ خورشید۔ خصوصیت کے ساتھ ہندی والوں کا یہ اعتراض ہے ان میں [illegible] کی کمی ہے یعنی ان کی فطرت اور عمل و ردِ عمل سے پیدا ہونے والی کیفیات نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ان مختصر خاکوں سے ہی یہ غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔

اب آخر میں غالب کے اندازِ بیان کی خصوصیات کی طرف توجہ دلاؤں گا Content & Form کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ میں نے اس مختصر سے مطالعے میں غالب کے خیالات و جذبات اور طرزِ بیان کے امتزاج کی چار سطحیں پائی ہیں۔

۱۔ ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا — اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا
ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال — خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے — جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا — غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں — شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن — شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا
غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل — خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

یہ وہ رنگ ہے جہاں یہ امتزاج نہایت خوب صورت ہے۔ اس میں شاید شریکِ غالب کم ہیں۔

۲۔ غالب جب معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی کی طرف توجہ کرتا ہے تو یہ سطح سامنے آتی ہے یہ مشکل پسندی کی دین ہے۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل — کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز — ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

۳۔ شاید مشکل پسندی کو تنگ آ کر وہ آسان اور انداز بیان اختیار کرتا ہے۔ غالب کے اس طرح کے اشعار بعد مقبول بھی ہیں۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

ترے وعدہ پہ جیے تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

دوست غمخواری میں مری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

۴۔ شاید ہم عصر شعرا کی مقبولیت نے غالب کو اس طرز بیان کی طرف راغب کیا ہوگا اسمیں کہیں کہیں عامیانہ پن بھی موجود ہے۔

سبزہ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

نمبر ۱۔ اور نمبر ۳ کے اشعار زیادہ تعداد میں ہیں اور نمبر ۲ اور نمبر ۴ کے غالب کے اردو دیوان کی ردیف الف کے اس تجزیے کے بعد میں جن نتائج پر پہنچا ہوں ان پر تفصیل سے بحث نہ کر سکا جس کا مجھے احساس ہے اور اسی لئے میں نے مختصر جائزہ بار ہا کیا ہے۔ اس کے لئے زیادہ وقت اور صفحات کی ضرورت تھی۔ بہر حال۔ مضمون کے نام پر کچھ تو ہوا۔ جان تو بچے گی۔
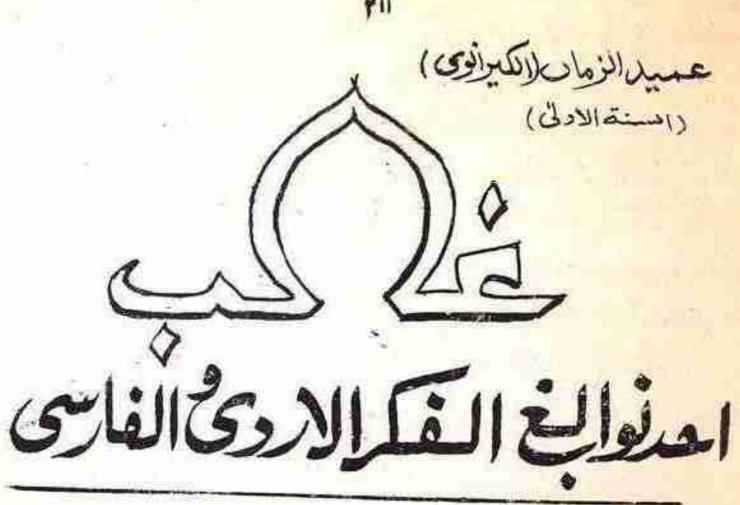
عميد الزمان (الكيرانوي)
(السنة الاولى)

غالب
احد نوابغ الفكر الاردي والفارسي

في شهر فبراير المنصرم اكتملت مائة سنة لوفاة غالب الشاعر الهندي الفذ العظيم، الذي كان وبلا شك نابغة من نوابغ الفكر الاردي والفارسي، فانه له أياد كبيرة ومساهمة فعالة في تطوير الفكر الادبي وبناء الادب الاردي الجديد على وجه الخصوص ومن ثم فان الادب الاردي يدين له بمنن لا يضارعه فيها غيره من جهابذة الفكر وشخصيات الادب الاردي

انتهزت هذه الفرصة العظيمة لوضع برنامج شامل للاحتفالات بذكرى وفاته المئوية في انحاء الهند وخاصة دلهي عاصمة البلاد، حيث يوجد ضريحه، والتي كانت موطن اقامته منذ سنه الصغيرة الى آخر ايام حياته -

ولقد تمت هذه الاحتفالات بـ "نجاح" طبقا للمواعيد البرنامج المختلفة وفي المظاهر الاحتفالية الباهرة التي قامت باعدادها اللجنة التحضيرية وقد شاركت بعض الدول الاجنبية واهتمت بهذه الاحتفالات سواء بايفاد ممثليها او اقامة ندوات علمية حول شخصية هذا الشاعر ونتاجه الفكري الادبي، واستراحت الآذان من اللجة والضوضاء

التي كانت لها صدى كبير في الصحافة الهندية -

قد يظن القارئ - وخاصة القارئ العربي الذي ليس له المام بحقيقة قضية اللغة الاردية - ان كاتب المقال ليس من المحبين لهذا الشاعر، وانه قد بلغ به الكره الى حد لم يعد يعجبه التنويه، بنبوغ الشاعر والتقدير لمآثره الفكرية - الا ان الامر على العكس من ذلك تماماً - فانني احب هذا الشاعر حبا عظيما - وان حبي هو الذي يجعلني ممن لا يطمئنون الى مثل هذه الاحتفالات التي ليست الا محاولة من تلك المحاولات التي يلجأ اليها بقصد إلهاء الجماهير وصرفهم عن مطالبها الاصلية اذ يرمي بها الى تغطية الحقائق....

وانني اسأل القارئ هل يطمئن هو اما اذا اعلن، بلد ينطق اهله بلغات مختلفة وتكون العربية احدى هذه اللغات اقامة احتفالات بذكرى ميلاد "المتنبي" مثلا على نطاق واسع وعلى المستوى الرسمي والشعبي، ويكون موقف الحكم القائم في هذا البلد سلبيا بالنسبة العربية، لا يعترف بحقها المشروع على كثرة الناطقين بها فتصبح اللغة مشردة في ديارها ويكون مصيرها الى الزوال والانقراض على مر الايام وتعاقب الاجيال هل يطمئن الى مثل هذه الاحتفالات المزيفة "الدبلوماسية" طبعا، لا، لان المتنبي شاعر العربية، وان حبك للمتنبي يستتبع حب العربية، فعادة يكون الحب للشاعر ولغته وحدة لا تتجزأ -

واذا اقتنع القارئ بما سبق فانه يعذرني في عدم ارتياحي لهذه الاحتفالات واتفل هذا الموضوع خشية الاطالة فيما لا طائل تحته، فاما تناولت القضية الاردية بالبيان في شرح وتفصيل وانتهز هذه المناسبة لاكتب نبذة عن شخصية الشاعر وشعره الذي فاق في روعة الخيال وروعة الفكر والبيان،

وقبل ان اتعرض لبيان مدى تشخصية الشاعر اود ان القي بعض الاضواء على مختلف نواحي الحياة الاجتماعية في العهد الذي يبتدأ من قبل ميلاد الشاعر

ویمیتد الی عہد الحافل بالعواصف السیاسیة الھوجاء والذی راجہ فیہ شاعرنا اسعد الایام واسرھا۔

عصر غالب

۱- الحیاة السیاسیة

کان الوھن قد تطرق الی جسد الدولة المغولیة منذ عہد اورنجزیب وقد تمکن الانجلیز من بسط نفوذھم وبسط سیطرتھم علی الھند اثر وفاة اورنجزیب واخذت تتقلص رقعة الدولة العظیمة التی اتسعت فی عہدہ، واخذ الامراء یجھرون بعصیانھم للمرکز ویعلنون استقلالھم بحکم الولایات الصغیرة. وکان الملک بہادر شاہ ظفر آخر الملوک المغولیین وقامت فی عصرہ حرکة تحریر کبری ضد الانجلیز انتھت بالفشل فی سنة ۱۸۵۷

۲- الحیاة الاجتماعیة

لقد کانت الھند موطنا لأمم کثیرة ومرتلا لمختلف الحضارات وکانت تتفاعل ھذہ الحضارات تاثیرا فی الحیاة الاجتماعیة، وقد نشأت عن تفاعل الحضارات واختلاط الاجناس ثقافة جدیدة وکانت من بینھا الاردیة

وکانت الفارسیة ھی اللغة السائدة فی الدوائر الرسمیة فی عہد الاباطرة المغول فکانت طبقة الخاصة تھتم باللغة الفارسیة اھتماماً کبیرا کما کانت تھتم بدراسة اللغة العربیة، ھذہ کانت عادة الطبقة المثقفة التی کانت تمثل مختلف الطوائف من المسلمین وغیرھم وکان المسلمون والھنادک یعیشون فی وئام وانسجام۔

٣ - الحياة العقلية

في أواخر عهد المغول كانت اللغة الأردية قد ازدهرت
ووجد عدد كبير من أجلة الشعراء وكان البلاط الملكي يوليهم
عناية خاصة، ويقدر جهودهم وكان الملك بهادر شاه ظفر
نفسه شاعراً، يحب الشعر والأدب ويكرم مثوى الشعراء والأدباء
فكان الشعراء الكبار يحيون حتى في البلاط كل تقدير وتشجيع وكان الشعراء
يتسابقون في إجادة الشعر ويحاول كل منهم التفوق على الآخر وليس
معنى ذلك أنهم كانوا يتسابقون بغية الحصول على المال والثراء، فقد
كان بعضهم شديد الغيرة حريصين على كرامتهم الشخصية - وإنما
كان ذلك لأن الشعر والأدب كانا يعتبران ميزة للأشراف وطبقة الخاصة
وكان لرجال الشعر والأدب منزلة رفيعة في المجتمع هكذا فقد كانت
سوق العلم والأدب نافقة في دلهي ولكهناؤ وغيرهما من المدن

غالب في عصره

من هو؟

هو أسد الله خان غالب بن عبد الله بيك من
أصل تركي، وكان لأجداده نفوذ وكلمة مسموعة على عهد السلجوقيين
ولما آل الحكم السلجوقي إلى الزوال، انتقل أجداده إلى سمرقند
فأقاموا بها، ثم قصد جده الهند فوصل إلى لاهور حيث
أصبح رفيقاً لمعين الملك وبعد أن زال نجمه غادرها إلى دلهي
وكان ذلك في عهد شاه عالم فلقي من البلاط الملكي المغولي تقديراً
واحتراماً وحصل على وظيفة، ولكن ذلك لم يدم طويلاً حتى تجمعت
سحب البؤس والشقاء في السماء واكفهر جو الهند السياسي

وازدادت الاوضاع تأزماً بعد وفاة شاه عالم تفقدت عائلته كل
ما كانت قد حصلت عليه من ممتلكات. وقد رحل ابوه عبد الله
بيك بن لهجى في مثل هذه الظروف الصعبة وسافر الى لكهنؤ ثم حيدرآباد
طلبا للرزق، واستقر به المقام آخر الامر عند راجا بختاور
سنج حاكم ولاية الور حتى توفي في احدى حروبه. وتنتهي
سلسلة نسب اسرته الى الملك افراسياب. فتوارث افرادها
"النزعة الملكية" كابرا عن كابر، ولم يخضع احد افرادها لخطوب
الزمان فخاضوا معترك الحياة في بسالة وشجاعة.

ميلاده

ولد غالب يوم الاربعاء ٢٧ ديسمبر سنة ١٧٩٧ في مدينة آجره حيث
يوجد "تاج محل" وكتب عن ولادته باسلوب تهكمي "وان كانت
القاعدة العامة هي ان ينال مجرموا هذا العالم المادي عقابهم في
عالم الارواح على انه ما حدث الينا بالفعل اذ ارسل مجرمو عالم الارواح
الى الدنيا لينالوا عقوبتهم فقد بعثت اليها لمواجهة العقاب في
الثامن من رجب سنة ١٢١٢ هـ" وهو في الحقيقة تعبير عن الام حياته
المتمثل في الآلام النفسية والمالية والجسدية التي قاسى منها في
معظم ادوار حياته كما يدل على ذلك ما اسلفنا وما سنقدمه.

طفولته

توفي ابوه وهو ابن خمس سنين فتولى تربيته عمه ميرزا نصر الله
بيك الذي كان حاكم اكبرآباد من قبل المراهتا، واحاطه بحبه
وحنانه، وبذا فانه ولئن كان لوفاة ابيه في مثل هذه السن
الحديثة اثرها الطبيعي في نفسيته من حيث لا يشعر، ولكنه لم يشعر
بفراغ كبير حينذاك نتيجة تقلبه في النعمة وما لقيه من عمه من

عطف وشفقة ، واستمر عمه فى محاولة تجنيب ابن اخيه الشعور بالحرمان ولكن ظلت الايام العصيبة تترددون ان يشم الطفل فى الحياة بالمرارة الحقيقية التى لم يكن له منها مناص ، فلم يطل عهده بهذا الهناء فقد توفى عمه بعد حادث ابيه بحوالى ثلاث سنوات .

ان كبار اسرته كانوا قد تركوا من ورائهم ممتلكات واسعة ولكن الايام قد انقلبت عليه كليا اثر وفاة عمه ، فقد صودرت هذه الممتلكات التى ورثها وسلبت الاسرة ثراءها . وان تقلب الولد فى النعمة ثم مفاجأته بالفقر وحرمان العطف الغامر لعمه فى نفس الوقت كان له اثره الطبيعى فى نفسه غير ان ذلك كان من العوامل التى ساعدت شاعرنا على نضوج العقل فى سن مبكرة وقبل ما هو المعتاد .

ثقافته

لم تكن فى عصره جامعات او مدارس كبيرة للثقافة والتعليم وكانت العادة عند العائلات الكبيرة والاعيان ان يعينوا اساتذة يتولون تربية ابنائهم ويكرسون اوقاتهم على تعليمهم وعلى نفس المنهج تمت ثقافة شاعرنا ، وكان من حسن طالعه ان حظى بفرصة الافادة من عالم فارسى جليل فقد قدم استاذه الفاضل الى اكبر آباد (آجرة) مسقط راسه اقام فى منزله لمدة حوالى سنتين كان التلميذ شديد الذكاء يميل الى العلم وكان الاستاذ متضلعا فى فنه وحريصا على تثقيف تلميذه فكانت النتيجة ان استفاد التلميذ فى ظرف هذه المدة القصيرة اكثر مما قد يستفيده الآخرون فى مدة اطول منها بكثير ، واجاد اللغة الفارسية اجادة كانت محل موضع الغبطة للكثيرين ، وكان الشاعر نفسه يعرف ذلك ويعتز به .

حالته الاجتماعية

فی سن صغیرة انتقل غالب من وطنه آکبرة الی دلهی، و تزوج سنة ۱۲۲۵ھ ومعنی ذلك انه کان فی الثالث عشرة من عمره، حینذاك وقد کتب یذکر هذه الوقعة من حیاته بهایاتی :- فی ۷ رجب سنه ۱۲۲۵ھ صدر علی الحکم بالسجن المؤبد و وضع الغل (یعنی الزوجة) فی رجلی، واستقر الرأی علی ان تکون دلهی هی سجنی فزج بی فیه لاقضی به ایام العقوبة المؤبدة" وقد عمرت زوجته طویلا فلم تفارقه طوال حیاته، وکانت متدینة محافظة علی الصوم و الصلوة علی عکس زوجه، ومن اجل ذلك فکثیرا ما کان غالب یخاطبها بـ" اخت هارون" ورزق سبعة اولاد ذکورا و اناثا الا انه لم یعش احد منهم اکثر من خمسة عشر شهرا۔

ولم یکن للدین سلطانه القوی علی نفس الشاعر فلم یکن یصوم ویصلی ویتسامح فی شرب الخمر ویمیل الیها میلا شدیدا ویتبین بذکرها وبالرغم من ذلك فانه کان یؤمن بالله و رسالة نبینا محمد صلی الله علیه وسلم ویعتز بدین الاسلام ویحترم مبادءه حتی انه یظهر فی بعض اشعاره الفارسیة بمظهر صوفی کبیر۔

منذ انتقاله الی دلهی فی سنه الصغیرة ظل مقیما بها یقضی بقیة حیاته فی دلهی باستثناء بضعة الشهور التی استغرقتها اسفاره خارج دلهی، وقد کانت هذه الاسفار نتیجة ظروفه المالیة اثر الحوادث التی شهدتها دلهی ولکن الحیاة لم تحل له خارجها کما ان غیرته ابت علیه الاقامة فی بعض المدن التی رحل الیها بقصد حل المشاکل المالیة فعاد الیها و اقام بها حتی توفی الی رحمه الله فی ۱۰ فبرایر سنة ۱۸۶۹ ودفن فی نظام الدین احدی ضواحی دلهی التی اصبحت الآن جزءا من نیو دلهی ...

غالب الاديب

بداية حياته الادبية

وحين الفتى فى نفسه الموهبة الشعرية والميل القوى الى الادب من شعر ونثر، فقد جرى الشعر على لسانه وهو فى السنة الثانية عشرة من عمره ولم يزل يصقل هذه الموهبة الالهية ويزينها بمواصلة قرضه للشعر وبدأ شعره بالاردية، ولكنه كان يحس فى نفسه ميلا شديدا الى الادب الفارسى فعكف على نظم الشعر الفارسى ثم عدل عن ذلك وعاد يقرض الشعر بالاردية، وشعره بالفارسية اكثر منه بالاردية

لقد كان الملك بهادر شاه ظفر شاعرا كما اسلفناه، وكان استاذه الذى كان يعرض عليه شعره للاصلاح هو "ذوق"، شاعر الهند المعروف وبعد وفاته حل غالب محله لاصلاح شعر الملك فاصبح غالب موضع تقدير واكرام فى البلاط الملكى وعين له مرتبا شهريا. ووكل اليه مهمة كتابة تاريخ لملوك العائلة التيمورية ولم تمض الا سبع سنوات على ذلك حتى انقرضت المملكة المغولية، وقد شهد بنفسه مأساة ثورة سنة ۱۸۵۷م الفاشلة التى كانت حدثا كبيرا فى تاريخ الهند، فقد جاء هذا الفشل قضاء على كل ما كان يرجى فى الافق من بصيص الامال لانقاذ الهند من براثن الاستعمار الانجليزى وخارت الهمم لفترة من الزمن بعد ان تمخضا اتوى الاحتلال البريطانى، وزالت الدولة المغولية ليبدأ عهد العبودية والظلام فى تاريخ الهند

التحليل النفسى

وان ما اسلفناه يكفى للدلالة على ان هذا الشاعر عظيم

عاش فی فترة عصيبة من التاريخ السياسی للهند فقد اصيب بحوادث فاجعة منذ الصغر وقد رأت عينه انقراض الدولة المغولية وما تعرضت لها" دلهی" عاصمة البلاد من المآسی الاليمة المحزنة والتی كان لها تأثير كبير فی الحياة الهندية الاجتماعية وكجزء من البيئة التعسة التی كانت تواجه انواع البؤس والشقاء كان من الطبيعی ان يكون لشاعرنا حظ من كل ما مر بأمته ووطنه، فكل اولئك كان له اثره الكبير فی نفسية الشاعر .

غير ان هذه الحوادث المذهلة لم تسيطر على شاعرنا فقد ظلّ متمالك الاعصاب قوی الشكيمة ولم يبد تأثراً كبيراً بما مر عليه من نوائب والآم فلم تجعل منه شخصا سلبيا أو انطوائيا ولم تتولد فيه الصفات السلبية كالقنوط واليأس والانعزالية ونزعة الفرار من الحياة وانطفاء شعلة الذهن الوقاد، بل وانما ساعدته الحوادث على اكتساب صفات طيبة واخلاق ايجابية كالحب والعطف وذوق الجمال وخفة الروح ورقة الاحساس ورفاهة الخيال بل وعلى العكس من ذلك فقد كان فيه عنصر وافر من الفكاهة والظرافة كما يتبين ذلك من كل من شعره ونثره واحاديثه ومن كل تصرفاته ولا نجده يتبرم الحياة وانما نراه محبا للحياة ومبتسما لها، ورد الفعل كهذا لا يوجد الا فی حالات نادرة.

شعره

كان غالب نابغة من نوابغ الشعر والادب فقد كان شاعرا موهوبا منحه الله موهبة شعرية خلاقة وقريحة وقادة وكانت عاطفة الجمال لديه موفورة بالاضافة الى رفاهة الخيال اللازمة لتوصيل الاحساس بالعواطف المرهفة، وكانت له قوة تأمل وتفكير مما هيأ له الطاقة الابداعية الهائلة الفياضة فجاء شعره يتسم بدقة الجمال الرفيع ونزرة الخيال وعمق الفكر، وذلك بلفظ سهل وتعبير قوی وبطريقة

فنية رائعة من الحرف والبيان

لم يكن غالب شاعرا فلسفيا كما هو الاعتقاد السائد الذى يبنى على خطاء، وان كانت هذه حقيقة ان ذهنه كان فلسفيا ولكنه كان اكثر شاعرية منه فلسفة۔ وان كان يوجد فى شعره عنصر التفكير والتامل والبحث ولكنه لا يعيرنا بفكر جديد ولا يقدم لنا نظرية حياة او فلسفة كون جديدة ولكنه يحاول بنفسه ان يدرك حقيقة الكائنات فهو يثير نفس الاسئلة التى لم يزل يثيرها كبار الناس من اولئك الذين اوتوا اذهانا نيرة وعقولا مفكرة۔ وانما الشئ الذى يظهره بمظهر الفلسفى ويوقع الناس فى الاعتقاد السائد هو روعة بيانه وسحر اسلوبه الذى يمتاز به شاعرنا۔

ولكن ذلك ليس منقصة فى شعره فان الفلسفى لا يكون شاعرا واذا اقدم شيئا من افكاره منظوما فانما يكون ذلك فلسفة منظومة وشتان بينها وبين الشعر، ولقد قال المعرى قديما، "ابو تمام والمتنبى حكيمان والشاعر البحترى" وبغض النظر عن صحة ما يحكم به المعرى عن ابى تمام والمتنبى فاننى باثبات قوله هذا انما اريد ان ابين ما يوجد عند المعرى من فرق بين الحكمة والشعر۔

نثره

لم يكن غالب شاعرا فحسب فلقد كانت لديه القدرة المعجزة فى كتابة النثر وله دور رائدى فى هذه الناحية من ادب الاردية فقد تحلل من جميع القيود البالية التى كان يلتزم بها الكتاب فى عصره فانقذ الادب الاردى من الاسلوب المتجمد العقيم الذى كان سائدا حتى عصره فقد ابدع اسلوبا فى الكتابة بالنثر لم يسبقه اليه احد... اسلوبا بعيدا عن السجع والقافية والتعقيد والحشو اللفظى... اسلوبا كان اساسا قامت عليه الاساليب الجديدة فى الكتابة باللغة الاردية

فهو يستعمل جملا صغيرة بسيطة وتعبيرات سهلة مؤثرة والشئ الذى اكسبه الشهرة الى الآن لهذا الوصف هو مجموعة رسائله التى كتبها الى تلاميذه واصدقائه - فلقد يخيل الى من يقرأ هذه الرسائل انه يسمع حديثا شفويا يجرى بين شخصين -

كان من الواجب على ان اقدم نماذج من شعر غالب ولكن بما ان ترجمة الشعر باستيفاء معانيه عملية صعبة تتطلب تركيز اهتمام وتكريس جهد مما يحتاج الى وقت كاف وهو الشرط الذى لا يتوفر لى الآن نظرا - لان اوقاتى فى النهار مشغولة بالمكتب وفى المساء بالكلية بالاضافة الى ان الامتحان السنوى قد قرب جدا - لذلك فانى اكتفى بأن اثبت مع هذا موجز اراء نخبة من رجال العلم والفكر والادب عن هذا الشاعر المفلق، كما اعقبه بقصيدة من ديوان غالب الاردى ترجمها وشرحها الاستاذ عبد الرحمن الطاهر لكى يطلع القارئ العربى بعد قراءة هذا المقال عن حياته وشعره على نموذج من شعره

غالب فى نظر رجال العلم والفكر

الدكتور عبد الرحمن البجنورى

ان البحث الذى قدمه لنا حول ادب غالب تحت عنوان "محاسن كلام غالب" له قيمته العلمية الكبيرة وما قاله عن شاعره المحبوب -

" ان للهند كتابين الهاميين وهما ويد مقدس ، وديوان غالب "

وان شخصية غالب وجوته GOETHE تبنى بمنتهى حدود الخيال الانسانى فقد كانا خاتمين للشاعرية ، وانما تكون غزارة الافكار الجديدة

والحقيقة والمجاز، والطبيعة والحياة في ذهنيهما المجبرة لصورة الوحدة" وكل منهما ملك المملكة الشعر، وما من ناحية من نواحي الحياة كالمدينة والحضارة والتعليم والتربية والفطرة، إلا وقد كان لهذين الشاعرين تأثير عليهما۔

الدكتور اقبال

كان اقبال معجبا بجوته GOETHE فهو ايضا يرى ان كلا من غالب وجوته من طراز واحد، وذلك ما يقصده بكلمة "هم نوا" في شعره

آه تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

بروفيسور رشيد احمد الصديقي

يقول، ان هناك بعض كبار الرجال المتوفين الذين كثيرا ما تمنيت مقابلتهم في حياتهم، وغالب واحد منهم وإذا سئلت، ماذا اعطت الدولة المغولية للهند؟ فانني اذكر في الجواب ثلاثة اسماء، غالب اردو، تاج محل، فكان كلا من ذلك نتاج حضاري للهند

الاستاذ عبد الماجد دريابادي

مما قاله عنه: - لا شك في ان غالب له ايضاً مكانة رفيعة في الشعر الفارسي ولكنني ارى بالنسبة لصنف "غزل" بالاردية خاصة انه لم يولد شاعر مثل غالب لا قبله ولا بعده

وعندما اطلعت على مجموعة رسائله التي جمعها مولوى مهيش پرشاد بنارسي ظهرت العبقرية تتجلى من كل سطر من الرسائل، وبهذه المرآة يظهر غالب انسانا كاملا وعبدا خالصا، وان ابرازه بنفسه لتلك الحقيقة منتهى الكمال في الانشاء ---..

قصيدة من ديوان غالب

المقال الذى قدمته تحت عنوان " غالب، ادن
نوابغ الفكر الاردى والفارسى " تنقصه النماذج
الشعرية بشكل لا يمكن التغاضى عنه لذلك فقد
رأيت من المناسب ان اقدم فيما يلي قصيدة مترجمة
من ديوان غالب الاردى عثرت عليها فى مجلة
" الوعى " وقد قام بترجمتها وشرحها الاستاذ
عبدالرحمن الطاهر ونشرت فى عدد اكتوبر
سنة ١٩٦٥ ودينابر سنة ١٩٦٦ المشترك
واثبته كذلك الكلمة الوجيزة التى قدم بها
الاستاذ الطاهر للقصيدة ."

رئيس التحرير

غالب هو اسد الله خان بن عبدالله بك خان وعرف بميرزا
نوشه واشتهر باسم " غالب " عند الجمهور وشعراء شبه القارة الباكستانية
الهندية يتخذون عادة اسماء غير اسمهم الحقيقى يشتهرون باسمهم
المستعار فى شعرهم ودواوينهم هذا الاسم فى اصطلاح الادب الاردى
بالتخلص واصله من تركيا ، قطن جده فى دلهى (عاصمة الهند) فى
زمن السلطان شاه عالم .

وهو اكبر شاعر عرفته اللغة الاردية، بل هو اشعر شعراء العالم، اجاد في جميع اصناف الشعر وانواعه وامتاز بتحليل العواطف النفسية لاسيما الشوق والهوى وما يلاقي العاشق في شدة الوجد والجوى ترى في شعره اختراع امرئ القيس وابداعه وحكمة المتنبي وفلسفة المعري۔

له ديوان باللغة الفارسية ومجموعة رسائل باللغة الاردية ابتكر فيها اسلوب الترسل، اما ديوانه باللغة الاردية المسمى بديوان غالب فهو معجزته من ناحية اللغة والمعنى والبلاغة۔

توفي بدهلي عام ١٨٦٩م وكان عمره ثلاثة وسبعين سنة

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ترجمه:- أتظن ان هذه اهو الكل؟ انما ظهر شيء يسير في زي الازهار وشقائق النعمان فلا تسل عما توارى تحت التراب من الوجوه الجميلة۔

شرحه:- ان ماتراه فوق الارض من الرياحين والازهار الجميلة وشقائق النعمان كل ذلك نبذة يسيرة واثر طفيف من جمال الذين دفنوا تحت الارض فما اجمل الذين حوتهم الارض وهذا مثل قول الشاعر العربي

وما طيب الرياض لها ولكن
كساها دفنهم في الترب طيبا

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

ترجمه:- قد كنت خبيرا ببث الروح في النوادي وتزيينها بالوان مختلفة غير انها صارت بعد زخرفة في زاوية النسيان۔

شرحه:- لا يغرنكم الشباب والجمال، لانه ظل زائل، ودولة ذاهبة فقد كنت انا بنفسي في شباب اللهو واللعب واختال لصيد الغزلان في النوادي بطرق شتى ولكني قد صرت الآن كأني لم اكن شيئا مذكورا۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

ترجمہ:- كانت بنات النعش في السماء مستترات طوال النهار، ليت شعري ما الذي خطر ببالهن ليلاً حتى تكشفن ؟

شرح:- ان التعري في الليل عمل يوافق الطبيعة ولا يخالف العادة، فان الليل لم يخلق الا ليستمتع فيه الاحباء بالوصال بدون احتجاب واحتشام الا ترى الى بنات النعش ظللن وراء الحجاب وتعرين بالليل - فكأن الشاعر يقول لعشيقته انا لا نطلب منك شيئاً فوق العادة فدعي الامتناع والانزواء في ظلمة الليل التي تدعو الى الانجلاء وتحث على الطرب والتعري -

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

ترجمہ - يظهر كان يعقوب (عليه السلام) لم يتفقد ابنه يوسف (عليه السلام) في السجن غير ان عينيه عادتا منفذي جدار السجن

شرح:- لا تحملي هذه بالي على التسلية، فان في القلب نارا ساعية وان صبري على هجري كصبر يعقوب عليه السلام على فراق ابنه فلم يترك داره ولم يبحث عنه بعيدا، وانما لزم حجرته وبكى واشتكى الى الله تبارك وتعالى حتى ابيضت عيناه من الحزن، وحيث ان الاعمى لا يغمض جفنيه تبقى عيناه مفتوحتين لا بريق فيهما استعار الشاعر لهما كلمة "منفذين" وفيه معنى شدة الانتظار

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

ترجمہ:- تكره كل منافسيه وتنكد منهم غير ان زليخا فرحانة على نساء مصر حيث فقدن صوابهن برؤية قمر كنعان -

شرح:- ان الغيرة من عادة العاشقين وانهم لا يحبون مشاركة احد في عشيقتهم ويحقدون على من ينافسهم الا امرأة العزيز فانها لما سمعت بمكرهن ارسلت اليهن واعدت لهن متكأ واتت كل واحدة منهن سكينا

وقالت ليوسف اخرج عليهن فلما ظهر له، يمكن انفسهن وغاب رشدهن وعلقن به كل محق وقطعن ايديهن وقلن حاشا لله ما هذا بشرا فرحت زليخا غاية الفرح حيث انهن ارتكبن نفس الجناية التي كن يلمنها عليها وانهن سوف يقلعن عن لومها لكانها شركتهن في حب يوسف

لاحظ المعنى اللطيف الذي ابتكره الشاعر من هذه القصة حقا انها لفكرة نادرة

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

ترجمہ :- دعوا نهري الدم يجريان من عيني، أليست هذه ليلة الفراق؟ كأني بهما شمعتان قد اشتعلتا.

شرح : يمثل الشاعر العينين بالشمعتين وما يسيل منهما بنهري الدم۔ كأنه يقول لاتمنعوا الصب الحزين شئ كالبكاء، فكما يجلي الضوء الظلام فكذلك يسلي البكاء الهيام، ويشفي الدموع غلة الهجران، كما قال امرؤ القيس

وان شفائي عبرة مهراقة

فهل عند رسم دارس من معول ؟

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

ترجمہ: لننتقمن من هذه الحوريات في الجنة، ان صرن هناك حورا بقدرة الله العزيز۔

شرحہ :- يعتقد المسلمون انهم يزوجون في الجنة بحور عين ولهم الحق هنالك في انتقام من يريدون منهن وهن هنالك لايحاولن الصدود والامتناع بل جعلهن الله لهم طائعات منقادات، فهن اذن طوع امرهم لايعصينهم فالشاعر يقول لئن عن بتنا هولاء الاوانس بنهب قلوبنا وسلب نفوسنا وقرار عقولنا، نصبر فان هذا يوم لهن علينا ولكنه سوف ياتي لنا يوم عليهن وليس ذلك على الله بعزيز ان يجعل هؤلاء الغواني في الجنة حورا فنناخذهن هنالك

تارکتهن وتشتت بقیتهن ارانا من العذاب مثل ما ذقتنا فی الدنیا۔

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ترجمہ: - ما اسعد الذی اسدلت علی عضده شعرك. فالنوم نومه والکبریاء کبریاؤه واللیالی لیالیه ۔

شرح: - ان من ساعده الحظ علی ان حظی بوصالك الذی هو كل المنی ومنتهی الامال فلا تسئل عن جذله السامی وارتیاحه وسروره، فهو الذی ینام ملء جفنه، وله الحق بان یتیه ویزهو ویتنزه ما یشاء وهو حقیق بان یتمتع بملذات الدهر

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

ترجمہ: - وما ان دخلت البستان فتحت المدرسة، وبدات الحمائم تبکی تسجعها بعد سماع انینی ۔

شرح: - یقول الشاعر کانی کنت استاذ الحمائم والعنادل واماطها واحس بنی جنسها علمها النوح والعویل، ابکی قبل بکائها تقتدی بی وتحکینی وتشارکنی فی الشجو. والظاهران الشاعر یرید انه استاذ الشعراء الزملاء

من عادة الصبیان انهم یسکتون عند مغیب الاستاذ واذا راؤہ آتیا من بعید یرفعون اصواتهم بقراءة الدرس

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

ترجمہ: - یارب - لم تنفذ قلبی تلك الاعین التی صارت من قصرِ حظی هدابا۔

شرح: - یتعجب الشاعر من اعین الأوانس القاصرات الطرف کیف تمکنت من نفوذ قلبی وهی مریضة مطبقة جفونها من الحیاء، لا تکاد تری منها غیر الاهداب وهذه الاهداب سهام تخرق القلب

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

ترجمہ:- لما ادخرت سعيي في كبح آهاتي ولكنها عارضتني تبارت متواصلة حتى كانها غرزت شقة جيبي ـ

شرحہ:- من عادة العاشق اذا هاج انه ينسى نفسه ويمزق جيبه ولا يحافظ على المراسم المعهودة ولا يبديه الا الآهات المتواترة المتواصلة فالشاعر يقول ان هذه الآهات بخروجها مرة ودخولها اخرى اثرت في جيبي المشقوق كان الداء صار الدواء

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

ترجمہ:- ولما دخلت عليها لم يبق عندي رد شتائمها لأني كنت قد بذلت جل ما كنت اتذكرها من الدعوات على الحارس

شرحہ:- لما اردت ان ازورها حال دونها الرقيب والحارس ولم يسمح لي بمقابلتها فترددت اليه وتملقت له، وكلما زادني مبادرتها زدت له دعاء وثناء حتى اذن لي بالدخول عليها فكانت هي الاخرى تنهال علي بالشتائم والرائم فلم اقدر على رد شتائمها اذ لم يبق عندي من الادعية شيء ـ

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ترجمہ:- الخمر منعشة لمن تناولت يده الكاس وكأن جميع خطوط الكف بمجرد وصول الكاس اليد تنقلب الى حبل الوريد ـ

شرحہ:- ليست الخمر مما تنعش شاربها فحسب ولكنها تحيي الرميم لما يمسها الشارب، فمجرد النظر اليها يحدث الخفة والنشاط، وعندما تبلغ الكاس اليد لا تلبث ان ترى خطوط الكف كانها تحولت الى الشرايين التي تنبض بالدم ـ فما رأيك في تأثيرها حينما تجري في العروق ... ؟

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ترجمہ: نحن موحدون (نؤمن بالتوحید) وشعارنا ترک المراسم؛ ان الملل لما تمحی تؤول الی شعب الایمان۔

شرحہ:- التوحید کلمہ فی دین اللہ فقط فالادیان کلہا سوی الاسلام ظاہرۃ من مظاہر الشرک الذی لا یرضاہ الموحد فکلما تحطم ظاہرۃ من مظاہر الشرک یزداد الایمان قوۃ الی قوتہ

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ترجمہ:- ان اعتاد المرء الحزن انمحت الاحزان، ولقد صبت علی الشدائد الی ان تہونت لی۔

شرحہ:- تمحی الاحزان وتنجلی الأشجان عند ما یألفہا الانسان وینأنسہا ولقد کابدت المشقات واحتملت المصائب التی ہونت علی احتمالہا۔ کما قال الشاعر

فصرت اذا اصابتنی سہام
تکسرت النصال علی النصال

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

ترجمہ:- یا اہل العالم - لئن استمر "غالب" ہکذا فی بکائہ، لترون ہذہ القری العامرۃ قد انقلبت الی خراب۔

شرحہ:- ایہا الناس، ان غالبکم ہذا لا یقدر علی ان یقوم امام سیل دموعی الجارفۃ وصواعق آہاتی المتفجرۃ، فلا تہملوا انفسکم واجتہدوا فی تسلیتی وتفکروا فی تہدئۃ خاطری، وان لم تفعلوا ذلک فلا بد من دمار العالم لان القریۃ الظالم اہلہا لا تلبث ان تبید۔

سید احمد الفاروقی
(السنة الثانیة)

کان غالب شاعرا فیلسوفا جامعا فی شخصه خصالا عدیدة اکتسبها من شتی الموارد، فهو فی اصله ترکی ولکنه فارسی الجبلة وعربی الدین، و هندی النشأة والثقافة۔

ولد غالب فی مدینة آجره عام ۱۷۹۷ حینما کانت الاحوال مضطربة لان الطبقة الراقیة من المسلمین کانت قد فقدت نفوذها الواسع فی وجه التیارات السیاسیة والاجتماعیة، واسم والده عبد الله بیک خان وقدم جده الی الهند فی عهد السلطان محمد شاه فی اوائل القرن الثانی عشر المیلادی۔ ویتصل نسبه باحدی الاسر الملکیة فی ایران۔ وکان له نصیب اوفر من المتاعب والمشاکل اذ فقد اباه وهو لا یزال طفلا صغیرا لا یکاد یبلغ من العمر خمس سنوات ومات عمه، و هو ابن تسعة اعوام وبعد وفاة عمه تولت والدته الاشراف علیه وعلی تعلیمه واولته عطفها وحنانها فتعلم القرآن الحکیم ومبادی اللغة الفارسیة والاردیة، ولم یبلغ الثانیة عشرة من عمره حتی بدا یقرض الشعر اولا فی اللغة الفارسیة ثم فی اللغة الاردیة وقد اجاد اللغتین فی صغره اجادة تامة

انتقل شاعرنا اخیرا من آجره واتخذ دلهی موطنا له حیث قضی معظم ایام حیاته وشاهد ایام الثورة الملیئة بالفظائع والاهوال وافول عهد الحکومة المغولیة لذا فان الظروف السیاسیة والاجتماعیة الراهنة فی عهد غالب کانت قد ترکت فی نفسه انطباعات فعالة وطبعا تأثر بما وقع حوله من الاحداث، کما ان الیاس والقنوط الذی اصیب

به غالب نتيجة لوفاة ابيه وعمه اصبح عاملا قويًا من وراء نضج ذهنه وتفتح قريحته ۔

وكان شاعرنا يشتكي من انه لم يتمتع بقبول لائق به في حياته ولكنه كان على يقين تام بان عدد محبيه سوف يزداد في مضي الأيام، و ذلك بناء على اعتباره نفسه شاعرا للمستقبل كما يقول

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

كان قد منحت له قريحته وقادة لاتقبل التقاليد الرائجة لصورتها الراهنة لذا فانه في طليعة من تحرروا من قيود البلاغة المتجمدة وتخلوا عن اسلوب التقليد والمحاكاة . فقد ألبس شعره ثوبا يجمع بين المحاسن القديمة والجديدة وصور فيه الاوضاع السياسية الراهنة في عصره والآلام والاحزان التي عانى منها في معظم ايام حياته، كما قد طبعه بطابع الحب والتعشق وجمع فيه بين الحلاوة والرقة والسهولة والجزالة بالاضافة الى تزيينه بافكار فلسفية عالية - وقد اتفق الادباء والناقدون على انه في الحقيقة، لم يعبر عن احزانه وافراحه ولكن نطق بلسان كل واحد من افراد امته وعكس صور حياتهم

علما بانه كان يلتزم التعبيرات البسيطة باسلوب رائع حديث، ويعلم ان الشعر من مبادى الحضارة والثقافة كما يعلم ان القيم الثقافية تنقل من جيل الى آخر بواسطة الشعر وكان يعرف ايضا ما يتمتع به الشعر من المكانة المرتفعة والاثر الفعال عند المجتمع البشري، وهكذا فاصبح بمثابة الجسر بين القديم والجديد لذا فانه يعتبر اول واكبر شاعر جديد باللغة الاردية ويحظى الآن بقبول اكثر منه في الماضي۔

وكان غالب بدأ قرض الشعر في الفارسية ويمتاز بفصاحته فيها غير ان شعره باللغة الاردية كان مؤثرا للغاية اذ كان يمتاز بسلاسة الالفاظ ودقة المعاني وكان الشاعر نفسه يفتخر بهذه الميزة ويقول

اذا انفرد بها دون الشعراء جميعًا.

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

فكل شعره سواء كان بالاردية او الفارسية تتجلى فيه عبقرية الشاعر ونبوغه ويمتاز بسمو الفكر وعلو الخيال.

والحقيقة ان غالب لم يكن متصوفا ولا فيلسوفا. انما كان شاعرا فحسب ولكنه يعتقد اعتقادا راسخا بوحدة الوجود التي اهتدى اليها ببصيرته الشعرية لا بما يؤمن به المتصوفة. فهناك عدد ملحوظ من اشعاره بالاردية والفارسية اعرب فيه عن هذه الفكرة التي اوصلت شعره الى اوج الكمال في دقة التفكير وعلو الخيال.

ومما يجدر بالذكر ان براعته لا تقتصر على الشعر فحسب بل قد ضرب بسهم وافر في باب النثر ايضًا. فكان غالب اول من خلص النثر من الاسلوب القديم المتجهم وجعله سهل العبارة فصيح اللفظ ومؤثرًا على القارئ ومعظم تأليفاته النثرية يوجد في صورة الخطابات الموجهة لاصدقائه ويصور فيها حياته الشخصية لحد تعتبر تلك الخطابات كتابا مفتوحا لحياته. فيوجد فيها نفس السلاسة والاجتذاب والاثر الذي يمتاز به شعره، الا ان الحياة واحزانها التي تحتجب من وراء الكنايات في شعره تتجلى بصورة مثبتة في خطاباته وتأليفاته النثرية.

ومن الميزات التي انفردت بها رسائل غالب هي عنصر الفكاهة في معظم رسائله. فمثلا كتب يخبر احد اصدقائه عن وفاة الزوجة الثانية لصديق له "انني اتأسف على ذلك ولكنه يبعثني على الحسد ايضًا، انه تخلص من عقاله للمرة الثانية بينما انا لا زلت مكبلا منذ سبع وخمسين عاما حيث لم اتخلص من عقالي (اي زوجته)"

وفضلا عن ذلك فان غالب كان لطيف المزاج ودمث الاخلاق [illegible] يتمنى بان لا يعاني احد من سكان مدينته من الفقر والجوع والمسكنة ويحب الجميع من الناس سواء كان مسلما او هندوسيا او مسيحيا وكان يعامله

حضوره أيضاً مسامحة العز والوقار

وما زال شاعرنا يعاني من الأحزان والآلام حتى تعرض ذات مرة لضيق العيش، فاضطر إلى بيع ما في خزانته وما يملكه لدرجة أنه باع أواني مطبخه، وذلك عندما استولى الإنكليز على دهلي سنة ١٨٥٧ إذ تعرضت العاصمة الهندية للنهب والسلب والقتل وتفرق أصحابها لاسيما الأمراء والنبلاء والوزراء شذر مذر، واعتكف الشاعر في داره منقطعاً عن الناس يتلظى حسرة ولهفة بين فقدان الأعزة وانقطاع الموارد ولكنه رغماً من جميع ذلك لم يتخل عن أمله واعتقاده بأن الصباح سينفجر من خلال الظلمات العارضة وكان يعتبر الحياة مغامرة يجب على الجميع خوضها وأخذ نصيبه من السراء والضراء -

واختم هذا الحديث بقول الشاعر المعروف إقبال رحمه الله الذي ورد في رثائه لغالب حيث وصفه بأن الزهرة الهندية تخجل أمامها الوردة الشيرازية، ويبكي بها الحافظ الشيرازي»

وانطفأت هذه الشعلة المشرقة في يوم ١٥ فبراير عام ١٨٦٩ بعد أن بلغ من العمر ثلاث وسبعين سنة وأربعة أشهر وترك لنا آثاراً خالدة ورائعة من شعره ونثره -

---

حامد ربانی
(السنة الاولی)

غالب فی مدینة لندن

كان الاستاذ شان الحق حقی قد كتب هذه التمثيلية لاذاعة لندن (B. B. C) ونشرتها مجلة "ماه نو" بعددها الصادر فی فبرایر سنة ١٩٦٦ وقد قام بتعريبها وتلخيصها زميلنا السيد حامد ربانی - وان للمترجم عذرة اذا لم يتمكن من الحفاظ على الروح الفكاهية فی التمثيلية لان ذلك امر يستحيل تحقيقه فی ترجمة النطق اللفظية، وقد يوفق المترجم الماهر فی نقل تلك الروح غير ان ذلك لا يتصور بدون شرح اضافی وجهد طويل وذلك امر لا يتيسر للطلاب عند ما تقترب امتحاناتهم"

رئيس التحرير

مرزا غالب (من فتى اسمه پرویز) يا بنی كم مسافة من هنا الی قصر الملكة المعظمة -؟

پرویز (مستغربا) I beg your pardon ارجو العفو، ماذا تقول

مرزا غالب يا بنی - انا سألتك عن قصر الملكة المعظمة

پرویز يا الله هل انت مرزا غالب؟ Excuse me

مرزا غالب ما هذا الذی نطقت به اخيراً - انا لست هو، نعم اسد الله خان غالب هو اسم هذا العبد المتواضع

پرویز ولكن ولكن ...... انت هنا. ما ارى هذا - كيف يمكن هذا

مرزا غالب لیس فی ذلک غرابۃ ع مر گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں (لست وقتا یستحیل رجوعہ بعد مضیہ)

پرویز نعم ماذا تقول ؟ ملکۃ وکتوریا ! ولکن یا سیدی مرزا۔ لعلک لا تعلم ان ملکہ وکتوریہ قد توفیت۔

مرزا غالب لا، لا۔ لا تقل ھکذا، ھذا صحیح ؟ انا للہ وانا الیہ راجعون ثم انا للہ وانا الیہ راجعون

پرویز ولکن یا سیدی کا یمکنک ان تقابلھا ھناک I mean وبما مت قد قدمت فاھلا وسھلا

مرزا غالب انت قلت آنفا۔ امین غیر ان ذلک لم یکن محتۃ۔

پرویز یا سیدی ماذا اقول، نتیجۃ لاقامتی بمدینۃ لندن والتکلم باللغۃ الانجلیزیۃ، تعودت علی النطق بمثل ھذہ الکلمات

مرزا غالب طیب۔ فی اللغۃ الانجلیزیۃ بھذہ المناسبۃ یقال امین نعم، لقد قلت ان ملکہ وکتوریا ماقابلتھا ھناک ای عالم الارواح لانہ لا یعلم ھناک احدٌ غیرہ فاللہ اعلم این تبوأت ملکہ وکتوریہ لابد ان تکون قد تبوأت مکانۃ عالیۃ اما انا فالالاف الاعراف وانا فی ھذہ الایام مؤاخذ فی محاکمۃ

پرویز یا سیدی ایۃ محاکمۃ

مرزا غالب تلک التی جئت بصددھا بتوصیۃ صدیقی کرنل مالسن الی امین الملکۃ المعظمۃ۔ ولکن انت تقول ان الملکۃ المعظمۃ لیست ھنا الآن۔

پرویز یا سیدی۔ الملکۃ المعظمۃ موجودۃ

مرزا غالب اذن کیف قلت آنفا انھا قد توفیت۔ المتھل ذلک ؟

پرویز نعم۔ ھذا صائب ان الملکۃ المعظمۃ قد توفیت

مرزا غالب ان کان ذلک صحیحا ینبغی ان یکون ابنھا علی العرش۔

پرویز نعم، ابنھا الملک المعظم ایدورد السابع قد تولی عرش المملکۃ نم توفی۔

مرزا غالب انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اذن بما ذا بالنسبۃ للامریکۃ الآن ؟

پرویز الامریکۃ موجودۃ والملکۃ تولت العرش اسمہا ملکۃ الیزابیث الثانیۃ وہی حفیدۃ ملکۃ وکتوریا۔

مرزا غالب یا للعجائب فی فترۃ وجیزۃ کم من اوراق التاریخ قد تقلبت ولم اذہب من ہہنا الا قبل قلیل۔

پرویز لم یتغیر اصحاب الامریکۃ فحسب بل قد حدثت ثورات کبیرۃ۔

مرزا غالب لماذا ، ہل وقع اضطراب او معرکۃ ؟

پرویز نعم۔ حدثت حروب عظمی۔ فلا تسئل عن شیٔ۔ الم تأتک الانباء عن ہذا ؟

مرزا غالب صحیح۔ ~ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی - کچھ ہماری خبر نہیں آتی ۔۔

پرویز ما احسن ما قلت۔ انباء کثیرۃ لم تبلغ الیک ، فعلی سبیل المثال ان صدیقی نال شہادتہ علی تانیفہ عنک وقد بذل جہدا کبیرا فی کتابۃ مقدمۃ

مرزا غالب ما احسن ما قصصتہ یا بنی۔ اعنی ابتدءت من ہنا واختفی (کذا) وشہادات جاریۃ علی نفسی بصفۃ مستمرۃ

پرویز ارجوک العفو یا سیدی۔ انا لم اقصد انک نال شہادۃ علیک وانما الشہادۃ قد منحت الیہ۔

مرزا غالب یا للعجب۔ یعنی ذلک انہ نال الشہادۃ مکرہا لغیرات یتمنیٰ ہذا یانی الذل

پرویز مرزا صاحب۔ اختلط الامر علیک فی الحقیقۃ ہو اجتہد جہدا عظیما نکوفی علی ذلک بوثیقۃ شہادۃ ۔

مرزا غالب ولکن ما ہی جریمتی حتی جاءت النوبۃ الی التفتیش والبحث۔ کأنی شخص غیر معروف او مجرم اعلن عنہ ۔۔۔ طیب لا تترکوا شیئا فی الخزی والفضاحۃ ۔

پرویز یا سیدی انت غضبت بدون داع ، وانت الذی تقول

~ شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن
این از قحط خریداران کہن خواہد شدن

مرزا غالب: اللعنة على تلك السمعة والرفعة. انا اكره السمعة والرفعة. ولكن تقدى الامر اكتشافات، بحوث، محاكمات، تحريات، ماشاء الله ما احسن التقدير۔

پرویز: ان صديقي قد حصل على المكاتيب

مرزا غالب: استرنى الحديث، المكاتيب. ايضا فهمت، الثناء عليه والثناء عليك. هذا التقدير۔

پرویز: يا سيدى، كيف اقول. ليس فى ذلك تنافر واستنكار بل انه يجب علينا

مرزا غالب: نعم. كليا وتماما، ادوا واجبكم وانجحوا۔

پرویز: لقد بذلت جهود كبيرة للبحث عن احوالك، وحياتك الادبية. وكتبت تاليفات وشروح حول كتبك۔

مرزا غالب: نار الغضب، ظلم اعتداء، اعنى نسب الى ما لم اردة وما نفيته

طلب ہے لگی ہے دل زہر غالب ۔ کوئی نہیں تیرا تو میری جان فدا ہے

پرویز: وكل ذلك فى مصلحتك لوجه الحقيقة والاحترام لك وانك لتشعر بالفرح عند ما ترى هذه الاعمال الرائعة استخرجت المطالب والمعانى من شعرك بعد كدح وجهد

مرزا غالب: والله اعلم بالصواب. تنسب الى التهمة والافتراء والكذب

پرویز: ارجوك العفو انا شوشتك وازعجتك. تعال معى الى "پيپ" هناك يوم تغييم السماء والليلة ليلة قمراء

مرزا غالب: وما هى "پيپ"

پرویز: العفو، انا نسيت موضع نشرب منه

مرزا غالب: عليك ان تقول سلسبيل، كنا نقول فى الدنيا مے خانہ وهناك سلسبيل

پرویز: انظر يا سيدى نقريب من هنا فندق، ينكون من خمسين طابقا

مرزا غالب: انا شيخ عجوز وتعبان فكيف يمكن لى الصعود والنزول

پرویز: مصعد كهربائى موجود يمكن الصعود به بالسرعة

مرزا غالب: وان لم يقف هو ووصل الى العالم الفوقانى رأسا فماذا افعل

۴ - نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

پرویز قلت لک کی تسمع

مرزا غالب نعم انت قلت فی الحرب العظیمہ ممن ناز نرنجی ارھندی

پرویز ارحمہ اللہ، الآن، الهند والباکستان نالتا الحریة الکاملة

مرزا غالب دولة باکستان!.. ماهذه؟ این وقعت فی الشرق او الغرب؟

پرویز فی ناحیة الهند جانبین، اعلم ان الهند قد قسمت والانجلیز لا یوجدون هنالک الآن

فتاة Hallo good evening انا حاج ببنیکم، آسفة علی انی قطعت حدیثکم

پرویز لا، لا، تفضلی یا میری، تعالی تا بلی مرزا غالب شاعرنا العظیم والوضیح

فتاة صحیح - انا مسرورة جداً، انا حسنة الحظ، کیف حالک

مرزا غالب انا فهمت انت تعبرین عن المسرة والبهجة والفرح عشت طویلا

فتاة السید گالب، کنت ذهبت فی حفلة وفاتک فی السنة الماضیة -

مرزا غالب ایتها الفتاة، اتق اللہ من عذ ابہ و غضبہ قد اشترک فیها العلماء وغیرهم

کیف کنت هنالک، لما ذا ولم، یقال قد مضی وقت طویل علی وفاتی -

فتاة لا یا سیدی، فی السنة الماضیه قرأ الناس پیپر (PAPER)

مرزا غالب هل قیل فی اللغة الانجلیزیة البراة پیپر

پرویز لا یا سیدی هی ترید المقالة وکلمة النقد

مرزا غالب الشر والخیر نکیر نات فی کل من الناس فکیف کلمة النقد وقد سمعت

ان الحدو ایضا یعفی عنہ بعد الوفاة

فتاة ورایت مجموعة کلامک ایضاً مرقع چغتائی، ما احسن

مرزا غالب یا سیدة نعدک الخدعت فانی لست گالب و یمکن ان یکون هذا...

شخص آخر، ومن الخیر ان تاذنی لی بالذهاب فانی ذاهب وقد

عزمت علی التنازل من راتب التقاعد -

عبد اللطيف
(السنة الاولى)

حياة غالب في سطور

ولد اسد الله خان غالب ابن ميرزا عبد الله بيك سنة ١٧٩٦ في مدينة آجرة، وجاء اجداده من ايران الى الهند في زمن شاه عالم. وينتهي نسب اسرته الى الملك توران.

اتصل والده اولا بحاكم اودھ ثم اشتغل بوظيفة في حيدر آباد التي قضى فيها بعض المدة ثم غادرها وصاحب راجه بختاور سنگھ الذي كان حاكم الور وتوفي في احدى الحروب الاهلية لهذا الحاكم وكان عمر غالب حينئذ خمس سنوات فحسب فتولى تربيته عمه المشفق الذي كان ذا نفوذ كبير و ثروة طائلة. ولم يكمل غالب عشر سنوات من عمره حتى توفي عمه ففقدت الاسرة كل ما كانت تملكه من اراض واسعة.

وقد حصل على دراسته الابتدائية عند الشيخ المعظم ونظير اكبر آبادي وتعلم الفارسية من الشيخ عبد الصمد الايراني، وكان يتخلص "اسد" كالاسم المستعار جريا على عادة الشعراء الهنود ثم ترك هذا الاسم واختار الاسم الجديد "غالب" وهو الاسم الذي اشتهر به. وبقدرته الفائقة على قرض الشعر تمكن من الاتصال بالبلاط الملكي في زمن الملك بهادر شاه ظفر وكان الملك يقدره تقديرا عظيما.

وتزوج وعمره ثلاث عشرة سنة وقضى معظم ايام حياته في دلهي، ولما توفي الشاعر المشهور "ذوق" الذي كان استاذا للملك بهادر شاه الذي كان ياخذ منه الاصلاح في شعره، حل محله غالب واصبح استاذ الملك ولقبه الملك بهادر شاه ظفر بـ"نجم الدولة، دبير الملك، نظام جنگ" وعين له وظيفة، وتوفي في دلهي سنة ١٨٦٩.

بقیہ: **"پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے"** صفحہ ۱۹۷ سے آگے

طور پر تباہ و برباد نہ ردیں تو زملنے کا ماتم کرنے کے لئے زندہ رہو۔ اس اعتبار سے زبان و ادب کے پہلو سے ہٹ کر غالب کا مطالعہ اگر ان کے عہد کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھ کر کیا جائے تو غالب ایک غفلت کی علامت نظر آتے ہیں

آج ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں سانس لے رہے ہیں آمریت اور شہنشاہیت کے دور میں جو چیزیں خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ اگر آج بھی ہم ان کو اسی حیثیت میں قبول کرتے ہیں تو نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے اس کا اثر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تعطل پیدا کر دے گا اور ہم نئی دنیا کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو سکیں گے۔

بہر حال غالب ایک اتھاہ سمندر ہیں لوگ اس میں سے موتی بھی چنتے رہیں گے اور پتھر بھی تلاش کئے جاتے رہیں گے۔ سو سال گذر جانے کے بعد بھی اس کی تہہ میں دفن خزانے نہیں نکالے جا سکے ہیں۔ آئندہ کے نقاد اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ اور اس کے چھپے خزانوں سے خود بھی لطف اندوز ہوتے رہیں گے اور سامعین کو بھی لطف اندوز کرتے رہیں گے۔

بقیہ: **مرزا غالب بحیثیت نثار** صفحہ ۱۸۵ سے آگے

غالب کے خطوط ان کی ساری زندگی کے مطالعہ اور علمی اکتساب کا نچوڑ ہیں اور انھوں نے شعر و ادب اور بہت سے اہم مسائل پر اتنی مکمل روشنی ڈالی ہے جس سے غالب کی مختلف علوم و فنون سے گہری وابستگی اور دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے ان کے مکاتیب ان کی شاعری کے بہت سے اسرار سے پردہ اٹھاتے ہیں، واقعات کا سیلِ رواں ہیں، مذاق و خیالات کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں، دعائیں اور دیدار کی آرزوئیں ہیں، ظرافت اور زندہ دلی کے رموز ہیں۔ غالب کے خطوط ان کی زندگی، ان کے افکار اور ان کے اسلوب کا ایسا روزنامچہ ہیں جو ان کے مکاتیب کی اہمیت کی خود گواہی دیتے ہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
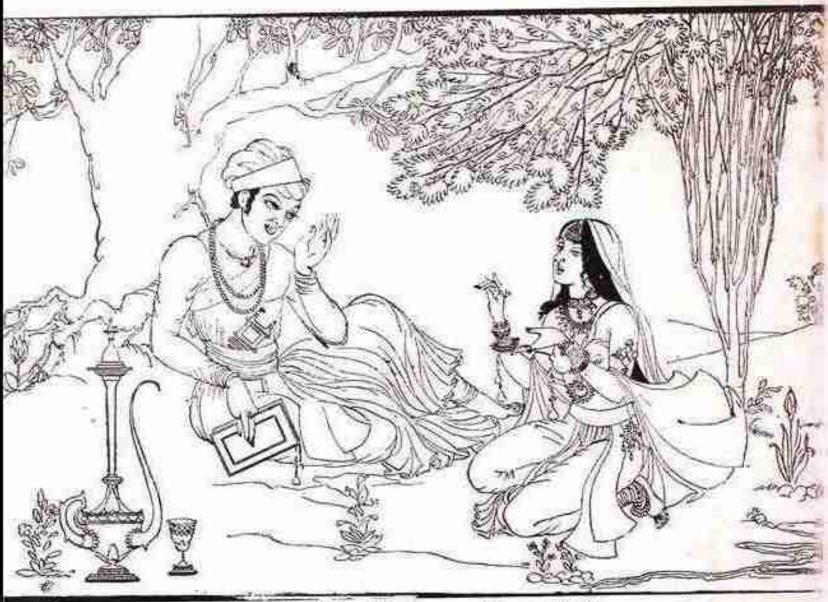
Saaqi Ba Jalwa Dushman-e-Iman-o-Aghi
Courtesy Bhavan Verma

Kis Ke Ghar Jaiga Sailab-e-Bala Mere Baad
Courtesy—Musleh Ahmed
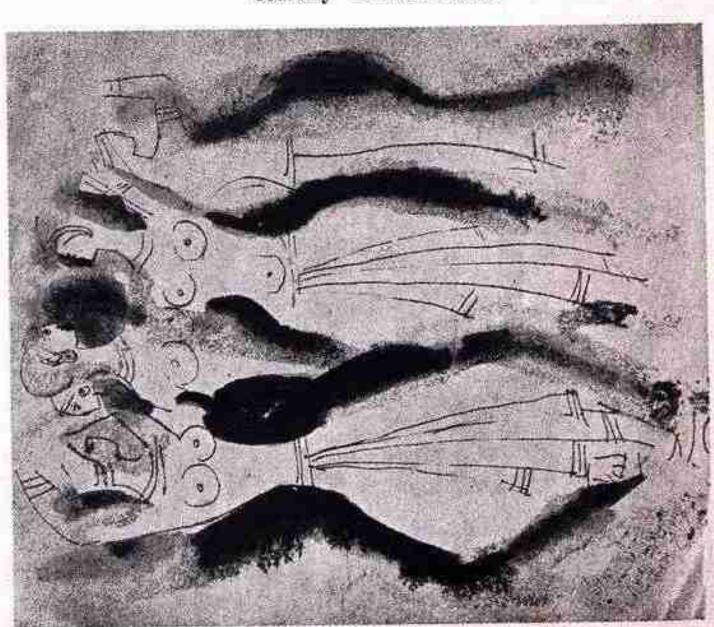
SHAM-E-HAYAT

GHALIB NUMBER

DELHI COLLEGE (EVENING) URDU MAGAZINE

Courtesy — Bhavan Verma